ہماری ویب ڈیجیٹل بک

امین صدرالدین بھایانی

AMIN SADAR BHAYANI

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ

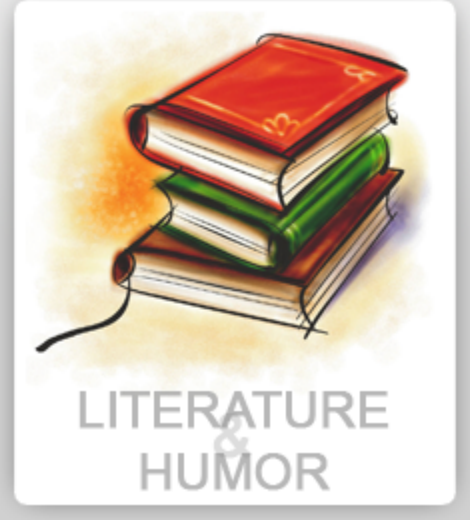

HAMARI WEB .com

E-BOOK SERVICES

Collection of Published Articles
By "Amin Sadar Bhayani"
at Hamariweb.com

یہ مسلمانوں کی دکان ہے

رات کے دس بجکر پچپاس منٹ ھو چکے تھے۔ میں اور مرتضیٰ گزشتہ آدھے گھنٹے سے گروسری اسٹور کے باھر کھڑے انتہائی بے چینی کے ساتھ ٹیکسی کا انتظار کر رہے تھے۔ مرتضٰی ہر پانچ منٹ کے بعد اسٹور کے کسٹمر سروس کاؤنٹر سے کیب کمپنی کو فون کر کے انہیں فوراً کیب بھجوانے کی تاکید کرتا لیکن اس روز نہ جانے ایسی کیا قیامت آن پڑی تھی کہ کیب آ کے نہیں دے رہی تھی اور ہمیں یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ ہم لوگوں نے بے شمار گروسری کر لی تھی اور جسکی بڑی تعداد آئسکریم، جوس، منجمد اشیائے خوردونوش، دہی اور مکھن وغیرہ پر مشتمل تھیں جو کے بہت جلد خراب ھو سکتی تھیں۔ میں اور مرتضٰی ابھی اسی سوچ میں غلطاں تھے کہ آخر کیا کیا جائے کے اچانک اسٹور کا خود کار برقی دروازہ کھلا اور اسمیں سے ایک گوری خاتون باھر نکلی اور تیز قدموں سے چلتی ھوئی ھماری جانب آئی۔ اس کے سینے پر مینیجر کا بیج آویزاں تھا۔ پاس آتے ہی وہ ہم سے مخاطب ھوئی: "مجھے کسٹمر سروس پر موجود ڈیوٹی کلرک نے بتایا ہے کہ آپکی بیشمار کالوں کے بعد بھی اب تک کیب نہیں آئی۔ کبھی کبھار رات کے وقت ایسا ھو جایا کرتا ہے۔"

اسکے خاموش ہوتے ہی مرتضٰی بولا: "دراصل ہمیں یہ فکر لاحق ہے کے کہ ہماری گروسری میں اکثر چیزیں ایسی ہیں جو جلد خراب ہو سکتیں ہیں۔"

مرتضیٰ کی بات سن کر وہ خاتون مسکرا کر بولی: "میں ابھی کسی مددگار کو بھجوا کر سارا سامان کولڈ اسٹوریج میں رکھوائے دیتی ہوں۔ اگر آپ لوگ مزید انتظار نہیں کرنا چاہتے تو میں ابھی ریفنڈ بھی کروادیتی ہوں لیکن آپ لوگ کیب کا مزید انتظار کرنا چاہتے ہیں تو چونکہ ہمارا اسٹور رات گیارہ بجے بند ہو جاتا ہے، میں ایک کیش کاؤنٹر کھلا رکھواتی ہوں تاکہ مزید پندرہ بیس منٹوں میں اگر کیب نہ آئے تو آپ لوگ اپنا ریفنڈ حاصل سکیں۔"

مرتضٰی اور میں نے اسکا بیحد شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ہم کچھ دیر اور انتظار کرینگے۔ ہماری بات سنکر اسنے اپنا سر ہلایا اور واپس جانے کیلیے مڑی اور پھر اچانک نہ جانے کس خیال کے تحت دوبارہ پلٹی اور بولی: "اگر کیب نہ آئی تو آپ لوگ واپس کیسے جائیں گے، اگر ایسا کوئی مسئلہ درپیش ہوں تو مجھے آگاہ کیجئے گا، میں اسٹور کے کسی کارکن کے ہمراہ آپکی سواری کا بندوبست کروادونگی۔"

میں اور مرتضٰی اس خدائی خدمتگار کا بس شکریہ ہی ادا کرتے رہ گئے۔ بحرحال کچھ دیر بعد کیب آ گئی۔ مرتضٰی فوراً اندر جا کر کولڈ اسٹوریج سے ساری گروسری نکلوا لایا اور یوں ہم گھر کو پہنچے۔

یہ آج سے کم و بیش پانچ چھے برس قبل کی بات ہے جب ہم امریکا میں اپنے اہل خانہ کے بغیر ریاست فلوریڈا کے ایک دور افتادہ قصبے میں ایک ادارے جس کے لئے ھم کام کرتے تھے، کی جانب سے فراھم کردہ اپارٹمنٹ میں اپنے ایک اور ساتھی کارکن مرتضٰی کمال، بحسن اتفاق جنکا تعلق بھی ہماری طرح کراچی ہی سے تھا، کے ہمراہ مقیم تھے۔

ادارے کا فراھم کردہ اپارٹمنٹ کام کی جگہ سے بے حد نزدیک ہونے کے سبب ھم دونوں روزانہ پیدل ہی کام پر چلے جایا کرتے تھے لٰہذا گاڑی وغیرہ کا جھنجھٹ بھی نہ پالا تھا۔ البتہ گھر میں کسی خاتون کے نہ ہونے کے سبب آٹے دال کا بھاؤتاؤ اور دال دلیہ کے بندوبست کی فکر خود ہمیں ہی کرنا پڑتی تھی، لہٰذا ھفتے میں کم از کم ایک آدھ بار ھفتے بھر کے راشن وغیرہ کی خریداری کے لئے بذریعہ بس گھر سے تقریباً تین چار میل کے فاصلے پر موجود ایک گروسری اسٹور جاتے اور واپسی پر ٹیکسی پر سارا سامان لادھ کر لے آتے۔

اس واقعے کے کچھ روز بعد اتفاقاً کسی واقف کار کے توسط سے ہمیں پتہ چلا کہ

اس قصبے میں ایک عدد پاکستانی مٹھائی کی دکان ہے جہاں پاکستانی کھانے بھی ملتے ہیں۔ یہ تو کچھ ایسا ہی تھا کے جیسے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹے۔ بحر طور ہمارے اور مرتضی کے درمیان یہ بات طے پائی کے کسی روز وہاں چل کر کچھ عمدہ سی مٹھائی اور چٹپٹے پاکستانی کھانے کھائیں جائیں اور یوں ایک دن ھم دونوں اس پاکستانی مٹھائی کی دکان جا پہنچے۔
وہاں پہنچ کر ھم نے چند مٹھائیاں بندھوائیں اور پھر دکان کے کاؤنٹر پر موجود ایک پکی عمر کی بزرگ سی شخصیت سے اس وقت دستیاب کھانوں کے بارے میں دریافت کیا جس پر انہوں نے بے شمار کھانوں کے نام گنوا دیئے اور غالباً ھم نے مرغ بریانی اور نہاری کا آرڈر دے دیا۔ اچانک نہ جانے مرتضی کو کیا سوجھی، اس نے بغیر کچھ سوچے سمجھے ان پکی عمر والے صاحب سے ایک سوال کر ڈالا: " جناب آپ کے تمام کھانے حلال گوشت کے ہی بنے ہوئے ہیں نا؟"
بس صاحب، خدا کی پناہ! مرتضی کا یہ پوچھنا، سمجھیے کہ قیامت ہوگیا!!! ایسا محسوس ہوا کہ جیسے بے خبری میں مرتضی نے ان کی دکھتی رگ پر اپنا پاؤں رکھ دیا ہو۔ وہ بزرگوار سخت جلال میں آ گئے اور نہایت ہی غصے، بدتمیزی اور اجڈ پنے کے ساتھ آگ بگولہ ہو کر خوب گرج کر بولے: "یہ مسلمانوں کی دکان ہے، آپ نے سمجھ کیا رکھا ہے، کیا ھم لوگوں کو حرام گوشت کھلا رہے ہیں؟"

مرتضٰی بے چارہ شرمندگی سے بغلیں جھانکنے لگا اور جھینپ کر بولا: "ارے صاحب! آپ اسقدر ناراض کیوں ہو رہے ہیں، میں نے تو محض ایک سوال ہی تو کیا ہے۔۔۔!!!"

اس پر تو وہ صاحب مزید چڑھ گئے اور باآواز بلند چلا کر بولے: "میاں! یہ مسلمانوں کی دکان ہے، یہاں کھانے حلال گوشت سے ہی بنائے جاتے ہیں، کھانا ہے تو کھائیں ورنہ چلتے پھرتے نظر آئیں!!!"

شرمندگی اور خفت کے مارے ہماری زبانیں گنگ ہو کر رہ گئیں اور ہمیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ھم لالو کھیت کے کسی تیسرے درجے کے بھٹیار خانے کے کسی اجڈ، بد تمیز اور جاھل بیرے سے مخاطب ہوں۔

وہاں سے نکلے تو سارے راستے ھمارے کانوں میں بار بار ایک ہی جملہ گونجتا رہا: یہ مسلمانوں کی دکان ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔! یہ مسلمانوں کی دکان ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔! یہ مسلمانوں کی دکان ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!!

جبکہ نگاہوں کے سامنے کبھی اس بڑے میاں کا چہرہ گھومتا تو کبھی اس رات گروسری اسٹور کے باھر ہمیں دلاسے دینے والی اس گوری خاتون مینیجر کا مہربان

چہرہ گھومنے لگتا اور ہمارے زہنوں میں بار بار ایک ہی سوال ابھر رہا تھا کہ درحقیقت مسلمانوں کی دکان تھی کونسی؟ وہ جہاں اس روز ایک غیر قوم و مذہب سے تعلق رکھنے والی خاتون نے ہمارے ساتھ کمال ہمدردی کا مظاہرہ کیا تھا! یا وہ جہاں ہم آج گئے تھے اور اپنے ہی ہم وطن و ہم مذہب کے ہاتھوں زلیل ہو کر آ رہے

ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!! ایک وہ ہے جسے اس بات کا فکر لاحق ہے کہ ہم رات گئے پیدل گھر کیسے جائیں گے! اور ایک وہ ہیں جسے ہمارا وہ سوال کسی گندی گالی کے مترادف لگا کہ جسے پوچھنا صرف ہمارا حق ہی نہیں بلکے مذہبی فریضہ بھی تھا۔۔۔۔۔۔!!!

گھر پہنچنے کے بعد مرتضٰی بنا کوئی بات چیت کیئے مفت تقسیم کیئے جانے والے اس اردو اخبار کے مطالعے میں مشغول ہوگیا جو وہ اسی دکان سے اٹھا لایا تھا۔ اچانک تھوڑی دیر بعد اخبار کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے بولا: "ارے زرا دیکھنا تو اس اخبار میں اسی دکان کا اشتہار چھپا ہے اور اس میں یہ دعوٰی کیا گیا ہے کہ وہاں سارے کھانے حلال گوشت سے تیار کیئے جاتے ہیں، غلط ثابت کرنے والے کو 1000 ڈالر انعام دیا جائے گا۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے وہ سوال پوچھ کہ اس بڑے میاں کی کسی دکھتی رگ پر پاؤں رکھ دیا تھا، جبھی تو وہ اتنی سی بات پر اسقدر لال پیلا ہو رہا تھا کہ جیسے میں نے اسے کو کوئی فحش گالی دے ڈالی ہو"۔

مرتضٰی کی بات سن کر میں محض مسکرا دیا لیکن وہ دن اور آج کا دن میرے ذہن میں ایک ہی سوال گردش کر رہا ہے کہ آخر مسلمانوں کی دکان تھی کونسی؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔! شاید اس بات کا درست فیصلہ قارئین ہی کر سکیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!!!

حادثہ کیا تھا جسے دل نے بھلایا بھی نہیں۔۔۔

وہ ماہ جنوری کے ابتدائی دنوں کی ایک انتہائی یخ بستہ صبح تھی اور اس دو رویہ پتلی سی سڑک کے اختتام پر موجود چوراہے کے کونے پر گرے رنگ کی ٹویوٹا ایولون سڑک کے ایک کونے میں نصب سرخ رنگ کے اسٹاپ سائن پر چند لمحوں کیلیئے رکی۔ گاڑی کا انڈیکیٹر اسکے دائیں جانب مڑنے کا اشارہ دے رہا تھا اور پھر قدرے توقف کے بعد سامنے اور بائیں جانب سے کسی بھی قسم کی آمدورفت کی غیر موجودگی کا یقین کرنے کے بعد گاڑی نے چوراہے کا موڑ کاٹا اور دائیں جانب کی ایک اور چھوٹی سی دو رویہ سڑک پر آ گئی۔ تھوڑا ہی آگے جا کر ایک کھمبے پر لگا "اسکول زون۔ رفتار 25 میل" کا بورڈ اور اس پر جلتی بجھتی زرد بتی دکھائی دینے لگی۔ گاڑی مقررہ رفتار سے چلتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ چند ہی لمحوں کے بعد سڑک کے بائیں جانب لگیں آرائشی جھاڑیوں کے قطعات کے اختتام پذیر ہوتے ہی ایک چھوٹا سا سرسبز ٹیلا نمودار ہوا اور اسی ٹیلے کے عین عقب سے ابھرتی ہوئی "میڈلاک ایلیمینٹری اسکول" کی عمارت باآسانی دیکھی جا سکتی تھی۔

گاڑی اس چھوٹے سے ٹیلے کے ساتھ اسکول کے بچوں کے والدین کیلیئے بنائے گئے پارکنگ کے مخصوص نشان زدہ حصے میں داخل ہونے لگی۔ اس مرحلے پر گاڑی کی

رفتار محض پانچ میل فی گھنٹہ یا پھر اس سے بھی کم رہی ہو گی۔گاڑی پارکنگ کیلیئے بنائے گئے ٹریک میں داخل ہوچکی تھی اور اب اسے مکمل طور پر پارک کیئے جانے میں صرف چند قدموں ہی کا فاصلہ باقی تھا کی اچانک نہ جانے کیا ہوا کے چیونٹی کو رفتار سے چلتی ہوئی کار پارکنگ ٹریکس اور ٹیلے کے درمیان موجود فٹ پاتھ پر تیزی کے ساتھ چڑھ دوڑی اور پھر ٹیلے پر مزید تیز رفتار کے ساتھ چڑھنا شروع ہو گئی۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص نے یکدم دھیرے سے چلتی کار کی رفتار کو یوں اچانک بڑھتے دیکھ کر گاڑی کے بریکوں پر زور زور سے پاؤں مارنا شروع کر دیا لیکن اسکی تمام تر سعی لاحاصل رہی اور کار کی رفتار مزید بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

گاڑی کی عقبی نشست پر چائیلڈ سیٹ میں حفاظتی بیلٹ سے جکڑا پانچ سالہ بچہ اس بدلتی ہوئی صورتحال کی سنگینی کو بھانپ کر گھبرا گیا اور خوف زدہ ہو کر زور زور سے چلانے لگا

:

ڈیڈی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!"، "ڈیڈی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!"،"

"!!!ڈیڈی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شخص جو کہ ابھی تک اس ناگہانی صورتحال ہی کو سمجھنے کی کوشش میں گوں مگوں کی سی کیفیت کا شکار تھا، اب اپنے معصوم بچے کی چیخ و پکار سن کر اس کے اعصاب میں مزید تناؤ پیدا ہوا اور اسکے اوسان خطا ہوگے۔ اسی گھبراہٹ میں اسنے بے اختیار نہ جانے کب گاڑی کا اسٹیرنگ ویل موڑ دیا۔

گاڑی جو ابتک ٹیلے پر تھوڑا سا ہی چڑھ پائی تھی، نے انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ گول چکر کاٹا، دوبارہ فٹ پاتھ پر آئی، فٹ پاتھ کراس کرکے ایک بار پھر سے پارکنگ لاٹ میں داخل ہوئی اور پہلے پارکنگ ٹریکس پر کھڑی ایک کار پھر اسکے ساتھ کھڑی دوسری گاڑی سے یکے بعد دیگرے ٹکرائی اور پھر مزید تیز رفتاری کے ساتھ پارکنگ لاٹ سے نکلی اور تیزی سے دوڑتی ہوئی سامنے والی دو رویہ سڑک عبور کرتی ہوئی سڑک کے کنارے پر موجود ایک گھر کی حفاظتی باڑ کو توڑتی، آرائیشی جھاڑیوں کو روندتی، گھاس کے لان کو عبور کرتی ہوئی زوردار دھماکے کے ساتھ گھر کی دیوار سے جا ٹکرائی۔

گوکے دیوار سے ٹکرانے کے سبب گاڑی تو ٹھر گئی لیکن گاڑی کا چھے سلینڈر والا طاقتور انجن اب بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ چل رہا تھا اور انجن کی زوردار غراہٹ چاروں طرف گونج رہی تھی۔ ٹکراؤ کی شدت سے پورے ونڈ اسکرین پر دراڑیں پڑ چکیں تھیں اور گاڑی کا بونٹ قدرے ٹیڑھا ہو کر اپنی اصل شکل کھو

چکا تھا اور اسمیں پیدا ہونے والی درز سے دھواں برآمد ہو رہا تھا جبکہ اگلی دونوں نشستوں کے سامنے اور اسٹیرنگ ویل پر نصب شدہ حفاظتی غبارہ کھل کر اسٹیرنگ ویل اور ڈرائیور کے درمیان حائل ہو چکا تھا۔ اس ساری ناگہانی آفت سے مکمل طور پر حواس باختہ اور گھبراہٹ کے شکار اس شخص نے مڑ کر عقبی نشستوں کی جانب دیکھا تو اسکا بچہ مکمل خیر و عافیت سے نظر آ رہا تھا البتہ شدید گھبراہٹ کے باعث اسکے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور مارے خوف کے چہرے کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ بچے نے روہانسا ہونے ہوئے قدرے زور سے چلاتے ہوئے کہا:

"اب ہم کیا کرینگے ڈیڈی؟ ـــــــــــــــــــــــــــ!!!"

حالانکہ اس ناگہانی حادثے کے سبب خود اسکے اپنے تمام تر اوسان خطا ہو چکے تھے لیکن اسنے اپنے معصوم بچے کو اسقدر پریشان اور شدید خوف زدہ ہوتے دیکھ کر اسے دلاسہ دینے کے خیال سے پچکارتے ہوئے کہا:

"علی ــــــــــ! بیٹا ــــــــــــــ! فکر کی کوئی بات نہیں، ابھی سب ٹھیک ہو جائیگا ـــــــــــــ!!!"

اپنے بچے کو دلاسہ دینے کی خاطر، کہنے کو تو اس نے کہہ دیا تھا لیکن وہ پہلے ہی گاڑی کے ٹوٹے ہوئے بونٹ میں سے تیزی سے نکلتے ہوئے دھوئیں کو دیکھ چکا تھا اور انجن اپنی پوری قوت کے ساتھ چلتے ہوئے زور زور سے غرا رہا تھا لہٰذا اسے یہ اندیشہ لاحق تھا کہ کہیں گاڑی کے انجن میں دھماکہ نہ ہو جائے۔ اس نے تیزی سے اپنے بکھرے ہوئے اعصاب کو مجتمع کرتے ہوئے ایک سکینڈ کے ہزارویں حصے میں آگے کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچنا شروع کردیا۔

اس وقت تک حادثے کے برابر والے گھروں اور اپنے بچوں کو اسکول چھوڑنے کے لیئے آنے والے لوگ وہاں جمع ہونا شروع ہو چکے تھے۔ ڈرائیور نے سب سے پہلے اسٹئیرنگ ویل پر نصب شدہ حفاظتی غبارہ جو کے حادثے کے فوراً بعد ہی کھل کر اس کے چہرے اور سینے کے درمیان حائل ہو چکا تھا اور یہ ہی اسکا اصل مقصد تھا کہ کسی بھی قسم کے حادثے کی صورت میں ڈرائیور کے چہرے اور سینے کی پسلیوں کو ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ رکھا جاسکے، کو ہٹانا شروع کیا۔ حفاظتی غبارے کے ہٹتے ہی اسے گاڑی کی ٹوٹی ہوئی ونڈ اسکرین کے سامنے ایک شخص اپنے دونوں ہاتھوں سے گاڑی کے انجن کی جانب اشارے کرتا دکھائی دیا مگر انجن کے بے پناہ شور کے سبب اسے کچھ بھی سنائی نہ دے رہا تھا لیکن اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ شخص اسے کہنے کی کوشش کر رہا ہو کہ جلد از جلد گاڑی سے باہر نکلنے کی کوشش کرو، کسی بھی لمحے انجن میں دھماکہ ہو سکتا ہے۔۔۔۔!!!

یہ اشارہ پا کر تو اسکے رہے سہے ہوش و حواس بھی جاتے رہے اور دھک دھک کرتا دل مزید زور و شور کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ اسنے ایک بار پھر اپنے تیزی کے ساتھ بکھرتے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی اور اب کی بار تو اسکا سانس جہاں تھا وہیں کا وہیں تھم کر رہ گیا کیونکہ ٹکراؤ کی شدت کے باعث گاڑی کے دروازے جام ہو کر رہ گئے تھے۔ اس نے دو چار بار زور زور سے گاڑی کے دروازے پر لگے لیور کو پوری قوت سے کھینچ کر دروازہ کھولنے کی بھرپور کوشش کی مگر وہ تو بری طرح سے جام ہو چکا تھا۔

آخرکار کوئی اور راستہ نہ پا کر اسنے دروازے پر زور زور سے لاتیں مارنا شروع کردیا، یہ پریشان کن منظر دیکھ کر اسکا بچہ مزید خوف زدہ ہوگیا اور اسنے زور زور سے رونا شروع کردیا۔ بچے کو روتا دیکھ کر وہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ اور مزید زور و شور سے لاتے مارنے لگا، اس کی یہ کوشش رنگ لائی اور یک لخت دروازہ کھل گیا۔

دروازے کے کھلتے ہی اسنے اپنے حفاظتی بند کھولے اور وہ نشستوں کو پھلانگتا ہوا عقب میں جا پہنچا، بچے کو حفاظتی بندوں سے آزاد کروایا اور وہاں موجود لوگوں میں سے کسی نے آگے بڑھ کر بچے کو اس سے لیکر گاڑی سے باہر نکالا اور

وہ خود بھی فوراًہی باہر آگیا۔ اسکے باہر آتے ہی اسے اشارہ کرنے والا شخص تیزی سے اس کی جانب آیا اور اس سے مخاطب ہوا:

"گاڑی کا انجن اب بھی چل رہا ہے اور دھواں بھی تیزی سے نکل رہا ہے، جلدی سے گاڑی کے اندر جا کر انجن بند کردو۔"

اب اسے احساس ہوا کے گھبراہٹ اور جلدی میں اسے گاڑی کے انجن کو بند کرنا تو بالکل ہی یاد نہ رہا۔ ایک بار پھر دھک دھک کرتے دل کے ساتھ وہ دوبارہ گاڑی کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوا اور اگنیشن میں لگی چابی کو گھما کر باہر نکال لیا۔ گاڑی کا گھر گھر کرتا اور شور مچاتا انجن ایک جھرجھری لیکر خاموش ہوگیا اور وہ فوراً گاڑی سے باہر نکل آیا۔

باہر آتے ہی اپنے بچے کی متلاشی اسکی نگاہیں ادھر ادھر دیکھتی رہیں اور پھر کسی کے ہاتھوں میں اپنے بچے کو، جو اب بھی خوف اور شدید ٹھنڈ کے مارے تھر تھر کانپ رہا تھا کو بالکل محفوظ دیکھ کر اسکی جان میں جان آئی۔

اس نے فوراً آگے بڑھ کر اپنے بچے کو اپنے بازوں میں بھر لیا اور اس سے مخاطب ہوا:

"علی بیٹا۔۔۔۔۔۔۔۔! آپ ٹھیک ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!!"

بچے نے اثبات میں اپنا سر تو ضرور ہلایا مگر باپ کو تسلی نہ ہوئی اور اس نے بچے کو اچھی طرح سے اوپر سے نیچے تک دیکھا مگر کوئی چوٹ یا غیر معمولی بات نظر نہ آئی تو اسنے بچے کو اپنی گود سے زمین پر اتار کر اسے چند قدم چلنے کیلئیے کہا اور جب بچے نے اسے باآسانی چل کر دیکھایا تو اسے یقین ہو گیا کے بچہ محض گھبراہٹ اور خوف کا شکار ہے۔

اسی اثناء میں سائرن بجاتی اور گول گول گھومتی ہوئی لال نیلی بتیوں والی پولیس کار موقعہ پر آن پہنچی اور اسمیں سے ایک سیاہ فام پولیس افسر برآمد ہوا۔ پولیس افسر کو دیکھ کر اسکا دل کچھ اور زور سے دھڑکا اور ایک لمحے کیلئیے حادثے کی سنگینی اور اسکے نتیجے میں ہونے والے نقصانات کا خیال اسے پریشان کرنے لگا لیکن پھر فوراً ہی اسے اس خیال نے تقویت بخشی کے وہ اور اسکا بچہ مکمل خریت سے تھے اور ویسے بھی جو ہونا تھا سو ہو چکا لہٰذا اب آنے والے واقعات کا مقابلہ ہمت اور حوصلہ مندی سے کرنا چاہیے اور اب آگے جو بھی ہوگا، دیکھا جائیگا۔

پولیس افسر نے اسکے قریب آکر اس سے اسکا ڈرائیونگ لائیسنس اور انشورنس کے کاغذات طلب کیئیے، جس پر اس نے فوراً ہی مطلوبہ کاغذات اپنے بٹوے سے نکال کر اسکے حوالے کر دیئے اور پھر عرضمندانہ لہجہ میں اس سے مخاطب ہوا:

"آفیسر، اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اپنے بچے کو جو کہ اس حادثے کے سبب ڈرا اور گھبرایا ہوا ہے اور یہاں شدید ٹھنڈ بھی ہو رہی ہے، اسکول کے اندر لے جا کر اسے اسکی کلاس میں چھوڑ آؤں۔"

آفیسر کو رضامندی میں سر ہلاتا دیکھ کر اسنے بچے کو اپنے بازوں میں اٹھالیا اور انتہائی تیز قدموں سے چلتا ہوا اسکول کے عمارت میں داخل ہوگیا۔ اس وقت تک اسکول شروع ہوچکا تھا، اسنے بچے کی استانی کو دیر سے آنے کی وجہ بتاتے ہوئے سارا قصہ سنایا۔ کلاس کے دیگر بچے پہلے پریڈ جو کے جسمانی تربیت کا تھا، کیلئیے پی ٹی ہال میں جا چکے تھے لہٰذا استانی نے اسے وہاں جا کر بچے کو پی ٹی ماسٹر کے حوالے کرنے کو کہا جس پر وہ بچے کو لیکر مطلوبہ جگہ پہنچا اور پی ٹی ماسٹر کو سارا ماجرہ کہ سنایا۔ اس کی بات سن کر وہ بولا کہ چونکہ بچہ اس حادثے کے سبب ڈسٹرب ہوگا لہٰذا وہ اسے ایک طرف بیٹھا کر آرام کا موقعہ دیگا اور پی ٹی کا وقت ختم ہونے پر اسے دوسرے بچوں کے ہمراہ اسکی کلاس میں بھجوادیگا۔

اب وہ اسکول سے باہر جانے کا راستہ تیز قدموں سے طے کرتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا کہ عین صدر دروازے کے پاس قائم اسکول اور اپنے دفتر کے ساتھ ہی کھڑے ہوئے پرنسپل صاحب مسٹر ہیمنڈ سے ملاقات ہو گئی اور انہوں نے اس کی خیریت دریافت کرنے کے بعد بتایا کہ انہوں نے ہی 911 پر کال کر کے اس حادثے کی اطلاع دی تھی کیونکہ وہ حادثے کے وقت حسب معمول اسکول کے باہر ہی کھڑے ہوئے تھے۔

پرنسپل صاحب سے بات چیت کرتے ہوئے اچانک اسے یاد آیا کہ وہ اپنا سیل فون تو گھر ہی بھول آیا ہے اور ابھی نہ جانے پولیس کی کاروائی میں کتنا وقت لگ جائے لہذا گھر فون کر کے صورتحال سے آگاہ کرنا بہت ضروری تھا۔ اسنے پرنسپل صاحب سے اسکول کا فون استعمال کرنے کی اجازت طلب کی اور پھر مختصر لفظوں میں ساری صورتحال اپنی بیگم کو بتاتے ہوئے تاکید کی کہ وہ اسکے باس کو فوراً فون کر کے انہیں حادثے کی اطلاع دیکر یہ بتا دے کہ شاید آج اسے کام پر پہنچنے میں بے حد تاخیر ہو سکتی ہے اور ممکن ہے کہ وہ آج سرے سے پہنچ ہی نہ سکے۔

فون سے فارغ ہو کر جب وہ جائے حادثہ پر پہنچا تو وہاں پر اس وقت تک ایک عدد

ایمبیولینس، فائر بریگیڈ اور ٹوئینگ ٹرک آ چکے تھے ٹوئینگ ٹرک کا ڈرائیور ٹرک سے ایک موٹا سا آھنی رسہ (کیبل) نکال کر اسے گاڑی سے باندھ رہا تھا تاکہ گاڑی جو کہ اس مکان کی دیوار سے لگی ہوئی کھڑی تھی کو ٹوئینگ ٹرک سے نصب آھنی رسے کی مدد سے گھسیٹ کر نکالا جائے اور اسے ٹرک پر چڑھا کر لے جایا جا سکے۔

قریب آنے پر ایمبیولینس میں آئے ہوئے دو پیرامیڈیک اسٹاف میں سے ایک آگے بڑھا اور اسنے سوال کیا:

"کیا آپ ٹھیک ہیں؟"

"جی ہاں میں تو اپنے آپ کو بالکل ٹھیک محسوس کر رھا ہوں لیکن میں یہ چاہتا ہوں کے آپ زرا میرے بچے کا معائنہ کر لیں، کہیں اسے کوئی اندرونی چوٹ نہ آئی ہو۔"

یہ سنتے ہی وہ پیرامیڈیک اسکے ساتھ ہو لیا اور اسکول کے اندر جا کر پی ٹی ہال میں موجود بچے کا اچھی طرح سے معائنہ کیا اور پھر بولا:

بظاہر تو کوئی فکر والی بات نظر نہیں آتی لیکن بعد ازاں بچے یا خود آپ کو کسی قسم کا" "درد محسوس ہو تو فوری طور پر ڈاکٹر سے رجوع کیجیئے گا۔

وہاں سے نکل کر وہ دوبارہ پولیس افسر کے پاس پہنچا جو کے اب تک ابتدائی کاغذی کاروائی مکمل کرچکا تھا اور اب اسے اسکا بیان قلمبند کرنا تھا، لہذا اسے نے مکمل واقعہ من و عن بیان کردیا اور اسی دوران اسے پہلی بار ان دو گاڑیوں اور انکے مالکان کا خیال آیا جس سے اسکی گاڑی جا ٹکرائی تھی۔

اس نے مڑ کر پارکنگ ایریا میں دیکھا تو حادثے کا شکار وہ دونوں گاڑیاں ابتک وہیں کھڑیں تھیں اور ان کے ساتھ انکے مالکان جنمیں سے ایک سفید فام مرد اور دوسری ایک سفید فام خاتون تھی، بھی کھڑے تھے۔

اس شخص نے پولیس افسر سے دریافت کیا کہ اگر اسکا کام مکمل ہوچکا ہوں تو وہ جا کر ان لوگوں سے کچھ بات چیت کرنا چاہتا ہے۔

پولیس افسر بولا: "مجھے ابھی ان دونوں کے بھی بیانات قلمبند کرنے ہیں، آپ ان سے جو بات کرنا چاہتے ہیں کرلیں اور ہاں یہاں شدید ٹھنڈ ہورہی ہے، اس لیئے آپ ان صاحب سے درخواست کرکے ان کی گاڑی میں بیٹھ جائیں ورنہ آپکو ٹھنڈ

"بھی لگ سکتی ہے، ان سے فارغ ہو کر میں آپ کو پھر بلواتا ہوں۔
وہ شخص قدرے جھینپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ پہلے خاتون کی جانب بڑھا جو کہ مسلسل کسی کے ساتھ اپنے سیل فون پر باتیں کرنے میں مصروف تھی۔ اسے اپنے پاس آتے دیکھ کر اسنے اپنے کان سے سیل فون ہٹالیا اور اسکی جانب متوجہ ہوئی۔
دراصل یہ سارا معاملہ ایک اچانک اور محض اتفاقی حادثہ تھا اور میری گاڑی نہ جانے" کیسے از خود بے قابو ہو گئی جس کے سبب یہ حادثہ پیش آیا جسپر میں آپ سے معذرت "خواہ ہوں
:اسکی یہ بات سن کر وہ خاتون ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ صرف اتنا ہی بولی
"(کوئی بات نہیں) IT OK"
اب وہ دھڑکتے دل کے ساتھ دوسری گاڑی کے مالک کے پاس پہنچا جو کے شدید ٹھنڈ کے سبب اپنے گاڑی کے اندر ہی بیٹھا تھا، اسے دیکھ کر گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ اس نے اس سے بھی کم و بیش انہی لفظوں میں معذرت طلب کی اور اسکی خلاف توقع اس شخص کا ردعمل بھی اسی خاتون کے جیسا ہی تھا۔ پھر اسنے

نہایت ہی جھجکتے ہوئے اس پولیس افسر کے کہنے کے عین مطابق اسکی گاڑی میں ٹھنڈ سے بچنے کیلئیے کچھ دیر بیٹھنے کی درخواست کی۔

یہ سنتے ہی اسنے کمال خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً نہ صرف اپنے ساتھ والی نشست کا دروازہ کھول دیا بلکہ اسپر پڑی ہوئے کاغذات اور چند کتابیں بھی اٹھا کر پچھلی نشستوں پر ڈالدی اور اسکے گاڑی میں داخل ہونے ہی ہیٹر مزید تیز کردیااور پھر پولیس افسر کے بلانے پر اسے حیران وپریشان چھوڑ کر اپنا بیان قلمبند کروانے چلا گیا۔

اب وہ اکیلا گاڑی کے ہیٹر والے گرماگرم ماحول میں گم سم بیٹھا ابتک کے سارے واقعات جو کہ اسکی فہم وفراست سے قطعاً بالاتر تھے کا شروع سے جائزہ لینے لگا۔

گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اسکی نظر جب ونڈ اسکرین کے باہر اس فٹ پاتھ پر پڑی، وہ سارا منظر جب اسنے اپنے دماغ کی اسکرین پر دھرانے کو کوشش کی تو اپنی گاڑی کے پارکنگ میں داخل ہونے اور پھر یک لخت ازخود رفتار پکڑ کر فٹ پاتھ پر سے ہو کر ٹیلے پر چڑھنے اور پھر واپس مڑ کر پارکنگ ایریا میں کھڑی دو گاڑیوں سے ٹکرانے تک کے مناظر تو اسکے حافظے میں ضرور محفوظ تھے البتہ اسکے

بعد کب گاڑی پارکنگ ایریا اور مکان کے بیچ حائل اس دو رویہ سڑک کو پار کر گئی اور مکان کی دیوار سے جا ٹکرائی اور وہ سب کچھ اسقدر تیزی سے ہوا کے اسے اپنے دماغ پر شدید زور دینے کے باوجود بھی کوئی منظر یاد نہ آ رہا تھا۔

اچانک اسے ایک اور بات کا بھی احساس ہوا اور اس احساس کے ساتھ ہی وہ سر سے پاؤں تک لرز اٹھا۔ یہ تو وہی فٹ پاتھ تھی جسکے پاس وہ روزانہ اپنی گاڑی پارک کرکے، دیگر بے شمار والدین کی طرح سے اپنے بچے کے ساتھ اسپر چلکر اسے اسکول کے اندر تک چھوڑتا تھا۔ عموماً اس وقت اس فٹ پاتھ پر کافی آمدورفت رہا کرتی ہے، لیکن اللہ کے کرم سے اس وقت جب اس کی گاڑی بے قابو ہوئی، معجزاتی طور پر وہ فٹ پاتھ بالکل خالی پڑی ہوئی تھی جبکہ بصورت دیگر کوئی سنگین حادثہ بھی وقوع پزیر ہو سکتا تھا۔ اسی طرح سے اس سڑک پر بھی پیدل یا گاڑیوں میں اسکول آنے والے بچوں اور انکو چھوڑنے کیلیئے آنے والے والدین کی بڑی تعداد کی آمدورفت رہتی ہے لیکن وہاں پر بھی معجزاتی طور پر اس وقت کوئی نہ تھا، وگرنہ یہ حادثہ کوئی اور شدید سنگین صورتحال بھی اختیار کر سکتا تھا۔

اس خیال کے آتے ہی اس نے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے اس سنگین حادثے میں نہ صرف اسکے بچے اور اسے بالکل محفوظ رکھا بلکہ اپنے فضل و کرم

سے دوسرے بچوں اور انکے والدین کو بھی کسی خطرناک حادثے کا شکار ہونے سے بچا لیا تھا۔۔

ابھی وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ گاڑی کے مالک نے آکر اسے بتایا کہ ان دونوں کے بیانات مکمل ہو چکے ہیں اور اب پولیس افسر اسے دوبارہ طلب کر رھا ہے۔

پولیس افسر نے اسے اپنی گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور جب وہ اندر بیٹھ چکا تو اس سے مخاطب ہوا:

"سب سے پہلے تو میں آپ سے یہ کہنا چاہوں گا کہ اسقدر شدید ترین حادثے کے بعد بھی جس حوصلہ مندی اور تحمل سے کام لیتے ہوئے آپ نے خود کو یکجا رکھا وہ قابل تعریف ہے۔"

پولیس افسر کے منہ سے یہ الفاظ سن کر وہ بے حد حیران ہوا اور اسنے اپنے دل ہی میں سوچا:

"میرا اس وقت سے لیکر ابتک جو حال ہے وہ تو میں ہی جانتا ہوں اور اس حادثے"

کو اللہ کی مرضی گردانتے ہوئے، تب سے لیکر اب تک اپنی گھبراہٹ اور خوف پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن اصل صبر و تحمل اور بردباری کا مظاہرہ تو خود اس پولیس افسر اور اسے بھی کہیں زیادہ بڑھکر ان دونوں نے کیا ہے جن کی گاڑیوں کو نقصان پہنچا تھا۔ "

ظاہر ہے کہ وہ اپنے منہ سے کیا کہہ سکتا تھا، اپنے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ سجا کر اسنے محض دھیرے سے اپنا سر ہلا دیا۔

لیکن ابھی اسکے مزید حیران ہونے کی باری تھی اور پولیس افسر نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا:

" ان دونوں نے بھی آپ کے رویئے کی تعریف کی ہے اور جب آپ کی گاڑی ان کی گاڑیوں سے ٹکرائی تو اس وقت وہ دونوں اپنی گاڑیوں میں ہی موجود تھے اور انہوں نے اس حادثے کو اچانک وقوع پزیر کسی ممکنہ میکانکی خرابی سے تعبیر کیا ہے اور آپکا قصور نہ ہونے کے باوجود ریاست جارجیا کے قانون کے مطابق مجھے آپکا ٹکٹ (چالان) بنانا ہی پڑیگا، البتہ میں کسی قسم کے سخت چارجز عائد کرنے کے برعکس محض "اپنی لین برقرار نہ رکھ سکنے" کی دفعہ عائد کر رہا ہوں جسے آپ باآسانی عدالت میں چیلینج بھی کر سکتے ہیں اور مجھے قوی امید ہے

کہ متعلقہ جج اس حادثے کی وجوہات کو دیکھتے ہوئے آپکو بناَ جرمانہ عاید کیئے ہی یہ ٹکٹ خارج کردیگا. "

یہ کہہ کرافسر نے اس سے ٹکٹ پر دستخط کروائے اور متعدد کاپیوں میں سے ایک پیلے رنگ کے کاپی علحیدہ کرکے اسکے حوالے کردی۔

انتہائی حیرت زدہ ہوتے ہوئے اسنے ٹکٹ وصول کیا اور پھر افسر سے مخاطب ہوا:

"میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے ساتھ صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسقدر نرمی کا برتاؤ کیا۔ دراصل یہ پہلا موقعہ ہے کہ میں کسی حادثے کا شکار ہوا ہوں لہٰذا اگر آپ محسوس نہ کریں تو میں آپ سے یہ پوچھنا چاھوں گا کہ اب مجھے کیا کرنا ہوگا؟ "

جی ضرور" افسر نے بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا: "

پولیس سے متعلق کاروائی تو مکمل ہوچکی ہے۔ میں نے آپ کے انشورنس کارڈ سے " تینوں متاثرہ فریقین کو اپنے اپنے کلیم داخل کروانے کیلیئے مطلوبہ معلومات فراہم کردیں ہیں اور اب آپ فوری طور پر اپنی انشورنس کمپنی سے رابطہ قائم کرکے انہیں حادثہ کی مکمل تفصیلات بہم پہنچادیں۔ عموماً

انشورنس کمپنیاں پولیس رپورٹ بذریعہ فیکس ازخود حاصل کرلیتی ہیں جس کیلیئے انہیں محض پولیس رپورٹ نمبر درکار ہوتا ہے جو کہ آپکو جاری کردہ ٹکٹ پر موجود ہے۔ آپ کی گاڑی ٹوئینگ ٹرک پر لادھی جاچکی ہے لہٰذا اب آپ اس ہی کے ہمراہ روانہ ہوجائیں"۔

ٹوئینگ ٹرک کا ڈرائیور جو اسکا انتظار کرہا تھا اسے آتے دیکھ کر اپنی نشست پر سوار ہوگیا اور پھر ٹرک ایک نامعلوم سمت کی طرف روانہ ہوچکا تھا۔ کچھ دیر وہ ہونہی گومگوں کی سی کیفیت میں رہا پھر ڈرائیور سے مخاطب ہوا :

"ہم کہاں جارہے ہیں؟"

میں آپ کی گاڑی کو قریبی مرمتی مرکز (کولیژن سینٹر) لے جاکر اتار دوں گا، جہاں " وہ لوگ گاڑی کا مکمل معائنہ کرکے اخراجات کا تخمینہ لگائیں گے اور آپ کی انشورنس کمپنی کا نمائیندہ بھی آکر گاڑی کے نقصانات اور اخراجات کے تخمینہ کا جائزہ لیگا اور مرمتی تخمینہ گاڑی کی مارکیٹ ویلیو سے زیادہ ہونے کی صورت میں انشورنس کمپنی گاڑی کو ناقابل مرمت قرار دیکر آپکو اسکی موجودہ مارکیٹ ویلیو کے حساب سے ادائیگی کر دیگی۔" اس نے اپنی نگاہیں ونڈاسکرین پر مرکوز رکھتے ہوئے کہا اور پھر اچانک بولا:

آپ نے اپنی انشورنس کمپنی کو"

حادثہ کی تفصیلات وغیرہ سے آگاہ کیا بھی ہے کہ نہیں؟ اور کیا آپ کی انشورنس میں "فری رینٹ اے کار کی سہولت میسر ہے؟

اس کے ان سوالات پر وہ کچھ سوچتا ہوا بولا:

دراصل میں اپنا سیل فون گھر ہی پر بھول آیا تھا لہذا ابتک تو انکو فون نہیں کرسکا ہوں" اور اس وقت باوجود کوشش کے بھی مجھے یاد نہیں آ رہا ہے کہ آیا میری انشورنس میں "رینٹ اے کار کی سہولت موجود بھی ہے کہ نہیں؟

اسکی پریشان سی شکل دیکھ کر شاید ڈرائیور کو اسپر ترس ہی آگیا. اسنے اس سے انشورنس کمپنی کا نمبر مانگ کر اپنے سیل فون سے خود ہی فون کرڈالا اور نہ صرف انہیں مرمتی مرکز کا پتہ فراہم کیا بلکہ دیگر تفصلات جاننے کے بعد اسے آگاہ کیا کہ وہ کسی بھی قریبی رنینٹ اے کار" پر جاکر ایک مخصوص یومیہ کرائے کی گاڑی آئیندہ تیس دنوں تک " کیلیئے حاصل کرسکتا ہے اور یہ تمام رقم انشورنس کمپنی ادا کریگی۔

یہ جان کر اسے قدرے اطمینان ہوا کہ کم از کم جب تک اسکی گاڑی مرمت ہوکر نہیں آ جاتی اسے آئیندہ تیس دنوں تک کیلیئے گاڑی کی فکر کرنے کی تو کم از

کم چنداں ضرورت نہیں۔

اچانک اسے یاد آیا کہ اسکی بیگم گھر پر پریشان ہو رہی ہو نگی لہذا اسے نے ایک با پھر ڈرائیور سے درخواست کرکے اسکے سیل فون سے گھر کا نمبر ملایا اور بات کرنے پر پتہ چلا کہ جب بیگم نے اس کے باس کو فون کرکے تمام صورتحال سے آگاہ کیا تو انہوں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ وہ اسے لینے آرہے ہیں تاکہ جائے حادثہ پر جاکر اسے پک کیا جاسکے۔ جسپر اس نے انہیں وھاں جانے کی بجائے ڈرائیور سے مرمتی مرکز کا پتہ لکھوا کر انہیں وھاں آنے کی تاکید کی اور ان کے کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ بھی وھاں آ پہنچے۔

ڈرائیور نے انتظامیہ سے بات چیت کرکے گاڑی ٹرک سے اتار کر انکے حوالے کردی اور متعلقہ کلرک نے اس سے گاڑی کی چابی وصول کرکے اس سے چند کاغذات پر دستخط کروائے۔

اس کاروائی سے فارغ ہو کر اب وہ اپنے باس کی گاڑی میں سوار ہو کر قریبی رینٹ اے سینٹر کی جانب چل پڑا اور پھر کچھ ہی دیر بعد اسکے باس نے اسے وھاں اتارا اور خود روانہ ہوگیا۔

رینٹ اے کار کے دفتر میں موجود ڈیوٹی کلرک کو اپنا انشورنس کارڈ تھما دیا جس نے انہیں کچھ دیر انتظار گاہ میں بیٹھ کر توقف کرنے کیلیئے کہا اور پھر تھوڑی دیر بعد آ کر ان سے بولا :

آپکی انشورنس کمپنی سے تو ہماری بات ہو چکی ہے، لیکن آپکی انشورنس میں ایک" درمیانے درجے کی کار کا کرایہ شامل ہے اور چونکہ اس وقت ہمارے پاس کوئی چھوٹی یا درمیانی کار موجود نہیں اسلیئے اگر آپ کی انشورنس کمپنی کی طرف سے منظور شدہ کرائے میں کچھ رقم مزید اپنی جانب سے شامل کرنے کو تیار ہو جائیں تو ہم اس وقت "یہاں موجود چھ نشستوں والی ٹو؛وٹا کی وین (ایس یو وی) آپکو دے سکتے ہیں دیکھیئے صاحب،" وہ ڈیوٹی کلرک سے بولا: "ہمیں بڑی گاڑی کی قطعاً ضرورت نہیں ہے اگر آپ ہماری انشورنس کمپنی کی مختص کردہ رقم میں ہی کوئی گاڑی فراہم کر سکتے ہیں تو "ٹھیک ہے ورنہ پھر ہم کسی دوسری جگہ کو آزمائیں۔

بحر حال تقریباً آدھ گھنٹہ کی گفت و شنید اور ضروری کاغذی کاروائی کے بعد ڈیوٹی کلرک نے بنا کسی اضافی کرائے کے انہیں چھ نشستوں والی ٹویوٹا کی چابی یہ کہتے ہوئے تھما دی :

یہ گاڑی آئیندہ تیس دنوں تک اپنی انشورنس پر چلا سکتے ہیں اور ہم اسکا بل ازخود" انشورنس کمپنی کو روانہ کردینگے البتہ اسکے بعد کی مدت کے کرائے کے ذمہ دار آپ خود ہونگے"۔

کچھ دیر کے بعد وہ اور اسکی بیگم گاڑی میں سوار ایک بار اس خیال کے تحت اسکول کی طرف رواں دواں تھے کہ وہاں جاکر بچے کی خیر و عافیت معلوم کرلی جائے تاکہ اس حادثے کے سبب کسی ذہنی پریشانی کی صورت میں اسے اپنے ساتھ ہی گھر واپس لے جایا جاسکے۔

کچھ ہی دیر بعد وہ اس نئی گاڑی کو اسی پارکنگ ایریا میں پارک کررہا تھا جہاں کچھ گھنٹوں قبل وہ حادثے کا شکار ہوا تھا۔ جیسے ہی وہ گاڑی سے اترا تو اچانک ایک خاتون جسکے ہاتھ میں ایک مائیک جس پر ٹی وی چینل "فاکس فائیو" کا نشان بنا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ایک شخص جسنے اپنے کاندھے پر ایک بڑا سا کیمرہ لادھ رکھا تھا نے اسے گھیر لیا۔

یہ "فاکس نیوز" کے مقامی چینل کی ٹیم تھی اور اس حادثے کی اطلاع پاکر اس کی رپورٹ تیار کرنے آئی تھی۔ مذکورہ خاتون اینکر نے فوراً ہی اپنا سوال داغ

دیا۔

"کیا آپ کے علم میں ہے کہ جس نوعیت کے حادثہ کا شکار ہوئے تھے، آج سے چند ماہ قبل اسی میک اور ماڈل کی گاڑی اسی قسم کے حادثے کا شکار ہو چکی ہے، جس میں گاڑی میں سوار چاروں افراد کی جانیں چلی گئی تھی"۔

یہ سن کر تو اسکا سانس اسکے سینے میں اٹکے کا اٹکا ہی رہ گیا اور وہ ابھی اسی کیفیت میں ہی تھا کہ وہ خاتون پھر سے بول پڑی:

"دراصل اس میک اور ماڑل کی گاڈیوں کو کمپنی نے ایکسیلیئیٹر سسٹم میں پیدا ہو جانے والے اچانک خلل جو کہ عموماً شدید ٹھنڈ کے باعث ہو جایا کرتا ہے اور گاڑی کی رفتار از خود بڑھنے لگتی ہے، کی مرمت کیلیئے واپس طلب (ریکال) کیا ہوا ہے، کیا آپکو اس ضمن میں کوئی نوٹس موصول ہوا تھا؟"

"جی نہیں یہ گاڑی دراصل میں نے استعمال شدہ چند سالوں قبل ریاست فلوریڈا میں رہائش کے دوران خریدی تھی اور غالباً کمپنی کے پاس پتہ نہ ہونے کے سبب وہ نوٹس نہ مل سکا ہو"۔ اس نے جواب دیا۔

لیکن اسکا اعلان تو متعدد بار میڈیا پر بھی ہو چکا ہے" وہ بولی
بحر حال مجھے اسکی خبر نہ تھی" اس نے جواب دیا۔"
دراصل ہم اس گاڑی میں موجود اس مسلئے سے عوام الناس کو آگاہ کرنے کیلیئے اپنے"
چینل کیلئیے ایک رپورٹ تیار کر رہے ہیں" خاتون نے تفصلات بتاتے ہوئے کہا: "یہ
رپورٹ آج شام پانچ بجے والی خبروں میں نشر کی جائے گی للذا آپ اس حوالے سے
تمام والدین کے نام پیغام ریکارڈ کروادیں کہ وہ اپنی گاڑیوں کا مکمل معائنہ ضرور
"کروالیں۔

پھر وہ اس سے مخاطب ہو کر بولی:

ہمیں عینی شاہدوں نے اس حادثے کی جو تفصیلات بیان کی ہیں اس کے مطابق تو یہ "
حادثہ بے حد خطرناک صورتحال بھی اختیار کر سکتا تھا لیکن آپ، آپکے بچے اور دیگر
"لوگوں کو خدا نے بالکل محفوظ رکھا۔

اس نے خاتون اینکر پرسن کے کہنے کے مطابق اپنا پیغام ریکارڈ کروادیا اور پھر وہ دونوں
اسکول کی عمارت میں داخل ہوگئے اور اپنے بچے کے کلاس روم میں

جا پہنچے۔ جہاں انکا بچہ کچھ دیر قبل ہونے والے حارثے کو یکسر بھلا کر اپنی تعلمی سرگرمیوں میں مشغول و مصروف تھا۔

-

یہ سال رواں کے ماہ جنوری کی چھٹے تارخ کا واقعہ ہے جو کہ خود راقم الحروف کو صبح تقریباً ساڑھے سات بجے اپنے بیٹے علی کو اسکے اسکول چھوڑنے جاتے ہوئے پیش آیا تھا۔ اس دن کے بعد سے تادم تحریر بلاناغہ اب بھی ہم علی کو اسی طرح سے روزانہ اسکول چھوڑنے جایا کرتے ہیں۔ حلانکہ اب بھی ہمارا ایسے بہت سے لوگوں سے کم و بیش روزانہ سامنا ہوتا ہے جو کہ اس واقعے کے چشم دید گواہ تھے لیکن نہ تو ان میں سے کبھی کسی نے اور نہ ہی اسکول کی انتظامیہ میں سے کسی نے ہمیں روک کر اس حادثے سے متعلق کچھ بھی کہنے یا سننے کی کوشش کی، ہاں البتہ ہمیں اور علی میاں کو دیکھ کر ان کے چہروں پر ایک دوستانہ سی مسکراہٹ ضرور پھیل جاتی ہے اور حد تو یہ ہے کہ متعدد بار ان صاحب اور صاحبہ سے بھی آمنا سامنا ہوتا رہتا ہے اور ہم محض ایک دوسرے کے ساتھ مسکراہٹوں کا تبادلہ کرتے اور کبھی اشاروں کنایوں میں تو کبھی زیرلب تو کبھی باآواز بلند دعا سلام کا تبادلہ

کرتے ہوئے ایک دوسرے کے سامنے سے کچھ ہوں گزر جاتے ہیں جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

یہ سب دیکھ کر کبھی کبھی ہمیں خیال آتا ہے کہ اگر اسی نوعیت کا واقعہ ہمارے ساتھ وطن عزیز میں پیش آیا ہوتا تو کیا ہوا ہوتا؟

یہ بھی ممکن تھا کی یہ معاملہ فریقین کے درمیان کسی دیرینہ رنجش کا سبب بنکر تاحیات کبھی نا ختم ہونے والی دائمی چپقلیشوں کا پیش خیمہ بن جاتا۔

یہ بھی ممکن تھا کہ دو گاڑیوں کو ٹکر مار کر ایک مکان کی دیوار پر اپنی گاڑی مار دینے پر ہمیں متاثرہ مخالف فریقین، ان کے حمایتی و حواری اپنے دل نادان کی بھڑاس نکالنے کیلیئے اور وہاں موجود جیالی طبیعت کے سر پھرے محض دل پشوری کی خاطر خود ہمیں گاڑی سے نکال کر اپنے ہاتھوں، لاتوں اور ڈنڈوں سے خوب دھلائی کرتے ہوئے یا تو اس کہانی کو خود ہی کوئی بھیانک انجام دے ڈالتے اور ہماری گاڑی کو آگ لگادی جاتی یا پھر ادھ موا کرکے پولیس کے حوالے کردیتے اور پھر باقی بچی کھچی جان ہمارے اپنے ہم وطن پولیس والے اپنی بدنام زمانہ "چھترول" کرکے نکال لیتے اور پولیس اور مخالف فریقین سے "مک مکا" اور معاملہ "رفع دفع" کروانے کیلیئے ہماری بیگم کو (کسی سفارش، کسی اعلیٰ

سرکاری و حکومتی عہدیدار سے ہماری جان پہچان کے نہ ہونے کے سبب) اپنے زیورات بیچنے پڑتے اور گھر کی جمع پونجی کے علاوہ کسی عزیز رشتہ دار سے بھاری رقوم قرض بھی لینا پڑ جاتی اور پھر اس چنگل سے آزاد ہو کر کر ہم بسوں، ویگنوں، رکشوں اور ٹیکسیوں میں روز دھکے کھاتے اور اپنے مقدروں کو کوستے ہوئے کام پر پہنچتے۔

اور ہاں۔۔۔! قارئین کو یہ بھی بتاتے چلیں کہ پر چھے ماہ بعد گاڑی کی جس انشورنس کا پریمیم ادا کرتے وقت ہمیں شدید کوفت کا سامنا ہوتا تھا، اسی انشورنس کے سبب تمام تر مراحل بخیر و خوبی طے پا گئے۔

انشورنس کمپنی کے سروے کے مطابق ہماری گاڑی مکمل طور پر تباہ اور نا قابل مرمت قرار پائی لہٰذا انشورنس کمپنی کی جانب سے گاڑی کی مارکیٹ ویلیو پر معمولی بحث کے بعد باہمی رضامندی سے کلیم کی ادائیگی حادثے کے بیس سے پچیس دنوں کے اندر اندر کر دی گئی۔

البتہ اس حادثے کی وجہ سے انشورنس کمپنی نے ہمارے پریمیم میں سالانہ تقریباً دو سو ڈالر سے زائد کا اضافہ کر دیا، جو کہ یہاں ایک عام سی بات سمجھی جاتی ہے اور کسی ٹریفک اصول کی خلاف ورزی پر ملنے والے تادیبی ٹکٹ یا

کسی حادثے کی صورت میں انشورنس کمپنیاں پریمیم میں اچھا خاصا اضافہ کردیا جاتا ہے۔۔

پولیس افسر کی جانب سے جاری کردہ ٹکٹ کو ہم نے متعلقہ عدالت میں بے قصور ہونے کے دعویٰ (نوگیلٹی پلیڈ) کے تحت چیلنج کیا۔ ماہ جنوری میں جاری ہونے والے اس ٹکٹ کی اولین شنوائی غالباً یکم مارچ کو ہوئی تھی جس میں ہم نے عدالت کے سامنے "نوگیلٹی پلیڈ" کیا تھا، لہٰذا عدالت کی جانب سے متعلقہ پولیس افسر کو طلب کرنے کیلیئے مذکورہ کیس کو نامعلوم مدت کیلیئے ملتوی کردیا گیا اور مذکورہ عدالت میں اس نوعیت کے کیسوں کی بہتات ہونے کے سبب، جی ہاں، آپ نے بالکل درست پڑھا ہے جناب ! آپ کو اپنی آنکھیں اور صاحب ! آپ کو اپنی عینک صاف کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں، یہاں امریکی عدالتوں میں بھی غیر فیصلہ شدہ کیسوں کی بھرمار ہے، جس کے سبب ہم نے اس قسم کے کیسوں میں سائلین کو ڈیڑھ سے دو برسوں تک انتظار کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے، لہٰذا آج جب مورخہ بیس اکتوبر کو زیرِ نظر سطور تحریر کیں جارہیں ہیں، کم و بیش سات ماہ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود اگلی شنوائی کی تاریخ موصول نہیں ہوئی۔

اس بھیانک حادثے نے ہمیں گو کہ ہلا کر رکھ دیا تھا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس حادثے کے محض چند گھنٹوں ہی کے بعد ہم اپنی زندگی کے معمولات کی

جانب گامزن ہو چکے تھے اور اسی روز دوپہر تک ہم اپنے کام پر پہنچ کر اپنے فرائض منصبی بھی بخوبی انجام دے رہے تھے۔

*_*_*_*_*_*_*_*_*_*_*_*_*_*_*_*_*_

میں ہوں جلاد مجھے تم جان لو پیارے

یک دوست ہیں ہمارے، کراچی میں رہتے ہیں، نام ہے انکا راشد اشرف، صاحب کتابوں کے کچھ ایسے رسیا ہیں کہ الصبح صدر کراچی میں اتوار کے اتوار لگنے والے کتب بازار میں بلا ناغہ جا پہنچتے ہیں اور اس سے پہلے کہ ان کی من پسند کتابیں کوئی اور اچک لے جائے خود ہی اچک لے آتے ہیں۔ بخدا ہم انہیں کسی طور ہرگز ہرگز اچکا نہیں گردانتے، اچکا تو ہماری چشم تصور میں ان کو وہ کتب فروش اپنے دل ہی دل میں کہتے ہونگے کہ جو بقول خود بھائی راشد کے ان سے جس کتاب کے چار سو روپے طلب کرتے ہیں اور وہ اپنے بھاؤتاؤ سے محض سو روپوں میں ان سے اچکنے، معاف کیجئے گا، حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور پھر بڑے ہی فخر کے ساتھ ان تمام کتابوں کے سرورق اسکین کرکے اپنے فیس بک کے صفحے پر آویزاں کرکے اپنے حاصل کردہ مالِ غنیمت کی اپنے حلقہِ احباب میں تشہیر کرتے ہیں۔ ابھی چند دنوں قبل ہی انکا اسی موضوع پر ایک بڑا ہی دلچسپ مضمون "کتابوں کا اتوار بازار" کے عنوان سے "ہماری ویب" پر شائع ہوکر داد و تحسین حاصل کرچکا ہے۔

گذشتہ اتوار جب موصوف کتب بازار پہنچے تو وہاں سے انہیں اپنے بچپن میں پڑھی ہوئی نامور مصنف جناب اے حمید کی تحریر کردہ سیریز "موت کا تعاقب" کی چند

دیگر اقساط کے ہمراہ "وحشی جلاد" نامی قسط بھی حاصل ہو گئی اور جسبِ معمول اسے بھی انہوں نے اپنے فیس بک کے صفحے پر آویزاں کر دیا۔ ہماری طرح اسے دیگر دوست و احباب نے اسے دیکھا اور دیکھ کر اپنے بچپن کی حسین یادوں میں کھو گئے۔

ہمارے اور ان کے ایک مشترکہ دوست اسد ضیاء حسن جو کہ بریڈ فورڈ، برطانیہ میں مقیم ہیں اور ماشااللہ بہت ہی اچھے شاعر بھی ہیں، نے مذکورہ ناول کے عنواں کے حوالے سے تمام دوستوں سے ایک انوکھا سوال کر ڈالا:

س: جلاد کے ساتھ وحشی کا سابقہ کیا ضروری ہے؟؟؟

انکا یہ سوال پڑھ کر ہمیں اپنے طالب علمی کا دُور اور اپنی چھٹی جماعت کا اُردو کا پریڈ یاد آگیا اور ہم نے سوچا کہ یہ ہی سوال اگر ہمارے اُردو کے استاد کرتے تو وہ کچھ یوں ہوتا:

س: جلاد کے ساتھ وحشی کا سابقہ کیا ضروری ہے؟؟؟

اپنے جواب کو مثالوں اور وضاحتوں سے ثابت کریں۔

حسن صاحب کے سوال کا ممکنہ جواب یہاں ہم سب کے مشترکہ کرم فرما ڈاکٹر احمد

صفی (فرزندِ ارجمند ابنِ صفی مرحوم) کی تجویز و مشورے پر یہاں درج ذیل ہے اور ہم اپنی اس ناچیز کوشش کو صفی صاحب سمیت دیگر دونوں اصحاب اور محترمہ رابعہ احمد جنھوں نے ہماری فرمائش پر اس مضمون کا اسقدر برجستہ عنوان تحویر کیا، سے منسوب کرتے ہیں، پڑھیئے شاید آپکو پسند آئے۔ :

ج: جلاد کے ساتھ وحشی کا سابقہ تفریق پیدا کرنے کی غرض سے شامل کیا گیا ہے۔ چونکہ ہمارے معاشرے میں متفرق اور انواع و اقسام کے جلاد پائے جاتے ہیں، لہٰذا لفظِ وحشی جلاد کی اس مخصوص قسم کو واضح اور دیگر جلادوں سے منفرد کرنے کیلئے شامل کیا گیا ہے۔ معاشرے میں موحود جلادوں کی چند اہم اور مشہور ترین اقسام مثالوں اور وضاحتوں کے ساتھ درج ذیل ہیں، جس سے جلاد کے ساتھ وحشی کے سابقے کے استعمال کی غرض و غایت مذید اجاگر ہوسکے گی۔

: "۔ "حسین جلاد 1

جلادوں کی یہ اقسام انتہائی قریب سے دیکھنے پر بھی بالکل بے ضرر معلوم ہوتی ہے۔ دیکھنے میں بظاہر نازک اندام، پیکر شرم وحیاء اور سونے پہ سہاگہ یکسر نرم و شریں سخن۔ مگر انکی جلادی طبیعت کا اندارہ تو محض وہ ہی لگا سکتا ہے جو کبھی ان کے ہتھے چڑھا ہو۔ غالباً اسی لیئے مرحوم استاد نصرت فتح علی خان فرما گئے تھے کہ :

"پر بلا آ جائے لیکن حسن والوں سے اللہ بچائے"

جس بیدردی اور بے نیازی کے ساتھ جلادوں کا یہ طبقہ اپنے عاشق نامراد کے دل بسمل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے، کوئی شاطر سے شاطر، کہنہ مشق اور ماہر فن وحشی جلاد بھی ان کے فنِ بے مثال کی گرد کو چھو بھی نہیں سکتا اور اس پر طرہ یہ کہ :

"دل کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے مسکرا کر چل دیئے"

2- "سیاسی جلاد" :

یوں تو جلادوں کی یہ قسم ملک بھر میں بلعموم اور صوبائی دارالحکومتوں میں بلخصوص انتہائی وافر مقدلر میں پائی جاتی ہے، البتہ وفاقی دارالحکومت میں اسقدر بہتات کے ساتھ ہے کہ اگر سڑک کے کنارے پڑھا ہوا کوئی پتھر اٹھا لیا جائے تو اسکے نیچے سے بھی دو چار تو باآسانی نکل آتے ہیں۔ محکمہ انسدار بے رحمی انسانیات کے حالیہ اعلامیہ کے مطابق جلادوں کی جملہ معلوم و نامعلوم اقسام میں سے اس قسم کو سب سے مضر اور خطرناک قرار دیا گیا ہے، کیونکہ دیگر اقسام کے جلاد تو دو چار یا پھر زیادہ سے زیادہ درجن بھر انسانوں پر اپنی مشق جلادی آزماتے ہیں لیکن یہ ایک ایسا بے قابو ٹڈی دل ہے جو کے اپنے جلادی حربوں سے ملک کے ملک تہس و نہس اور تباہ و برباد کرکے رکھ دیتا ہے اور سب

کچھ ہڑپ کرکے ڈکار تک نہیں مارتا۔

3- "ڈاکٹری جلاد" :

جلادوں کی یہ قسم ہر گلی و محلہ کے نکڑوں پر بکثرت پائی جاتی ہے اور ان جلادوں کی "حسین جلادوں" کے ساتھ یہ قدر مشترک ہے کہ لوگ باگ خود چلکر ان جلادوں کے پاس حاضر ہو کر انتہائی عقیدت و احترام کے ساتھ اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دیکر کہتے ہیں کہ: "آ بیل مجھے مار" اور کچھ انکے رُوبرو سر جھکا دیتے ہیں جیسے کہ رہے ہوں: "سر تسلیم خم ہے، جو مزاج یار میں آئے"، ویسے سچ تو یہ ہے کہ اللہ دوست دشمن سب کو ہی ان کے جلادی حربوں سے محفوظ رکھے، نا معلوم کب، کہاں اور کیسے اپنی میز جراحی پر لٹا کر خوابِ خرگوش میں مبتلا کر دیں اور جب آنکھ کھلے تو معلوم ہو کہ دل، گردہ، جگر، تلی، پتہ یا کلیجہ بطور سوغات اڑا لے گئے ہیں اور اگر اس حادثے سے جان بچ گئی تو اپنا کوئی آلہ جلادی، ہمارا مطلب ہے کہ آلہ جراہی یا خون چوسنے، پھر معذرت، خون پونچھنے والا تولیہ اندر بھول کر ٹانکے لگا دیئے اور یہ لمبا چوڑا بل بھی ہاتھوں میں تھما دیا کہ جسپر یہ ہی مصرعہ صارق آتا ہے کہ:

"نہ خدا ملا نہ وصال صنم"

اور خود ان جلادوں کا حال یہ ہے کہ بھلے ہی سے ان کے مریض جاں بلب کو افاقہ

: ہو نہ ہو، شفاء نہ ملے نہ ملے، انہیں اپنا مختتانہ ضرور میسر آ جاتا ہے، بقول فیص

جو ہارے تو بھی یہ بازی مات نہیں "۔"

: "۔ "مدرسی جلاد 4

لاتوں کے بھوت، باتوں سے نہیں مانتے" کے مقعولہ پر ایمان کامل رکھنے والی یہ قسم" شہروں میں تو اب خال خال ہی نظر آ تی ہیے، البتہ سرکاری اسکولوں اور دیہات و قصبات کے ٹاٹ اسکولوں اور مدرسوں و مکتبوں میں ان کی افزائش نسل اب بھی زوروں پر ہے۔ اپنے بدنام زمانہ "مولا بخش" نامی ہتھیار سے اس طبقے نے ملک و ملت کے نونہالان کو راہ راست پر لانے کا عظیم کارِ خیر اپنی توندوں، معاف کیجئے گا، کاندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ نیت دیکھی جائیگی نہ کہ عمل، اب یہ اور بات ہے کہ نیت تو انکی ہمیشہ نیک و صالح ہی ہوتی ہے اور اسکے پیچھے بھلائی اور فلاح کا مخلصانہ جذبہ ہی تو کارفرما ہوتا ہے لیکن اب اگر وہ معصوم انکے "مولا بخش" صاحب کا وار تک نہ سہ سکیں اور کبھی اپنے ہاتھوں تو کبھی اپنے پیروں کی ہڈیاں تڑوا بیٹھیں اور اپنے بدنوں پر جا بجا نیل پڑھوالیں تو بھلا اب اسمیں انکا کیا قصور ہے اور خدا لگتی کہیں تو سارا کا سارا قصور خود ان نانہجاروں اور کمبختوں کے اپنے والدین کا ہے جو اپنے جگر کے لختوں کو متوازن غذا تک فراہم کرنے میں ناکام رہتے ہیں، جو ان کی

نازک و ناتواں ہڈیوں کو "مولا بخش" کی مار کے زیلی اثرات باالفاظ دیگر "سائیڈ ایفکٹس" سے محفوظ رکھ سکے۔ ان بیمارانِ ملت، زبان پھسلنے کی معذرت، ہمارا مطلب ہے کہ معمارانِ ملت کی اس بے لوث قومی خدمات کے اعتراف میں انہیں برقی و اشاعتی زرائعِ ابلاغ کی جانب سے "جلاد" جیسے قطعاً غیر پارلیمانی خطابات سے نوازا جاتا ہے جو کہ انکے قومی کردار کی سراسر توھین ہے۔

:"۔ قانونی جلاد5

:اس قسم کو مزید دو زیلی اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے

:"۔ "کالی قمیض والے قانونی جلاد5-1

گو کہ مذکورہ قسم ہر گز جلادی مقاصد کے حصول کی خاطر معرضِ وجود میں نہ لائی گئی تھی لیکن وہ جو کسی سیانے نے کہا ہے نہ کہ: "خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے"۔ جلادوں کی زیر تزکرہ قسم "سیساسی جلادوں" کے زیر اثر و زیر سایہ رہ رہ کراب خود بھی ایسی اعلیٰ ترین جلادی صفات سے آراستہ و پیراستہ ہوچکی ہے کہ ان کے کان تک کترنے لگی ہے۔ مگر خیر انکی حد تو بات محض کانوں کے کترنے تک ہی پہنچ پائی ہے، البتہ عوام الناس کا حال بے حد سنگین و رنگین ہے اور حالات کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے

کہ کسی سڑک پر ایک رہزن نے دو افراد کو پستول دکھا کر لوٹنے کی کوشش کی کہ اچانک سامنے سے ایک پولیس موبائل آتی نظر آئی جسے دیکھ کر دونوں کے چہروں پر رونق نمودار ہوئی۔ یہ دیکھ کر رہزن بولا: "زیادہ خوش ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، بہتری اسی میں ہے کہ میرے ہاتھوں ہی لٹ جاؤ کیونکہ میرے ہاتھوں سے تو وہ تمھیں بچالینگے لیکن پھر ان کے ہاتھوں سے تم لوگوں کو کون، کیسے اور کب تک بچائے گا اور میں تو تم کو اکیلا ہی لٹوں گا لیکن اس موبائل میں کم از کم پانچ چھے پولیس والے تو ضرور ہی ہونگے"۔ یہ سنکر دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر اپنی جیبوں میں جو کچھ تھا نکال کر اسکے حوالے کر دیا۔

:"۔ "کالے کوٹ والے قانونی جلاد5-2

یہ تو ہمیں نہیں معلوم کہ چچا غالب کے دور میں جلادوں کی زیر تزکرہ قسم پائی جاتی تھی بھی کہ نہیں، البتہ موصوف انکی شان میں جو اعلیٰ شعر موزوں کر گئے، اسے پڑھکر محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی جلادوں کے اسی طبقے کے ستائے ہوئے تھے:

ہوئے تم دوست جس کے
دشمن اسکا آسماں کیوں ہو

شاید اسی لیئے کہا جاتا ہے کہ اگر کسی سے دشمنی نکالنا مقصود ہو تو انہیں

بہلا پھسلا کر کسی مقدمے بازی میں الجھا دیجیئے اور پھر خود گھر جا کر لمبی تان کر چین کی نیند سو جائیں، انشاء اللہ العزیز، جلادوں کا یہ طبقہ آپکا بدلہ اس سے کچھ یوں لیگا کہ نامی گرامی قصابوں کو بھی شرمادیگا کیونکہ وہ بیچارے تو اپنے زبیح کو خوب کھلا پلانے کے بعد اسے زمین پر لٹا کر تکبیر کہہ کر حلال کرتے ہیں اور پھر اسکی کھال اتارتے ہیں، لیکن یہ ظالم تو سائلین کی کھال جیتے جی ہی انتہائی بیدردی کے ساتھ کھینچ لیتیے ہیں اور پھر تمام عمر کھال ہی کھینچتے رہتے ہیں۔

: "۔ "کاروبارِی جلاد 6

ہمارے معاشرے میں جنگ اور محبت کی طرح کاروبار میں بھی " سب جائز ہے" کا اصول کارفرما ہے اور اگر کسی کاروباری مِں جلادی فطرت و صفات بدرجہ اتم پائی جاتیں ہوں تو ایسا کاروبار دو آتشہ اور خود کاروباری "کریلا اور نیم چڑھا" کی عملی تفسیر بن جاتا ہے اور وہ جو فراز کہہ گئے ہیں نا کہ :

نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں سے ملے

اب ان کاروباری جلادوں میں بلا کم وکاست وہ تمام قابل قدر ہستیاں شامل ہیں کہ جنکا غیر متزلزل ایمان حضرت علامہ کے ان کے اپنے ہی ترمیم شدہ اس شعر پر ہے روح اقبال سے معذرت کے ساتھ)، اب یہ معلوم کرنا آپ کی زمہ داری ہے کہ)

وہ ترمیم سترویں تھی کہ اٹھارویں :
پلٹ کر لوٹنا، لوٹ کر پلٹنا
کاروبار گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
ان قابل قدر ہستیوں میں پانی میں دودھ ملانے، ہمارا مطلب ہے کہ دودھ میں پانی، مرچوں میں لال اینٹ کا برادہ، ثابت کالی مرچوں میں پپیتے کے بیج، گھی میں گریس ملانے والے، زائد المعیاد اور نقلی دوائیں بیچنے والے، گوشت میں پانی بھرے انجیکشن لگا لگا کر وزن میں اضافہ کرنے والے، بیمار اور مردہ جانوروں کو کاٹ کر اسکا گوشت فروخت کرنے والے اور نہ جانے ایسے ہی کتنے عظیم کارھائے نمایاں کے خالق اور موجد شامل ہیں۔

7 جلاد "پیری فقیری" ۔ :

کہتے ہیں کہ : "پیاسا کنواں کے پاس جاتا ہے" لیکن ان پیاسے جلادوں کے پاس عوام کے لبریز کنویں خود اپنی ناکیں رگڑتے جاتے ہیں۔ اب یہ جلاد کبھی 90 سالہ سنیاسی باوا تو کبھی بنگالی عامل بنکر کسی بے اولاد کو اولاد، سنگدل محبوب کو قدموں پر لاڈالنے، نافرمان اولاد کو مائل بہ فرمانبرداری، کاروباری کی دن دگنی اور رات چوگنی ترقی اور جن، بھوت، چڑیل اور بدروحوں کے سائے شرطیہ دور کردینے کا مژدہ سناتے نظر آتے ہیں۔ اب عوام کے مسائل بھلا

کیا ہی حل ہونے تھے، ہاں ان بابوں کی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں ضرور ہوتا ہے۔

:"بی جمالو جلاد" -8"

ارے بہن رضیہ، کیا تم نے خالہ شبراتن کی بیٹی حسینہ کے تارہ ترین آنکھ مٹکے کا قصہ سنا" جسکا چرچہ محلے بھر میں ہورہا ہے"۔ "کیا کہہ رہی ہو بہن "جمالو"، میرے تو فرشتوں تک کو کچھ خبر نہیں، اور زرہ دیکھو یہ حمیدہ، جمیلہ، کٹیلہ اور شجیلہ کتنی گھنیاں ہیں، سارا دن میرے گھر میں گھسیں، مجھ سے زمانے بھر کے چٹخارے دار قصے و کہانیاں مزے لیکر سنتیں ہیں، ارے وہ سامنے والوں کی لڑکی نے جب پرلی گلی والوں کے لڑکے کے ساتھ بھاگ کر شادی کرلی تھی، تو وہ میں ہی تو تھی کہ جس نے ان پھپھے کٹنیوں کو ساری کتھا حرف بحرف سنائی تھی اور یہ کل مُوہیاں سارا دن محلے کے ایک گھر سے دوسرے اور پھر تیسرے میں جاجا کر کن سوئیاں لیتں رہتیں ہیں اور ابھی یہ سب کی سب حرافائیں میرے یہاں سے گئیں ہیں، مجال ہے کہ مجھے ہوا بھی لگنے دی ہو، خاک ڈالوں انپر، ان سب کے کچے چٹھے تو میں تمھیں تفصیل سے بعد سناؤں گی پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ یہ خالہ شبراتن کی بیٹی حسینہ کا کیا قصہ ہے؟" بی جمالو آنکھیں مٹکاتی بولی: تم جاتو، مجھے کسی کے بارے میں کچھ کہنے کی قطعاً عادت نہیں ہے آخر اللہ کو منہ بھی تو دیکھانا ہے، لیکن اب اگر تم اتنا ہی اصرار

کر رہی ہو تمھیں بتائے دیتی ہو مگر پہلے قسم دو کے میرا نام نہ لوگی" قسم لینے کے بعد جمالو نے خوب نمک مرچ لگا کر وہ قصہ سنایا اور رضیہ نے خوب چٹخارے لیکر سنا اور پھر جلدی جلدی بی جمالو کو رخصت کرکے انتہائی تیزی کے ساتھ اپنے گھر کو تالا لگا کر محلے کی طرف نکل پڑی۔ یہ تازہ ترین چٹ پٹا قصہ سن کر اسکے پیٹ میں مروڑ اٹھنا شروع ہو گئے تھے اور اب انکا فوری علاج بھی تو کرنا لازم تھا اور ان مروڑوں کا واحد شافی علاج، ان مروڑوں کی محلے بھر کی عورتوں کے پیٹوں میں منتقلی کے سواء اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ لیکن ہم یہاں یہ بھی واضح کرنا اپنی اخلاقی زمہ داری سمجھتے ہیں کہ ایسے مروڑ ہمارے معاشرے میں صرف "بی جمالو" ہی کو نہیں اٹھا کرتے بلکہ بے شمار و لاتعداد " میاں جمال" بھی اس متعدی بیماری کا شکار ہیں اور گلہ و غیبت، افواہ سازی و افواہ بازی، سنی سنائی و بے پر کی خبریں اڑانا اور یہاں کی وہاں اور وہاں کی یہاں کرنے والے یہ جلاد ہی تو ہیں جو نہ جانے کتنے گھروں کا سکون اور کتنے معصوموں کی زندگیاں.برباد کرکے انہیں زندہ درگور کر دیتے ہیں۔

9- ادبی جلاد" :

آپ نے "دائرۂِ اسلام" کے بارے میں تو ضرور سنا ہوگا، جی آپ درست سمجھے بالکل وہی والا کہ جہاں آپ نے کچھ "ایسی ویسی" حرکت کی وہاں آپ ہوئے

دائرہِ اسلام" سے خارج! اسی طرح جلادوں کا زیر نظر یہ طبقہ جو کہ بہ زعم خود ادب" کا ٹھیکیدار، تھانیدار اور چوکیدار (اب یہ آپ کی منشاء ہے کہ جو بھی چاہیں خطاب ان کیلیئے منتخب کرلیں کیونکہ جلاب، ارے توبہ استغفار یہ ہم کیا کہہ گئے، دراصل ہم کہنا چاہ رہے تھے کہ گلاب کو کسی بھی نام سے پکاریئے، گلاب گلاب ہی رہتا ہے، مگر یاد رہے کہ اس گلاب میں رنگ و بو کم اور کانٹے زیادہ ہیں)، بزعم اپنے ہی از خود متعین شدہ ادبی دائرے میں کبھی کسی کو شامل کرتا ہے تو کبھی کسی کو مکمل فارغ خطی لکھ کر خارج کردیتا ہے۔ ویسے یہ بات تو طے ہے کہ سب قارئین قیامت کی نظر رکھتے ہیں (نا نا، بخدا آپ ہمیں غلط سمجھ رہے ہیں، ہم آپ سبکو "تاڑنے والے" کہنے اور سمجھنے کا گناہِ عظیم بھلا کیسے کر سکتے ہیں اور اگر آپ میں سے چند ایک ایسے ہوں بھی تو یہ آپ کا اپنا زاتی فعل و کردار ہے، اب ہم کون ہوتے ہیں بھلا کچھ کہنے اور اعتراض کرنے والے) فوراََ سمجھ گئے کہ ہمارا اشارہ ادب کے ناقدین ہی کی جانب ہے جو کہ بڑی حد تک ادب کے حق میں بلا شرکتِ غیرے جلاد ثابت ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ "ساون میں اندھے کو ہری ہری سوجتی ہے" لیکن ہمارے ادب کے ان پیدائشی اندھوں کو محض کھری کھری" سوجتی ہے، اب یہ اور بات ہے کہ عقل کے ان اندھوں اور گانٹھ کے" پوروں کو اپنی جو تنقید "کھری کھری" دیکھائی دیتی ہے وہ لکھنے اور خود ان کے پڑھنے والوں کو "جلی کٹی" سنائی دیتی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب موصوف سالہاسال میدانِ ادب میں کوئی قابل زکر کارنامہ

سرانجام نہ دے سکے تو اغیار کی نگارشات پر ہلہ بول کر اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہیں اور خود تو سرزمینِ ادب میں محض تنقید نگاری کے نرم و سہل سبزہ زار پر اٹکھلیوں اور خراماں خراماں چہل قدمیوں کے باوجود بھی خود کو تو "اپنے منہ میاں مٹھو" نہایت ہی قدآور ادبی شخصیت قرار دئیں (اب یہ تو خدا ہی جانتا ہے کہ وہ ادبی شخصیت ہیں کہ محض ایک دبی ہوئی شخصیت) لیکن اسکے برعکس اپنے قلب و روح کو شب و روز تخلیقی کرب کے پلِ صراط سے گزارنے والے نجانے کتنے ادبی "منصوروں" کو انکے مستانہ نعرہِ "اناالحق" کے ناقابلِ معافی جرم پر خود وہ اور انکے ہم پیالہ و ہم نوالہ تنقیدوں کے سنگ برسا برسا کر اپنے ہی خود ساختہ "ادبی دائرے" سے ہمیشہ ہمیشہ کیلیے جلاوطن کردیتے ہیں اور پھر تمام عمر اپنی ایڑی چوٹی (ایڑی اپنی اور چوٹی۔۔۔۔۔۔۔۔۔اب یہ نہ پوچھئیے گا کہ چوٹی کس کی، کیونکہ عقلمندوں کیلئیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے) کا زور لگا کر انہیں اس "ادبی دائرے" سے خارج ہی رکھے جانے میں کوشاں رہتے ہیں اور ان کی گردنوں نہ جانے کتنے ادبی "منصوروں" کا خونِ ناحق ہے ۔" "وحشی جلاد10:

اور لیجیئے صاحب، جگر تھام کے بیٹھئیے کہ اب میری باری آئی۔ جی ہاں یہ ہی وہ نامی گرامی جلاد ہے جو اس زیرِ نظر تحریر کی وجہِ تسمیہ بنا۔ لیکن شاید

آپ کو یہ پڑھکر حیرت ہوگی کہ جلادوں کی یہ مشہورترین قسم تیزی کے ساتھ معدومی کا شکار ہوتی جارہی ہےاور دنیا بھر میں سزائے موت کے متروک ہو جانے کے سبب غالباً اب تیسری دنیا ہی وہ جگہ ہے جہاں یہ قسم کسی حدتک پائی جاتی ہے۔ عالمی تنظیم برائے تحافظِ معدومیات کے انتہائی خفیہ مقام پر قائم عالمی صدر رفتر کی جاری کردہ رپورٹ میں عالمی برادری سے اپیل کی گئی ہے کہ جلادوں کی اس تیزی سے معدوم ہوتی ہوئی قسم کو بچانے کیلیئے انہیں فوری طور پر عجائب گھروں میں منتقل کردیا جائے تاکہ انہیں ہماری آنے والی نسلوں کے مشاہدے کیلیئے محفوظ کیا جاسکے۔ یاد رہے کہ اپنے نام کے برعکس جلادوں کی یہ قسم مندرجہ بالا دیگر تمام اقسام سے کہیں زیادہ بے ضرر پائی گئی ہے اور صرف اپنے فرائضِ منصبی ہی کی انجام دہی کے سلسلے میں جلادی تقاصوں کا مظاہرہ کرتی ہے۔ جبکہ یہ جلادوں کی وہ واحد قسم ہے کہ جسے آپ ان کے منہ پر ہی جلاد یا وحشی کہہ سکتے ہیں لیکن اگر آپ اپنی جان کی امان چاہتے ہیں تو ان کے علاوہ اوپر بیان کردہ دیگر اقسام کے جلادوں کو کسی طور جلاد کہہ کر پکارنے کی کوشش ہرگز نہ کریں، ایسا کرنے والا اپنے نقصان کا زمہ دار خود سمجھا جائیگا اور بچ رہنے کی صورت میں حوالہ پولیس کیا جائیگا۔

امید ہے کہ آپ سب پر روزِ روشن کی طرح یہ عیاں ہوگیا ہوگا کہ مصنف نے جلاد کے ہمراہ وحشی کا سابقہ اسکو جلاوں کی دیگر اقسام سے یگانہ ثابت کرنے

کیلیئے شامل کیا ہے۔

پردیسیوں کا وطن کونسا ہوتا ہے؟

ایک دوست نے ہم سے یہ پوچھا کہ جو لوگ اپنا ملک چھوڑ کر کہیں اور جا بستے ہیں انکا وطن کون سا ہوتا ہے؟ یہ سن کر ہمیں ان صاحب کا قصہ یاد آ گیا جنھوں نے دو گھر کر رکھے تھے، کسی نے ان سے پوچھا کہ دونوں میں سے آپکا گھر کونسا ہے، پہلی بیوی کا یا دوسری والی کا؟ وہ صاحب منہ بسُورتے ہوئے بولے: جی بس کیا عرض کروں، کبھی ہوتا تھا اپنا بھی گھر، مگر جناب جب سے میں نے دو گھر کئے ہیں، میرا معاملہ تو بس دھوبی کے اس کتے کی مانند ہو کر رہ گیا ہے جو نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا............!
پہلی کے یہاں جاتا ہوں تو وہ دوسری کے طعنے دیتی ہوئی کہتی ہیں: کیوں جی......!
اُس تمہاری ہوتی سوتی سے جی بھر گیا جو اب میرے پاس آ گئے ہو؟ اور جو دوسری کی طرف چلا جاؤں تو وہ اپنے، میرے اور میری پہلی بیوی کے نصیبوں کو کوستے ہوئے دہائیاں دے دے کر سارا آسمان ہی سر پر اٹھا لیتی ہے۔ دونوں میں سے کسی بھی گھر میں گھڑی بھر کو آرام میسر نہیں، میں تو اس دن کو روتا ہوں کہ جس دن دوسری شادی کی تھی..............!!!
خیر صاحب، یہ تو محض ایک جملہِ معترضہ تھا کہ جو ہم نے ازراہِ تفنن یہاں شامل کر ڈالا، وگرنہ ہمارے کہنے کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ اپنا ملک چھوڑ کر

کسی دوسرے ملک جا بسنے والے لوگوں کا حال اُن صاحب جیسا ہوتا ہے جنھوں نے دو گھر کر رکھے ہیں اور ویسے بھی جن دوست نے ہمارے سامنے یہ سوال رکھا ہے، انہوں نے یہ نہیں پوچھا کہ ایسے لوگوں کا حال کیا ہوتا ہے؟ بلکہ یہ دریافت کیا ہے کہ انکا وطن کونسا ہوتا ہے؟ حالانکہ یہ سوال اور اسکا جواب دونوں ہی سرتاپا سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے دکھائی دیتے ہے اور ممکن ہے کہ پڑھنے والوں کو ہمارے لب و لہجے سے قدرے سنجیدگی ٹپکتی بھی سنائی دے جسمیں ہم ہر ممکنہ طور پر مزاج کی چاشنی گھول کر اسکی تاثیر کو مقدور بھر ہلکا کرنے کی اپنی سی کوشش ضرور کرینگے البتہ ماحول اور حالات کا اثر تھوڑا بہت تو ہر کسی پر ہوتا ہی ہے نا، جی ہاں بالکل ایسے ہی جیسے اکثر فوتگیوں کے موقعہ پر آس پڑوس سے پرُسہ دینے کے لئے آنے والے اہلِ خانہ اور عزیز واقارب سے بھی کہیں زیادہ۔بڑھ چڑھ کر دہائیاں دے دے کر بین ڈال کر۔بڑے ہی والہانہ انداز میں آہ وزاری کر رہے ہوتے ہیں۔

بحر کیف جن صاحب نے اپنا دست ِسوال دراز کیا ہے وہ ہیں ایک شاعر، جی ہاں ! اصلی تے وڈے شاعر!!!اور آپ یہ تو بخوبی جانتے ہونگے کہ یہ شاعر حضرات کتنے گہرے ہوا کرتے ہیں اور انسانوں کا یہ طبقہ جتنا زمین سے اوپر دکھائی دیتا ہے، عموماً اس سے کہیں گنا زیارہ زیرِ زمین ہوتا ہے، تو ان انتہائی گہرے حضرت نے ہم سے اتھا گہرائیوں والا سوال کر ڈالا ہے، جی ہاں یہ وہی ہیں کہ

جن کے ایک عدد انوکھے سوال کے سبب ہمارا جلادوں کی اقسام والا مضمون معرضِ جود میں آیا تھا، ارے صاحب وہی اپنے اسد ضیاء حسن ،،بریڈ فورڈ،،برطانیہ والے۔

اسد صاحب کی شخصیت ہمارے لئے تو قصہ حاتم طائی کا شہرہ آفاق کردار منیر شامی بنکر سامنے آئی ہے کہ جسکی زبان سے نکلے محض چند سوالوں کے جواب کی تلاش کی خاطر حاتم طائی کو نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھاننا پڑ گئی تھی، خیر اب ہم حاتم طائی تو ہر گز نہیں ہیں البتہ اپنے اسد صاحب کے سوالوں پر ہر بار ہم اپنی سوچوں کے گھوڑوں کو کو بے لگام چھوڑ کرانہیں خیالات کے وسیع و عریض میدانوں میں سرپٹ دوڑنے پر مجبور کردیتے ہیں اور بیچارے سوچوں کے گھوڑے ٹابک ٹوئیاں مارتے کہیں نہ کہیں تو ضرور پہنچ ہی جاتے ہیں، لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے نہ کہ :

مرض کی کیا دوا ہے یہ کوئی بیمار کیا جانے؟

ٹھیک اسی طرح سے ہم ٹھرے مرضِ غریب الوطنی کے دائمی مریض اور وہ بھی درجہ آخر (لاسٹ اسٹیج) پر فائز کہ جسکا کوئی علاج، کوئی دوا دارو ابھی تک تو ایجاد نہیں ہو سکا بلکہ یہ معاملہ تو اب کچھ یہ نوعیت اختیار گیا ہے کہ :

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

: لیکن علامہ اقبال فرما گئے ہیں نا کہ
تیرا علاج نظر کے سواء کچھ اور نہیں

: جبکہ فیض نے کچھ یوں کہا ہے
تیرے آزار کا چارہ نہیں نشتر کے سواء
: لیکن ہمارے دل کو وہ بات بھلی لگتی ہے جو اسد محمد خان نے کہی ہے
جس پہ نہ بیتی وہ کب جانے
جگ والے آئے سمجھانے
اور ویسے بھی ہمیں نظر اور نشتر دونوں سے ہی ڈر لگتا ہے اور وہ بھی بیگم کی نظر اور انکی نظروں کے نشتروں سے لہٰذا اس بارے میں ہماری اپنی زاتی رائے قدرے مختلیف اور کچھ ایسی ہے:
ہم جیسوں کا علاج صبر کے سواء کچھ اور نہیں
اور ویسے بھی وہ جو ہمارے خاص الخاص چچا غالب کہہ گئے ہیں اور ایسے لگتا ہے کہ جیسے خاص ہمارے ہی بارے میں کہہ گئے ہوں:

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

اب بتایئے بھلا جب غالب جیسے نابغہِ روزگار امیرالشعرأ کے بغیر کوئی کام بند نہیں ہوا تو بھلا ہم جیسے بذمِ خود غریب الوطن جسے کوئی مانتا تو کیا جانتا بھی نہیں کے بغیر وطنِ عزیز میں کون سے کام بند ہیں، خود ہی دیکھ لیں رشوت، کرپشن، اقرباپروری، لوٹ کھسوٹ، قتل، اغوابرائے تاوان، ڈاکہ، چھینا جھپٹی، قبضہ مافیاَ، چوربازاری، ملاوٹ، گراں فروشی، زخیرہ اندوزی اور نہ جانے کیا کچھ بناَ کسی روک ٹوک کے نہ صرف جاری و ساری ہیں بلکہ سرکارِ وقت کے زیرِ سایہ وزیرِ نگرانی دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کررہے ہیں اور ہم جیسے غریب الوطنی کے موزی مرض میں مبتلا مریضان ہمہ وقت کسی عاشقِ نامراد کی مانند وطن سے دوری میں مرغِ بسمل کی طرح تڑپتے ہیں، اب ایسے میں بھلا کون کافریہ سوچتا ہے کہ اس مرغِ بسمل کا وطن کونسا ہے، وہ کہ جہاں اسکا وجود رہتا ہے یا وہ کہ جہاں اسکا دل اٹکا ہوا ہے۔

مرغِ بسمل پر ہمیں اُس طوطے کی کہانی یاد آ گئی کہ جسے اس کے امیر سوداگر مالک نے سونے کے پنجرے میں رکھ چھوڑا تھا اور کھانے کو دیسی گھی کی چُوری اور پینے کو دودھ اور شہد میسر تھا لیکن اس کے باوجود بھی ہر وقت اداس ہی

رہتا تھا۔ اسکا مالک جب کبھی بسلسلہِ کاروبار کہیں جاتا تو اس سے اسکی فرمائش دریافت کرتا لیکن وہ کبھی کچھ نہ کہتا۔ ایک روز جسبِ معمول سفر پر روانگی سے قبل سوداگر نے اپنے من پسند طوطے کو بتلایا کہ وہ فلاں جگہ بغرضِ کاروبار جارہا ہے اگر اسکی کوئی فرمائش ہے تو بتادے۔ طوطے نے اس سے کہا کہ میری فرمائش کسی شئے کی تو نہیں البتہ جس شہر کو آپ نے جانے کا قصد کیا ہے وہ دراصل میرا بچھڑا وطن ہے، اس شہر میں جو ایک سب سے قدیم اور گھنا درخت ہے اسپر میرے سنگی ساتھی رہتے ہیں اور کبھی ہم سب ایک ساتھ کھیلا کودا کرتے تھے، اگر ممکن ہو تو انکو جاکر میرا سلام کہہ دیجئے گا۔ سوداگر نے اپنے پیارے طوطے کی فرمائش کے عین مطابق وہاں جاکر اسکا پیغام اسکے ساتھی طوطوں تک پہنچادیا۔ سارے طوطے یہ جان کر بے حد دکھی ہوئے کہ انکا پرانا دوست قید میں ہے اور ان میں سے ایک جو کہ سوداگر کے طوطے کا بچپن کا یارِ خاص تھا یہ سنکر اسقدر رنجور ہوا کہ مارے دکھ اور صدمے کے درخت کی شاخ پر ہی اسکا دم نکل گیا اور وہ گر کر زمین پر آرہا۔ بعدازاں سوداگر نے یہ قصہ اپنے طوطے کو کہہ سنایا، جب اس نے یہ سنا کہ اسکے بچپن کا دوست اسکے غم میں ہلاک ہوگیا تو خود اس سے بھی یہ صدمہ برداشت نہ ہوسکا اور لگا پنجرے میں ماہی بے آب کی مانند پھڑکنے اور کچھ ہی دیر میں اسنے بھی تڑپ تڑپ کر اپنی جان دے دی۔ سوداگر نے جب یہ دیکھا تو وہ بہت رنجیدہ ہوا لیکن اب کیا ہوسکتا تھا، طوطا تو مرچکا تھا، اسنے پنجرے کا دروازہ کھول کر طوطے کو دفن کرنے کی نیت سے

باہر نکالا اور لے جا کر جیسے ہی صحن کی زمین پر رکھا وہ اپنے پر پھڑپھڑاتا ہوا اڑا اور وہاں پر موجود ایک درخت کی شاخ پر جا بیٹھا۔ سوداگر نے یہ منظر دیکھا تو طوطے سے کہا: میاں طوطے یہ کیا حرکت ہے، میں نے تمھیں سونے کے پنجرے میں رکھا، کھانے کو دیسی گھی کی چُوری اور پینے کو دودھ اور شہد دیئے اور تم میری عنایتوں کا یہ صلہ دے رہے ہوں۔ طوطا بولا: حضورِ والا، میرا جو ساتھی میرے وطن میں درخت کی شاخ سے گر کے مرگیا تھا وہ دراصل مرا نہ تھا بلکہ وہ اسکا میرے لئے ایک پیغام تھا، اب میں آزاد ہوں اور اپنے وطن کو جاتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ اڑا اور یہ جا اور وہ جا ....!!!

یہ تو خیر طوطا تھا، ویسے یار لوگ جب تک وطن میں ہوتے ہیں تب تک تو یہ ہی وطن کاٹ کھانے کو دوڑ رہا ہوتا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ: گھر کی مرغی دال برابر، مگر جب گھر چھوٹ جاتا ہے تو پھر اسی گھر کی دال کی محض یاد تک بھی مرغِ مسلم سے بہتر محسوس ہونے لگتی ہے، اسی طرح سے جس وطن کی آب و ہوا کل تک آلودہ و مسموم زدہ لگا کرتی تھی، جسکے میلے کچیلے گلی کوچے ہر وقت منہ چڑایا کرتے تھے اور بہاریں خزاں کی مانند محسوس ہوا کرتیں تھیں، اب وطن کے چھوٹے ہی گنگا بہن الٹا بہنا شروع کر دیتی ہے اور نہ جانے اس مریضِ غریب الوطنی کی آنکھوں کو کونسا جادوئی چشمہ لگ جاتا ہے جو اب اسکو سوکھی ڈالیاں بھی ہری ہری دکھائی دینے لگتیں ہیں، وہی آب و ہوا جسپر وہ ہمیشہ اپنی الرجی

کا الزام لگایا کرتا تھا، اب باغِ جنت کی پرُفضاء و صحت بخش ہوا میں بدل گئی ہیں، وہ گلیاں کہ جن سے گزرتے ہوئے وہ اپنی ناک کو دو انگلیوں میں داب لیا کرتا تھا اب !!!..........اسے اپنی بانہیں پھیلائے اسکی منتظر نظر آتیں ہیں اور نہ جانے کیا کچھ

بحرحال ابھی تک بھائی اسد کا سوال کہ کسی غریب الوطن انسان کا اصل وطن کونسا ہوتا ہے، جواب طلب ہی ہے مگر ہمارے خیال میں سوال یہ نہیں کہ اسکا وطن کونسا ہے بلکہ اصل سوال تو ہمارے خیال میں یہ ہے کہ آخر وہ خود کس وطن کا ہے؟ وطنِ اول کا یا کہ وطنِ ثانی کا؟

ہمارے بچپن میں گلی محلوں میں چوکیداری کرنے والے خان صاحب عیدین سے قبل محلے بھرکے دروازے کھٹکھٹا کر ایک بڑا ہی مخصوص سوال کیا کرتے تھے جو کہ یقیناً ہماری طرح سے آپ سب کو بھی یاد ہوگا اور اگر نہیں تو ہم یاد دلائے دیتے ہیں: ساب ام اپنے کو وطن جاتی ہے، امارا بخشیش لاؤ (صاحب میں اپنے وطن کو جاتا ہوں، لائیں میری بخشیش دیں)

یہ بات سن کر ہم ہمیشہ سوچا کرتے تھے کہ ہمارے ماسٹر صاحب تو کہا کرتے ہیں کہ پاکستان ہمارا وطن ہے تو یہ کس وطن کو جانے کی بات کرتا ہے اور کراچی

پاکستان کی جان اور دل ہے تو کیا یہ اسکا وطن نہیں ؟

آج عمرِ عزیز کی کم وبیش دس بہاریں دیارِ غیر میں بتانے کے بعد اب ان خان صاحب کے اس خُفیہ وطن کی حقیقت ہمارے سامنے آشکار ہوئی ہے۔ آپ نے سُنا تو ہوگا کہ :

دلہن وہی جو پیا من بھائے تو جناب وطن وہی جو اپنے من کو بھائے

زرا غور تو کیجئے ! ان خان صاحب کو اپنا دورافتادہ گاؤں، جہاں ہمارے شہر کراچی کی طرح سے نہ تو بجلی تھی اور نہ ہی دیگر جدید شہری سہولیات، پھر بھی اپنا وطن لگتا تھا اور کراچی جیسا شہر پردیس۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!!

شاید وطن سہولتوں کے مجموعوں کا عنوان نہیں ہوا کرتا بلکہ ایک انسان کے ہوش سنبھالنے کے بعد نظر آنے والے ان درودیوار اور ان درودیوار کے ساتھ وابستہ سالہاسال کی جذباتی وابستگی کا نام ہوا کرتا ہے۔

اکثر لوگ ہم سے پوچھتے ہیں کہ اب پاکستان میں آپکے کون کون ہے؟ اور ہمارا مختصر سا جواب یہ ہوا کرتا ہے کہ :

چند دوست اور بیشمار یادیں۔۔۔۔۔۔۔۔!!!

علاوہ ازیں ایک بات جو ہم اپنی کم وبیش ایک عشرہ ہر محیط غریب الوطنی کے آنکھوں دیکھے تجربے کی بنیاد پر کہہ رہے ہیں کہ اس عرصے کے دوران ہم نے ایسے ایسے تارکینِ وطن کو دیکھا ہے کہ جو وطن کو اور خود وطن ان کو ترک کرکے بے حد شادماں ہیں۔شاید آپ میں سے بہت سے پڑھنے والوں کو ہماری اس بات کا یقین نہ آئے کہ ہم ایسے پاکستانیوں کو بھی جانتے ہیں (جسپر ہمیں شدید افسوس ہے اور ہمیشہ رہیگا) جو کہ اپنا تعارف بطور پاکستانی کروانا باعثِ ندامت محسوس کرتے ہیں اور ان میں سے چند ایک تو اپنے آپ کو بڑی ہی ڈھٹائی کے ساتھ اپنے امریکی جاننے والوں میں انڈین کہہ کر متعارف کرواتے ہیں۔ ویسے ہم نے لوگوں کو اپنی ذاتیں بدلتے تو ضرور دیکھا تھا اب اپنی مادرِ وطن کو چھپاتے اور بدلتے ہوئے بھی دیکھ لیا۔ لیکن صاحب یہ دیارِ غیر چیز ہی ایسی ہے کہ جہاں پہنچ کر لوگ باگ اپنے خون کے رشتوں کو بھول بھال جاتے ہیں تو ان جذباتی رشتوں کی بھلا وقعت ہی کیا ہے، غالبا یہ ہی وہ لوگ ہیں کہ جن کو مخاطب کرکے علامہ نے یہ کہا تھا:

تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

یا پھر اس قبیل کے لوگوں کا وطیرہ ہی یہ ہوتا ہے بقول ناصر کاظمی:

نیتِ شوق بھر نہ جائے کہیں

تو بھی دل سے اتر نہ جائے کہیں

اگر کسی طور ہمارے حکمرانوں کے ہتھے الہ دین کا کوئی چراغ لگ جائے تو بلاشک و شبہ وہ ہی کام کرینگے جو اس بدنصیب شکاری نے کیا تھا جسے سونے کا انڈہ دینے والی مرغی مل گئی اور اس نے سونے کے تمام انڈے ایک ساتھ حاصل کرنے کی لالچ میں اسے زبح کردیا اور نہ تو کوئی سونے کا انڈہ ہی حاصل کرسکا اور مرغی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا اور اس بات کا اندازہ ان کے طرزِ حکمرانی سے بخوبی لگایا جاسکتا کے جن کے زیرِ سایہ ہماری عوام کا یہ حال ہوگیا کہ:

چینی چینی کردی ،آپے چینی ہوئی

واضح ہو کہ یہاں مراد کھانے والی چینی سے ہے، چینی قومیت یا شہریت سے ہرگز نہیں، ہاں البتہ ہمارے مظلوم عوام کو چینی کی مالا جپتے جپتے مکمل نہ سہی تو کم از کم عارضی ہی سہی، چینی شہریت ہی حاصل ہو جائے تو ان کے دکھوں کا کسی حد تک مداوا ہی ہو جایئگا اور جب موجودہ حکمرانوں اپنی لوٹ کھسوٹ سے فارغ ہو جائیں تو، ویسے اب انھوں نے کیا فارغ ہونا ہے، غالباً انہیں تو فارغ ہی کیا جائے گا لہٰذا ان کی فراغت (اللہ ہماری زبان اور آپکے کان مبارک کرے) کے بعد بیشک عوام سے عارضی چینی شہریت واپس لیکر انہیں مستقل کھانے والی چینی دیدیجائے تاوقتیکہ انہیں مستقل شوگر کا عارضہ لاحق نہ ہو

جائے (اللہ نہ کرے) لیکن اگر ان حکمرانوں کی عقلیں کام کرنا بند کردیں اور وہ اس الہ دین کے چراغ کو ملک و قوم کی ترقی کے لیئے استعمال کرکے پاکستان کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی سے ہمکنار کروادیں (کم از کم اپنے ہوش و ہواس میں تو یہ ایسا ہرگز نہ کریں گے، کیونکہ آپ نے سنا ہی ہوگا کہ: چھٹتی نہیں یہ کافر منّہ کو لگی ہوئی، کیا ردیافت کیا آپ نے؟ کیا منّہ سے لگی ہوئی؟ ارے بھئی حرام کی کمائی اور کیا؟) تو پاکستانیوں کا وہ طبقہ جو پاکستانی کہلواتے ہوئے شرمندگی محسوس کرتا ہے وہ سب سے پہلے یہ قومی گیت گاتا عازمِ وطن ہوگا:

میں بھی پاکستان ہوں، تو بھی پاکستان ہے

قصہ المختصر، ہم سب نے اپنی اپنی زندگیوں کے کسی نہ کسی مقام و موڑ پر یہ باتیں ضرور سنیں ہوئیں ہیں مثلاً:

ہم وطن سے ہیں، وطن ہم سے نہیں

یہ نہ پوچھو کہ وطن نے تم کو کیا دیا؟، یہ سوچو کہ تم نے وطن کو کیا دیا؟

مگر اب فی الحال ان موضوعات پر گفت و شنید کے موڈ میں ہرگز نہیں اور ویسے بھی اس وقت جیسا کہ ہم نے ابتدا ہی میں عرض کردیا تھا کہ شاید ہم اپنا دامن

سنجیدگی بلکہ سچ پوچھیئے تو رنجیدگی سے کسی طور پر چھڑانے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے اور من و عن ویسا ہی ہوا اور اب ان اختتامی لمحات میں نہ جانے کہاں سے رہ رہ کر ہمیں فیض کی یہ نظم بے اختیار یاد آ رہی ہے حالانکہ ہمارا ارادہ سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد جیسی دعائیہ کلمات سے اختتام کرنے کا تھا:

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے
ہے اہل دل کے لیے اب یہ نظمِ بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد
بہت ہے ظلم کہ دستِ بہانہ جو کے لیے
جو چند اہل جنوں تیرے نام لیوا ہیں بنے ہیں اہلِ ہوس،
مدعی بھی منصف بھی کسے وکیل کریں،
کس سے منصفی چاہیں مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح شام کرتے ہیں
بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی

چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہو گی
غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں
یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ اُن کی رسم نئی ہے، نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ اُن کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل بُرا نہیں کرتے
گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اَوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

عید اشتہارات ۔ بقر عید ۔ اسپیشل

کہتے ہیں کہ زندگی میں بہت سی چیزیں ایسی ہوتیں ہیں جو بھلائے نہیں بھولتیں، ان میں سے سرفہرست بچپن اور بچپن کی عیدیں۔ جی ہاں بھلا وہ کون ہوگا کہ جسے اپنا بچپن اور اس بچپن کی عیدیں نہ یاد ہوں۔ صاحب ہمیں تو یہ دونوں ہی بخوبی نہ صرف یاد ہیں بلکہ اپنے بچپن کی عیدوں کے ساتھ منسلک بہت سی باتین اور یادیں آج بھی زہین کے نہاں گوشوں میں روزِ اول ہی کی طرح سے روشن ہیں

ان عیدین کی دیگر باتوں میں سے ایک بات جو ہمیں آج بھی مسکرانے پر مجبور کردیتی ہے وہ ہے عید کے تین دنوں میں ٹی وی پر چلنے والے صُوتی اشتہارات ۔ جی ہاں صُوتی اس لیئے ہم نے کہا کہ چلتے تو یہ اشتہار ٹی وی پر ہی تھے لیکن اسکرین پر عموماً انتہائی چھوٹے پیانے کے کاروباری مشتہرین کی ساکت تصاویر کے پس منظر میں انکا تجارتی پیغام پڑھ کر سنادیا جاتا تھا۔ ہاں البتہ پیغام سے قبل کچھ اس طرح سے بگل بجایا جاتا تھا کہ مانوں جیسے کسی لشکرِجرار کی جانب سے اعلانِ جنگ کیا جارہا ہو، شاید انکا ارادہ سوئے ہوئے ناظرین وسامعین کو بیدار کرنے کا رہا کرتا ہوگا۔

بحر حال ارادہ انکا جو بھی ہو لیکن وہ اشتہارات خوُب ہوا کرتے تھے۔ دراصل وہ اشتہار اشتہار کم اور کمپنی کی مشہوری اور کمپنی کی مشہوری سے بھی بڑھ کر ان کے اکلوتے مالکان یعنی کہ سول پروپرائیڑوں (جیسکہ خود ان اشتہارات میں پرُزور انداز میں بتایا بلکہ جتلایا جاتا تھا) کی مشہوری کی اسکیم زیادہ معلوم ہوتے تھے، اب بھلے ہی سے وہ مشہوری ان کے گلی محلے سے آگے نہ بڑھ سکے لیکن ان اشتہارات کے چلنے کے بعد کم از کم گلی محلے کے لونڈے لپاڑے بھی انہیں دور سے نہ سہی اگر ایک آدھ گز کے فاصلے سے ہی پہچان لیں تب بھی یہ سودا کچھ خاص مہنگا نہ تھا اور اگلی عید تک وہ اپنی اسی سرشاری کیفیت کا مزہ لوٹتے رہتے، بالکل ویسے ہی جیسے اگر گلی کے کسی میلے کچیلے موالی لڑکے کو کوئی حسینہ محض غلطی سے مسکرا کر دیکھ لے اور وہ محلے بھر میں اپنی چھاتی چوڑی کیئے پھرتا رہے۔ ویسے ان اشتہارات کے پیغامات بھی بڑے ہی نرالے ہوا کرتے تھے مثلاً:

کالی پیلی چائے بنانے والے میاں عبدالقدوس کی جانب سے اھلیانِ وطن کو عید کی خوشیاں مبارک ہوں، ہماری چائے کا ایک کپ ہی آپکے لئے کافی ہے (اب پتہ نہیں کہ اس سے انکی مراد کہیں ہمیشہ ہمیشہ کیلیئے تو نہیں تھی؟)

ململ لان بنانے والے حضور بخش شکارپوری کی طرف سے قوم کی تمام ماں، بہن

اور بیٹوں کو عید کی دلی مبارکباد (چونکہ مرد حضرات ان کے خریداروں میں شامل نہیں لہٰذا مبارکبادی میں بھی انہیں شامل کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کیجاتی تھی) ململ لان بنانے والوں کا پیغام ہے کہ اس عید خریدئے اور اگلی عید تک پہنئیے۔

نیستی چھالیہ، چھی چھی سونف سپاری اور تھو تھو پان مصالحہ بنانے والے بابو بھائی پنواڑی کیجانب سے قوم کو عید کی بھرپور خوشیاں مبارک ہوں: انکا پیغام ہے کہ جو ایک بار ہماری نیستی چھالیہ، چھی چھی سونف سپاری اور تھو تھو پان مصالحہ کھائے وہ پھر زندگی بھر اور کچھ نہ کھائے۔ (جی ہاں، کیوں نہیں، یہ سب کچھ کھا کر منہ اور حلق کے جان لیوا امراض سے بچ پائے گا تو کچھ کھائے گا نا؟)

علاقہِ لالو کھیت کی خود ساختہ محلاتی پنچایت کمیٹی کے صدر، چیرمین، جنرل سیکریٹری کی جانب سے سارے محلے دارن کو عید مبارک ہو، منجانب پروپیگنڈا سیکریٹری: مسئلہ گھریلو ہو کہ محلہ داری کا، الجھے سے الجھے مسائل کو سلجھانا ہماری کمیٹی کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ (اور وہ جو آپکا دایاں ہاتھ پہلے ہی ان تمام مسائل کو مذید الجھانے میں مصروف ہوتا ہے، اسکا کیا؟)

تیری بیڑی، میری بیڑی، سب کی بیڑی، بابو بیڑی بنانے والے دادا بیڑی (غور سے نہ سننے پر دادا بیڑی، داداگیری سنائی دیتا تھا) منیو فیکچرنگ کمپنی (پرائیوٹ) لمٹیڈ کی جانب سے تمام بیڑی نوشوں اور فروشوں تک عید کی دھواں دھار مبارک باد پہنچے، انکا پیغام ہے: لگے دم، مٹے غم! (بالکل درست فرمایا، دم ہوگا تو غم ہوگا نا؟) ویسے تو انکا پیغام خاص الخاص نوجوانانِ ملت کیلئے ہے، البتہ دیگر درمیانی، ادھیڑ عمر، پکی عمر، گئی گزری عمر اور آخری عمر کے لوگ بھی کان دھرلیں تو افاقہ ہونے کی قوی امید ہے۔

بھینس سوپ بنانے والے (واضح رہے کہ یہ بھینس سوپ ہے، بھینس سُوپ نہیں) ناگوری برادران کی جانب میلی کچیلی قوم کو دُھلی دھلائی اور صاف ستھری عید مبارک قبول ہو۔ داغ چاہے خود بھینس سے بھی زیادہ کالے کیوں نہ ہوں، بھینس سوپ کا ایک ہی وار کافی ہے، البتہ دل اور کردار پر لگی سیاہی کی ذمہ داری ہرگز ہماری نہ ہوگی، انکی صفائی کا بندوبست خود آپکی اپنی اور ذاتی ذمہ داری ہے۔

دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ڈیری فارمز کی جانب سے پوری قوم کو عید کی خوشیاں مبارک ہو۔ ہمارے یہاں خالص بھینسوں (تو مطلب یہ ہے کہ دودھ خالص ہو کہ نہ ہو البتہ بھینسیں ضرور خالص ہیں) کا تازہ دودھ دستیاب ہے، ایک کلو

دودھ کی خریداری پر دودھ اور پانی آدھا کلو کی علحیدہ علحیدہ تھیلیوں میں دیا جاتا ہے، اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ وہ پانی دودھ میں ملادیں، خود پی لیں یا اس سے اپنا منہ دھولیں۔

بحر حال یہ تو اس وقت کی بات ہے کہ جب آتش جواں تھا اور اب تو ویسے بھی پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہے، ویسے ایک دور تھا کہ جب پلوں کے نیچے نا تو پانی اور نہ ہی کیچڑ ہوا کرتا تھا اور اب تو سیلاب کے بعد اوپر پل رہا ہو کہ نہ رہا ہو، نیچے پانی البتہ خوب ہے اور اس سے پہلے کہ سیلاب زدگان کے آنسو ہمیں اور آپ کو پانی پانی کرجائیں، موجودہ حکمرانوں کی طرح سے فوری طور پر اصل موضوع کی جانب آجایئے، اوہ نہیں سمجھے، بھئی جسطرح ہمارے حکمرانِ اعلیٰ بیرونِ ملک گھومنے بھی جائیں تو اپنا اصل ایجنڈا امداد کھپے، کھپے، کھپے کبھی نہیں بھولتے۔ ویسے آپس کی بات ہے کہ یہ کھپے، کھپے بھی خوب ذُومعنی چیز ہے، سندھی میں کھپے کہتے ہیں چاہیے کو جبکہ اردو میں وہ جو کہتے ہیں نا کہ بے چارہ کب کا مر کھپ چکا۔۔۔۔۔۔۔۔!

اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ہمارے حکمرانِ اعلیٰ پاکستان کھپے، کھپے، کھپے کا جو یہ نعرہ بلند کرتے ہیں تو آیا یہ پاکستان کی بلاشرکتِ غیرے ملکیت چاہتے ہیں یا پاکستان کو بددعائیں دیتے ہیں۔ ویسے دونوں ہی صورتوں میں

نقصان پاکستان کا ہی ہے۔ محض کچھ کہنا تو عالموں کی نظر میں تھیوریٹیکل بات ہوتی ہے، خیر یہ تو عالموں کی عالمانہ باتیں ہیں اور وہ موصوف تو اُن ظالموں میں سے ہیں جو نہ صرف کہتے ہیں بلکہ جو کہتے ہیں وہ کرکے بھی دکھاتے ہیں، تو اس وقت وہ اپنا تن من دھن لگا کر (معاف کیجئے گا تن من تو شاید انکا ہی ہو البتہ اسمیں کوئی شک نہیں کہ دھن ملک و قوم کا ہی ہے اور جسے وہ خود اور انکے ہم پیالہ و نوالہ مال مفت دلِ بے رحم کے مصداق بٹور رہے ہیں) اپنے کہے کو پورا کرنے میں سرگرمِ عمل ہیں۔

دیکھئے وہی ہوا نا جو ہم نے کہا تھا، بھٹک گئے نا اصل موضوع سے، تو اس لحاظ سے تو یہ ہمارے حکمران ہی اچھے ٹھرے نا کہ جو بھی کرتے ہیں اچھا یا برا، مکمل دل جمعی اور عظمِ مصمم کے ساتھ تو کرتے ہیں۔ جبھی تو اللہ نے ہمیں حکمرانیت سے دور دکھا ہوا ہے کہ جو اگر کہیں غلطی سے بن بھی جاتے تو ان کی طرح سے سرے محل تو کیا سرے سے ایک معمولی سا چھوٹا گھر تک نہ بنا سکتے شاید اسی لیئے کہا جاتا ہے کہ جسکا کام اسی کو ساجھے۔

بحرحال یہ تو تھے نمونے ہمارے بچپن کی عیدوں میں چلنے والے چند چیدہ چیدہ اشتہارات کے، لیکن اب جبکہ زمانہ قیامت کی چال چل گیا ہے تو پھر یقیناً مذکورہ اشتہارات بھی زمانے کی رفتار کا ساتھ دیتے دیتے قیامت خیزی کا

شہاکار بن چکے ہونگے۔ ویسے تو یہاں امریکا میں رہتے ہوئے الحمد اللہ ہمیں آٹھ دس پاکستانی چینلز دستیاب ہیں لیکن ان میں اشتہارات امریکا میں مقیم پاکستانی و ھندوستانی کمیونیٹی کے مقامی کاروباروں ہی کے چلتے ہیں اور انہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے ماشاً اللہ ہم دیسیوں کو سوا ہوٹلوں میں کھابے اور بوفے اڑانے ، شادی ہالوں میں شادیاں کرنے اور کروانے، اندرون و بیرون ملک فضائی سفر کرنے و کروانے، گھر خریدنے و بکوانے اور مسجدوں ، دنیا بھر اور چراغ تلے اندھیرا کے مصداق خود امریکا بھر، جی ہاں ہم نے درست لکھا اور آپ نے بالکل درست پڑھا ہے کہ امریکا کے آفت ومصیبت زدہ مسلمانوں کیلیئے چندہ جمع کرنے و کروانے کے علاوہ کوئی دوسرا کام ہی نہیں اور راوی ہم سب دیسیوں کے نصیبوں میں فقط چین ہی چین لکھتا ہے۔

لہٰذا اب ان اشتہارات سے براہ راست شناسائی نا ہونے کے باوجود بھی ہم اپنی چشمِ تصور میں ان عیدیئی اشتہارات کو چلتے پھرتے دیکھتے ہیں لیکن اب زمانے کے ساتھ ساتھ ان کے انداز واطوار بھی خاصے بدل چکے ہیں، بھئی آخر انہیں بھی تو ضروریات اور تقاضہِ زمانہ کا ساتھ تو دینا ہی تھا نا، تو وہ بھی آج کے اس نفسا نفسی کے دور کے رنگ میں رنگ گئے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو؟ جناب یہ مقابلہ بازی، اکھاڑ پچھاڑ ، مار ڈھاڑ، گھراؤ جلاؤ اور مارو یا مرجاؤ کا زمانہ ہے تو صاف ظاہر ہے کہ ایسے کلُجگ کے دور میں بننے والے اشتہارات بھی تو

اسی زمانے کی وحشت خیزی کا پرتو لیئے ہوئے ہونگے کے نہیں؟

اب ہم اپنے ذہن میں پنپتے نئے دور کے ان اشتہارات کا مختصراً جائزہ لینگے:

کھوپڑی مارکہ تابوت بنانے والے ملک الموت اینڈ کمپنی کی جانب سے تمام جینے مرنیوالوں اور زندہ درگوروں کو عید مبارک۔ جملہ اقسام کے مردوں کیلئے ہمارے مضبوط اور پائیدار تابوت حاصل کریں، ملک بھر میں ہونے والے انگنت دہشت گردی کے واقعات اور روز افزوں بڑھتی ہوئی اموات اور طلب و رسد میں انتہائی تیزی کے ساتھ بڑھتے ہوئے تفاوت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہماری عوام الناس سے اپیل ہے کہ وہ اپنی پہلی فرصت میں اپنے سائز کے تابوتوں کی پیشگی بکنگ کروالیں۔ پھر نہ کہیے گا کہ ہمیں خبر نہ ہوئی لیکن یہ کہنے کے آپ قابل ہی کہا ہونگے، لہٰذا اپنے پسماندگان کو پریشانیوں سے بچانے کا نادر موقعہ، اپنے دو دوستوں یا جاننے والوں کو لا کر انکی بکنگ کروانے والوں کا اپنا تابوت بالکل مفت۔ یہ سنہری موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ ورنہ آپ کے پسماندگان محض ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔ بکنگ پہلے آیئے اور پہلے پایئے کی بنیاد پر شہر بھر کے قبرستانوں میں جاری ہے۔

زحمت سویٹس (مٹھائیاں) بنانے والے زحمت فوڈز انڈ سٹریز کی جانب سے اس عید کے

پرُمسرت موقعہ پر ساری قوم کو عید کی مبارک بار کے ساتھ ایک انتہائی شاندار اعلان: ملک بھر میں جاری چینی کے عظیم بحران کو مدِ نظر رکھتے ہوئے زحمت فوڈز انڈ سڑیز کے سائنسدانوں نے اس عید کے پر مسرت موقعہ پر عوام کی خوشیوں کو دو بالا بلکہ ہفت بالا کرنے کیلیئے خالص پہاڑی نمک سے تیار کردہ ایسی مٹھائیاں ایجاد کیں ہیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے یعنی کہ آپ کو عید پر کھانے کو انتہائی ارزاں قیمتوں پر مٹھائیاں بھی میسرآ جائیں اور ہم نے ان منافع خوروں کی ناجائز منافع خوری سے ملک و قوم کو بال بال بچالیا ہے اور سب سے بڑھکر یہ مٹھائیاں شوگر کے مریضوں کیلیئے بالکل محفوظ و مناسب ہیں۔ خود بھی کھائیں اور اپنے گھر والوں اور عزیز واقارب کو بھی کھلائیں، ہائی بلڈ پریشر اور دل کے مریضوں کی پہنچ سے دور رکھیں۔

انجمن وکلاًبرائے طلبگارانِ طلاق کی جانب سے ان تمام خواتین و حضرات کو جو کہ اپنے شوہر یا بیوی سے فوری طلاق چاہتے ہیں کو ہم عید کی مبارک باد پیش کرنے کے ساتھ اپنی اعلیٰ پیشہ ورانہ خدمات حاصل کرنے کی سرِعام کھلم کھلا دعوت دیتے ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ صرف دو سے تین پیشیوں میں آپکی آزادی کا پروانہ آپکے ہاتھوں میں ہوگا۔ ۔ عدالت کی جانب سے دادرسی نہ ہونے کی صورت میں ہمارے نامی گرامی غنڈے، معاف کیجئے گا معزز وکلاً صاحبان خود ڈرا دھمکا کر حتیٰ کہ مار پیٹ سے کام لیکر بھی مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں اپنا ثانی

نہیں رکھتے۔ یقین نہ آنے کی صورت میں حالیہ عدلیہ بحالی تحریک میں وکلاٗ حضرات کے جلالی و جلادی کردار کا کماحقہ جائزہ لیکر بھرپور سبق حاصل کیا جاسکتا ہے۔ پہلی بار طلاق کے لئے آنے والوں کی اگلی طلاق بالکل مفت بشرطیکہ دوسری طلاق کا جراتمندانہ فیصلہ، پہلی طلاق کی اولین سالگرہ سے قبل ہی ہمارے صدر رفتر میں ذاتی طور پر تشریف لاکر مبلغ ایک ہزار روپے کی معمولی سی (ارادہ ڈاواں ڈول ہونے یا یکسر بدلنے کہ صورت میں) ناقابلِ واپسی فیس ادا کرکے رجسٹرڈ کروالیا گیا ہو۔ ماضی کے بیشمار تلخ تجربات کی وجہ سے فیس کی وصولی صرف اور صرف کیش کی صورت میں کی جائیگی، چیک کسی صورت میں قابلِ قبول نہ ہوگا کیونکہ جو خاوند اپنی بیوی کا اور جو بیوی اپنے خاوند کی وفادار نہ ہو سکی بھلا وہ ہم سے وفا کے خوگر کیسے ہو سکتے ہیں۔ بقول غالب:

ہم کو ہے ان سے وفا کی امید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے۔

نقیب بنک ان لمیٹڈ ملک بھر کے سرمایہ داروں، جاگیرداروں، سیاستدانوں، سرکاری ٹھکیداران، بیوروکریٹوں، منافع خوری، چور بازاری، بھتہ خوری، اغواکاری اور دوسروں کی املاک پر اپنا قبضہ جاری رکھنے والوں کو عید کی دل کھول کر مبارک باد دیتا ہے (کہ اصل عید تو انکی ہی ہوتی ہے) اور ان سب کیلئے اپنے نئے سلیمانی کھاتے کے اجرا کا اعلان کرتی ہے جسمیں یہ اور ان

جیسے تمام معزز افراد اپنا وہ سارا کا سارا سرمایہ (عرف کالا دھن) رکھ کر چین کر بانسری بجا سکتے ہیں جو انہوں نے ملک وملت پر نقب لگا کر حاصل کیا ہو اور جس کی وجہ سے ان کی راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام ہو کر رہ گیا ہو اور اس کھاتے میں پڑی تمام رقوم انتظامیہ اور محکمہ انکم ٹیکس کی نظروں سے بالکل ایسے اوجھل ہو جاتی ہے جیسے گدھے کے سر پر سینگھ۔ علاوہ ازیں معمولی فیس کی ادائیگی کرکے پیسہ یہاں جمع کروائیں اور سوئزرلینڈ سمیت دنیا بھر کے کسی بھی بنک سے کسی بھی کرنسی میں وصول کر سکتے ہیں۔

قوم کے حاکمین کی جانب سے اپنے محکومین کو عید کی دلی مبارک باد: امید ہے کہ ملک بھر میں عوام مسائل کی اسقدر بھرمار کے بعد اپنے حکمرانوں کے عظیم اقدامات کے سبب حاصل ہونے والے اس عیدِ سعید کے موقعہ کو خوب انجوائے کر رہے ہونگے اور آنے والے مذید سخت ترین وقت کی بے پناہ سختیوں کیلئے خود کو اسرنو تیار کر رہے ہونگے اور اپنے حکمرانوں کی عوامی پالیسیوں، عوام دوست ٹیکس، سیلاب ٹیکس، آنسو ٹیکس، آہ ٹیکس، سانس ٹیکس، کھانسی ٹیکس، شادی ٹیکس، بچہ ٹیکس، تعلیم ٹیکس، بیماری ٹیکس اور مرگ ٹیکس کے اجراپر اور تیل، گیس، بجلی، چینی اور آٹا وغیرہ کی کمیابی و نایابی اور گرانی کے سبب ہنستے کھیلتے اور یہ کہتے اپنی جان ان پر نچھاور کرتا چلے جائینگے کہ:
چڑھ جا بیٹا سولی پر رام بھلی کریگا۔

تو دوستوں یہ تو تھا اک بہانہ مل بیٹھ کر کر چند دکھ سکھ کی باتیں کرنے کا، اپنے اور آپ کے دل پر پڑے کسی نامعلوم بوجھ کو ہلکا کرنے کا۔ اور آپ سب اپنے اپنے دلوں پر ہاتھ دھر کر کہئے کہ ہوا نا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کچھ تو دل کا جوجھ

!!!ہلکا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

آخر میں آپ سب کو ہماری جانب سے دلی عید مبارک۔

احمد انکل کے بچوں کا کیا ہوا؟

اس کثیر منزلہ رہائشی عمارت کے مرکزی دروازے سے باہر آتے ہی وہ پانچ چھے سالہ بچہ اپنا سر اٹھا کر عمارت کی بالائی منزل کی طرف دیکھنے لگا اور اس کی توقع کے عین مطابق اس عمارت کی آخری منزل پر موجود گھر کی بالکنی سے چار بچے، جن میں تین لڑکے اور ایک لڑکی شامل تھی، نیچے گلی کی جانب جھانک رہے تھے۔ اُس کی آنکھیں اُن بچوں کی آنکھوں سے چار ہوئیں۔ حالانکہ انکے درمیان فاصلہ کافی تھا لیکن پھر بھی وہ بچہ ، اوپر بالکنی سے جھانکتے بچوں کی آنکھوں سے ٹپکتی ویرانی، یاسیت اور اداسی کی تاب نہ لا سکا اور اس نے نظریں ان سے چراتے ہوئے اپنا سر جھکا لیا اور زرا تیز چلتا ہوا اپنے ابو کے نزدیک جا پہنچا جو اپنی سرخ رنگ کی ہنڈا ففٹی موٹر سائیکل کو پے درپے ککیں مار کر اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور پھر تھوڑی سی کوشش کے بعد موٹر سائیکل کا انجن پھٹ پھٹ پھٹ پھٹ پھٹ کرتا جاگ پڑا۔ بچہ فوراً ہی موٹر سائیکل کے ہینڈل اور سیٹ کے درمیان لگی سرخ رنگ والی ٹوکری میں جا بیٹھا جبکہ اسکے ابو کے پیچھے اسکی امی، جنھوں نے اپنی گود میں اسکے چھوٹے بھائی کو لیا ہوا تھا، سوار ہوگئیں اور اسکے ساتھ ہی موٹر سائیکل چل پڑی۔

سارے راستے اس بچے کی نگاہوں میں عمارت سے جھانکتے بچوں کے اداس چہرے گھومتے رہے اور وہ بالکل خاموشی کے ساتھ چلتی ہوئی موٹر سائیکل کی ٹوکری میں بیٹھا بظاہر ارد گرد دوسری گاڑیوں کو تیزی کے ساتھ گزرتے ہوئے دیکھ رہا تھا لیکن اسکی آنکھیں تو بس محض خلاؤں میں گھور رہی تھیں اور اسکے دل و دماغ پر تو جیسے ان بچوں کی نگاہوں میں بسی ہوئی ویرانی اور ٹپکتی ہوئی یاسیت ہی چھائی ہوئی تھی اور ذہن میں رہ رہ کر ایک ہی سوال ابھرتا تھا کہ:

"اب احمد انکل کے بچوں کا کیا ہوگا؟ اب کون ان کے اسکول کی فیس ادا کریگا؟، کون انکو کتابیں، یونیفارم، کپڑے اور جیب خرچ دیا کریگا؟

اسکا ننھا سا ذہن ان تمام سوالات کے جوابات دینے سے قطعاً قاصر تھا اور جیسے جیسے یہ سوالات یکے بعد دیگرے اس کے ذہن میں آتے چلے جا رہے تھے ویسے ویسے اس کے دل پر ایک عجیب سی اداسی چھاتی چلی جا رہی تھی اور ایک ہلکے سے نامعلوم خوف کے سبب اسکا ننھا سا دل قدرے تیز تیز دھڑکنا شروع ہوگیا تھا۔ اس نے سر گھما کر اپنے ابو کی طرف دیکھا جو کے اس کی اندرونی کیفیات سے یکسر بے خبر، مکمل یکسوئی کے ساتھ سڑک کی جانب دیکھتے ہوئے، موٹر سائیکل چلانے میں مصروف تھے۔ ابو کا چہرہ دیکھ کر نہ جانے کیوں اس نے خود کو بے حد پر سکون سا محسوس کیا اور اپنی پیٹھ اور سر کو ابو سے مس کر دیا اور ایسا

کرکے اسے ایسا محسوس ہوا کے جیسے اب وہ بالکل محفوظ ہے۔

گھر پہنچ کر بھی وہ بس خاموش سا ایک کونے میں جا بیٹھا اور مسلسل ان بچوں کے مطالق ہی سوچتا رہا۔ اس روز گھر کا سارا ماحول بھی کچھ سوگوار سا ہو رہا تھا۔ ابو اور امی کے چہروں تک سے اداسی جھلک رہی تھی۔

کچھ دیر بعد اسکے ابو ایک تصویروں سے بھرا البم کھول کر بیٹھ گئے اور ایک کے بعد ایک صفحے کو پلٹتے جاتے اور اسمیں لگیں تصاویر دیکھتے ہوئے ان سے مطالق تفصیل اسکی امی کو بتاتے جاتے۔ پھر ایک مقام پر آ کر تو انکا لہجہ بے حد قدرے جذباتی اور آواز بھاری سی ہو گئی:

ارے دیکھنا ذرا یہ احمد کی شادی کے موقعہ کی تصویر ہے، جسمیں احمد کا شہ بالا میں بنا" تھا۔ "

وہ بچہ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے ابو کے پاس جا بیٹھا اور خود بھی ان تصاویر کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ ایک تصویر میں احمد انکل دلہا بنے ہوئے تھے اور انکا نکاح پڑھایا جا رہا تھا اور انکے بالکل ساتھ میں اسکے ابو بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اگلی تصویر میں احمد انکل نکاح نامے پر دستخط کر رہے

تھے اور برابر بیٹھے اسکے ابو انہیں دستخط کرتا دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔
تمھیں یاد ہے نا کے ہم ان دنوں عیدگاہ میدان کے علاقے میں سول ہسپتال کے عقب "
"میں موجود راجہ منیشن میں رہا کرتے تھے۔
ابو نے امی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
ہاں بس احمد بھائی کو اللہ نے بہت جلد ہی اپنے پاس بلالیا، حالانکہ ان کی تو شادی بھی "
ہمارے بعد ہوئی تھی۔" امی نے انتہائی تاسف زدہ لہجہ میں ابو کو جواب دیتے ہوئے
کہا۔ "اور آج جب ہم انکے گھر گئے تھے تو مجھ سے تو انکی بیوی اور بچوں کی اداس
"صورتیں دیکھیں نہیں جارہی تھں
پھر اسکے ابو نے البم کا صفحہ پلٹ دیا۔ اب اس صفحے میں لگیں تصاویر میں اسکے ابو امی ااور احمد انکل اور انکی بیگم سب ایک بڑی لانچ میں سوار ہیں اور لانچ سمندر کا سینہ چیرتی چلی جارہی ہے، سب کے چہروں سے مسکراہٹیں اور خوشیاں جھلک رہیں ہیں۔ وہ سب ایک دوسرے کو ہنستے مسکراتے ہوئے دیکھ رہے ہیں اور انکے دمکتے چہروں سے عیاں تھا کے وہ سب خوب لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ ان تصاویر کو دیکھ کر اس کے ابو کے چہرے پر ایک غمگین سی مسکراہٹ پھیل گئی اور

:وہ امی کی طرف دیکھ کر گویا ہوئے
یاد ہے نا تم کو، احمد کی شادی کے کچھ ہی دنوں کے بعد ایک روز وہ صبح صبح اپنی بیوی کو"
لیکر ہمارے گھر آیا تھا اور پھر ہم سب لوگ کیماڑی سے لانچ میں سوار ہو کر منوڑا
سیر کرنے کیلیئے گئے تھے۔

وہ بچہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کے ان تصاویر میں موجود افراد جو اس قدر خوش وخرم نظر آ رہے ہیں اور اب اچانک احمد انکل کیسے باقی سب لوگوں کو حیران وپریشان چھوڑ کر اللہ میاں کے پاس چلے گئے اور جسطرح سے اس کے اپنے ابو سارے گھر کی زمہ داری سھالے ہوئے تھے اور انکے ہوتے ہوئے اسے کبھی کسی بات کی کوئی فکر لاحق نہ ہوئی تھی، ہاں البتہ کبھی کبھار جب اس کے ابو دفتر سے رات بہت دیر گئے واپس آتے تو ان کے آنے سے قبل اسکے ننھے سے دل ودماغ میں طرح طرح کے اندیشیے اور وسوسے کلبلانے لگتے کے اگر خدانہ خواستہ ابو کو کچھ ہوگیا اور اگر اللہ نہ کرے کے وہ گھر واپس نہ ہی آئیں تو پھر اسکا، اسکے چھوٹے بھائی اور اسکی امی کا کیا ہوگا؟ کون اسکول کی فیس ادا کریگا؟، کون انکو کتابیں، یونیفارم، کپڑے خرید کر دے گا، کون جیب خرچ دیا کریگا اور وہ سب لوگ کھانا کیسے کھائیں گے؟

اور اب احمد انکل کے جانے کے بعد ان کے بچوں کی یہ تمام زمہ داریاں بھلا کون اٹھائے گا؟

جسطرح سے ہر چھٹی والے دن اس کے ابو اسے اپنی موٹر سائیکل میں سوار کروا کر تو کبھی پیدل ہی ٹاور، بولٹن مارکیٹ اور ریگل صدر پر زمین پر لگنے والے پرانی کتابوں کے پتھاروں پر اکڑوں بیٹھ کر پرانی کتابوں کو گھنگالتے تو وہ بھی ان ہی کی طرح سے ان کے برابر اکڑوں بیٹھ جاتا اور ان نا سمجھ میں آنے والی موٹی موٹی کتابوں کو اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں بمشکل تھام کر ان کے صفحے پلٹتا تو اسے اپنے دل میں بڑی ہی طمانیت سی محسوس ہوتی تھی اور وہ خود کو دل ہی دل ان کتابوں کو پڑھے بنا ہی اپنے ابو کی طرح سے کوئی بڑا ہی قابل اور عالم و فاضل قسم کا انسان محسوس کرتا لیکن اب احمد انکل کے بچے بھلا کیسے اس عظیم احساس سے بہرہ مند ہو سکیں گے؟

جسطرح سے وہ اپنے ابو کے ہمراہ کھارادر میں قائدا عظمؒ کی جائے پیدائش وزیر منیشن کی نچلی منزل میں قائم لائبریری تو کبھی بند روڈ پر خالقدینا ہال لائبریری، رنچھوڑ لین میں قائم صدیق بابا کی ہلال لائبریری اور کبھی کلفٹن برج شروع ہونے سے کچھ ہی پہلے قائم فریئر ہال کی پرُشکوہ عمارت میں موجود لائبریری میں اپنے ابو کے ہمراہ جا کر ان لائبریریوں کی فضاوں میں پھیلی

ہوئی کتابوں کی مخصوص خوشبو کو اپنے دل و دماغ میں رچا بس اکر آنے والے کئی دنوں تک انہیں محسوس کرتا رہتا اور پھر اپنے دل میں دوبارہ وہاں جا کر اپنے اُسی احساس کی تجدید نو کرنے کی دل ہی دل میں سعی کرتا رہتا، لیکن اب احمد انکل کے بچے بھلا کیسے ان کتابوں کی پیاری پیاری خوشبوؤں کو اپنے دل و دماغ میں مقید کر سکیں گے اور کون ان کو ان لائبریریوں میں لے جایا کرے گا؟

اکثر رات کو کھانے کے بعد گھر سے کچھ ہی فاصلے پر موجود حبیب بنک پلازہ کے عین سامنے والے مکمل تاریکی میں ڈوبے انگریزوں کے دور کے بنے ہوئے پل پر کھڑے ہو کر وہاں سے نظر آنے والے تھوڑی ہی فاصلے پر موجود سٹی ریلوے اسٹیشن کی روشنیاں اور طویل سفر پر روانہ ہونے سے قبل گاڑیوں کے انجن جب شنٹنگ کرتے رات کے سناٹے اور تاریکی میں پل کے نیچے سے زور زور سے سیٹیاں بجاتے ہوئے گزرتے تو اپنا سیاہ دھواں اڑاتے ہوئے وہ انجن اپنے پیچھے ڈیزل اور موبائل آئل کی ملی جلی بو سے فضاء کو آلودہ کر جاتے لیکن اب احمد انکل کے بچے اس اندھیرے پل پر دور سے نظر آتیں سٹی اسٹیشن کی روشنیوں اور ان شنٹنگ کرتے ریلوے انجنوں اور اپنے پیچھے چھوڑ جانے والے دھویں اور اس میں سے آتی ڈیزل اور موبائل آئل کی ملی جلی بو سے کیسے آشنا ہو سکیں گے؟

جسطرح وہ اکثر اپنے ابو کے ہمراہ انکے دفتر جایا کرتا اور وہاں نصب خودکار

ٹیلی پرنٹر از خود چلتے ہوئے اور کاغذ پر زور زور سے کھٹ کھٹ کرکے انگریزی میں نہ معلوم کیا کچھ لکھتا پھر لکھے ہوئے کاغذ اس بڑی سی مشین سے خود بخود باہر آتے اور پھر ہر تھوڑی دیر بعد دفتر کا کوئی کارندہ آکر ان کاغذات کو اس ٹیلی پرنٹر سے کاٹ کرلے جاتا اور وہ دیر تک خاموش کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہتا۔ پھر جب وہ یہ سب دیکھ دیکھ کر تھک جاتا تو پھر اپنے ابو کی میز پر رکھے سیاہ رنگت والے فون کے بھاری بھرکم چوگے کو بمشکل اٹھا کر اپنے چہرے پر، جوکے اس چوگے کے تناسب سے کہیں زیادہ چھوٹا تھا، کو اگر اپنے کان پر لگاتا تو کبھی اسکا منہ اس کی پہنچ سے بہت ہی دور رہتا اور جو اگر اسے اپنے منہ کے قریب لانے کی کوشش کرتا تو اسکا اسپیکر اسکے کان سے کہیں اوپر ہوا ہی میں معلق رہتا۔ بحر طور جوں توں کرکے وہ فون کے چوگے کو اپنے چہرے پر رکھ کر اپنی ننھی منی انگلیوں سے فون کے ڈائل پر بس اندھا دھند نمبر گھماتا رہتا اور فون اکثر کسی نامعلوم مقام پر جالگتا اور پھر دوسری جانب سے آنے والی بھاری بھرکم سی آواز کو سن کر وہ ہمیشہ کی طرح سے گھبرا کر چوگے کو واپس فون کے کریڈل پر رکھ دیتا لیکن یہ سب کرکے وہ خود کو اس اخباری دفتر جہاں اسکے ابو کام کرتے تھے، کا کوئی اعلیٰ کارکن تصور کرنے لگتا اور یہ احساس اسے بے حد اعتماد بخشتا تھا، لیکن اب احمد انکل کے چلے جانے کے بعد بھلا وہ اعتماد انکے بچوں کو کیسے میسر آسکے گا؟

نچلے متوسط طبقے کا یہ گھرانہ دھیرے دھیرے اپنے معمولاتِ زندگی میں مشغول

ہوتا چلا گیا اور وقت کا پہیہ اپنی غیر محسوس رفتار سے چلتا رہا۔

اس واقعہ کو لگ بھگ دس برس کا عرصہ بیت گیا اور اب وہ بچہ ایک سولہ برس کے نوجوان کا روپ دھار چکا ہے اور کورنگی انڈسٹریل ایریا میں واقع نیشنل آئل ریفائنری کے عقبی علاقے چمڑہ منڈی میں قائم ایک لیدر فیکٹری سے باہر نکل رہا ہے اور اس نے اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئیں کتابوں کو یکجا کرکے انہیں اپنے ہاتھوں میں ازسرنو مضبوطی سے پکڑ لیا اور پھر ایک دم سے دوڑ لگا دی۔

یہ اسکا روزانہ کا معمول تھا۔ وہ اس لیدر فیکٹری کے اندر قائم دفتر میں بطور آفس اسسٹنٹ کے کام کرتا تھا اور شام پانچ بجے جب اسکی چھٹی ہوتی تھی تو وہ اپنی فرسٹ ایئر کی کتابوں کو بغل میں داب کر فوراً وہاں سے چمڑہ چورنگی کے بس اسٹاپ جو کم از کم ایک میل کے فاصلے پر تھا، پہنچنے کیلیے روڑتا کیونکہ اسے شام چھے بجے تک ناظم آباد، انکوائیری آفس کے بس اسٹاپ پر موجود گورنمینٹ پریمیئر ایوننگ کالج پہنچنا ہوتا تھا اور چمڑہ چورنگی سے ملنے والی بس صرف صدر ایمپریس مارکیٹ تک ہی چھوڑتی تھی اور پھر وہاں سے اسے دوسری بس پر سوار ہوکر کالج پہنچنا ہوتا تھا، لہٰذا آفس سے چھٹی ہوتے ہی وہ بس اسٹاپ تک کا سارا راستا بھاگ کر طے کرتا اور کم و بیش روزانہ ہی جب وہ اپنے آفس سے نکل کر بس اسٹاپ تک پہنچنے کیلیے سڑک کے کنارے بھاگ رہا ہوتا

تھا تو اسے احمد انکل کے بچے ضرور یاد آتے کے آخر احمد انکل کے بچوں کا کیا ہوا ہوگا؟ ان کے تو ابو بہت پہلے ہی فوت ہوگئے تھے۔ ضرور بیچارے سخت مشکلات کا شکار ہوگئے ہونگے اور زندگی کی اس مشکل دوڑ میں بے چارے بہت پیچھے رہگئے ہونگے اور بھاگتے بھاگتے بھی اس کے ذہن میں یہ خیال آتا کے اللہ کا شکر ہے کے اس کے ابو زندہ ہیں کے جن کے ہوتے ہوئے اس نے نہ صرف میٹرک تک تعلیم بھی حاصل کرلی ہے بلکہ انہوں نے اپنے ایک واقف کار جنھیں اپنی شہر سے دور فیکٹری میں قائم دفتر کیلیئے ایک اسے آفس اسسٹنٹ کی ضرورت تھی جو کے ٹائیپنگ کے علاوہ دیگر دفتری امور میں انکا ہاتھ بٹا سکے، کے پاس بھجواکر نوکری بھی دلوادی اور اب وہ نہ صرف وہ نوکری کر رہا تھا بلکہ ساتھ ہی ساتھ شام کے کالج میں فرسٹ ائیر کامرس کی کلاسیں بھی باقاعدگی کے ساتھ لے رہا تھا۔ ہاں البتہ اتنا ضرور تھا کے چونکہ اس کے آفس اور کالج کے درمیان کافی فاصلہ تھا لہٰذا اسے ہر روز وقت پر کالج پہنچنے کیلیئے بس اسٹاپ تک دوڑ لگا کر جانا پڑتا اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ عموماً بس اسٹاپ سے صدر جانے والی بس کے پائیدانوں پر سفر کرنا پڑتا تھا کیونکہ وہ وقت ہی ایسا ہوا کرتا تھا کے اس سارے انڈسٹریل ایریا میں قائم دفاتر اور کارخانوں میں کام کرنے والوں کی چھٹی اسی وقت ہوا کرتی تھی تو ایسے میں اگر کسی کو صدر جانے والی بس کے پائیدانوں پر اپنے دونوں اور اکثر اوقات تو محض ایک ہی پاوں جمانے بھر ہی کو جگہ میسر آجائے تو اسے بھی خوش نصیبی ہی سے تعبیر کیا جانا چاہیے اور پھر

جب وہ بس صدر ایمپریس مارکیٹ، بس اسٹاپ پر پہنچتی تو وہ فوراً بس سے اترتا اور دوبارہ بھاگ کر ناظم آباد، انکوائیری آفس جانے والی وہ بس پکڑتا جو کے بسوں کی قطار میں سب سے آگے کھڑی ہوتی، کیونکہ آگے والی بس پہلے نکلتی اور وہ اس طرح سے جلد از جلد اپنے کالج پہنچ سکتا تھا مگر اب یہ اور بات ہے کہ اسقدر بھاگ دوڑ کے باوجور بھی کالج پہنچتے پہنچتے اسکا پہلا پیریڈ ہمیشہ ضایع ہی ہو جایا کرتا تھا لیکن چونکہ پہلا پیریڈ اردو کا ہوا کرتا تھااور انتہائی چھوٹی عمر سے ہی ابنِ صفی (مرحوم) کے جاسوسی ناول پڑھ پڑھ کر اسکی اردو کافی اچھی ہو گئی تھی وہ اردو کے مضمون میں ہمیشہ سے ہی اچھا رہا تھا، لہٰذا اس سے اسے کوئی خاص فرق نہ پڑتا تھا۔

اس نے اکثر سوچا کے وہ کسی روز فرصت میں اپنے ابو سے احمد انکل کے بچوں کے بارے میں ضرور سوال کریگا لیکن اپنی ہفتے میں چھے روزہ جاب، پانچ روزہ تعلیمی مصروفیات اور اسکے بعد جسقدر وقت بچ رہتا تھا وہ کتابیں پڑھنے اور لکھنے لکھانے میں مشغول رہتا اور اسکے ابو سے اسکی مختلیف موصوعات پر اکثر بھرپور گفتگو بھی ہوتی اور اکثر دورانِ گفتگو اسے احمد انکل یاد بھی آتے لیکن نہ جانے کیوں وہ چاہنے کے باوجود بھی کبھی ابو سے ان کے بارے میں کوئی سوال نہ کرسکا اور نہ ہی کبھی ابو ہی نے ان کے بارے میں کچھ تذکرہ کیا۔

انہی مصروفیات میں شب و روز گزرتے چلے گئے اور پھر ایک روز اپنے دفتر میں اسنے اخبار میں چھپے انٹرمیڈیٹ کے نتائج میں اپنا رول نمبر فرسٹ ڈویژن کے کالم میں پایا اور اپنے ساتھی کارکنوں کی مبارکباد وصول کرتے ہوئے جہاں اسنے اللہ کا شکر ادا کیا اور خود اپنی پیٹھ آپ ٹھوک کر خود کو اپنی شب و روز کی محنت اور بھاگ دوڑ کا اتنا اچھا پھل پانے پر مبارک باد پیش کی وہیں یک لخت وہی دیرینہ سوال ذہن کے کسی نہاں خانے سے پھر ابھر کر گونجنے لگا:

احمد انکل کے بچوں کا بھلا کیا ہوا ہوگا"

ایک بار پھر وہ اپنی زندگی کے اگلے مراحل کی تکمیل میں جت گیا، وقت اپنی خاموش مگر نپی تلی رفتار سے گزرتا رہا، کچھ اور برس بیت گئے اب وہ گریجویشن کرچکا ہے اور پھر اسکی شادی بھی ہو گئی اور پھر شادی کے کچھ عرصے کے بعد اللہ نے اسے ایک عدد انتہائی پیاری سی بیٹی کا باپ بنا دیا اور پھر چند برسوں میں وہ اپنے اور اپنے اہلِ خانہ کے اعلیٰ مستقبل کیلئیے امریکا چلا گیا اور پھر اسنے کچھ ہی عرصے کے بعد اپنے بیوی بچوں کو بھی اپنے پاس امریکا بلوالیا۔

یہ 2005 کی بات ہے، اب احمد انکل کو اس جہانِ فانی سے کوچ کئے کم و بیش تیں

سالوں کا طویل عرصہ بیت چکا ہے اور اللہ کے حکم سے خود اس کے اپنے ابو بھی ایک برس قبل اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں جبکہ بفضلِ خدا وہ ایک پیاری سی بیٹی کے ساتھ ایک پیارے سے بیٹے کا باپ بھی بن چکا تھا۔ لیکن آج بھی اکثر اس کے ذہن میں وہ ہی تیس برسوں پرانا سوال گونجتا ہے:

"آخر احمد انکل کے بچوں کا بھلا کیا ہوا ہوگا؟"

اب وہ امریکی ریاست فلوریڈا کے ایک چھوٹے مگر انتہائی مقبول سیاحتی و ساحلی قصبے ڈے ٹونا بیچ میں اپنے جاب کے سلسلے میں اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ مقیم ہے۔ وہاں سے ہر اتوار کے اتوار وہ اپنے بیوی بچوں سمیت قریباً 70 میل دور اورلینڈو شہر ڈرائیو کرکے جاتا۔

ایک اتوار کی شام حسبِ معمول وہ سب اورلینڈو جانے کیلئے نکلے لیکن اسے یہ نہ معلوم تھا کے آج کا سفر اس کے پچھلے تمام سفروں سے بالکل مختلیف تھا کیونکہ آج کا یہ سفر اسے اس کے اس دیرینہ سوال کے جواب کی طرف لے کر جا رہا تھا جو اسکے ذہن میں گذشتہ تیس سالوں سے جواب طلب تھا، جسکے ملنے کی امید اب ویسے بھی ابو کے انتقال کے بعد اسکے دل میں بالکل باقی نہ رہی تھی۔

مقامِ مطلوبہ پر پہنچ کر اور پھر وہاں سے فارغ ہو کر جب وہ اپنے بیوی بچوں کو لیکر واپس گھر جانے کیلیئے وہاں سے نکل رہا تھا تو لوگوں کے ہجوم میں اسکی نظر ایک ایسی خاتون پر پڑی جسے وہ دیکھتے ہی پہلی ہی نظر میں پہچان گیا! وہ کوئی اور نہیں تھی! وہ احمد انکل کی بیوہ تھیں۔۔۔۔۔۔۔!!!

گو کہ ماہ و سال کی گرد نے انکا چہرہ گدلا ضرور دیا تھا لیکن اس نے انہیں پہچانے میں ہرگز کوئی غلطی نہ کی تھی وہ سو فیصدی وہی تھیں۔ اس نے اپنی بیوی کو دھیرے سے کہونی ماری اپنی آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے ان کی طرف متوجہ کیا اور اسکے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بول

"ارے یہ ان ہی احمد انکل مرحوم کی بیوہ ہیں جن کے بارے میں اکثر ذکر کرتا رہتا ہوں اور مجھے ان سے ضرور ملنا ہے اور آج تو مجھے یہ ضرور جاننا ہے کے آخر انکا اور انکے بچوں کا کیا ہوا؟"

وہ تیر کی طرح سے ان کے پاس جا پہنچا اور انہیں اپنی جانب متوجہ کرکے ان سے گویا ہوا:

"اگر آپ برا نہ مانے تو کیا میں آپ یہ کچھ پوچھ سکتا ہوں؟"

انہوں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلادیا۔

"کیا آپ کے شوہر کا نام احمد تھا؟"

:اسکا یہ سوال سن کر ان کے چہرے پر ایک عجب سی حیرانگی سی چھا گئی اور وہ بولیں

ہاں بیٹا انکا نام احمد ہی تھا لیکن بھلا تم کیا انکو جانو، انکے تو انتقال کو بھی کوئی تیس ایک"

"برس بیت گئے ہیں۔

اپنی پہچان کی یقین دھانی کر چکنے کے بعد اسے مکمل اطمینان ہو گیا کے یہ وہ ہی ہیں تو اس

:نے ان سے اپنا تعارف کروایا

جی میرا نام امین ہے اور میں آپ کے مرحوم شوہر احمد انکل کے دیرینہ دوست"

"صدرالدین کا بیٹا ہوں۔

کون صدرالدین؟" وہ اپنے حافظے پر زور ڈالتی ہوئیں بولیں۔"

جی وہ ہی صدرالدین بھایانی جو آپ کی شادی پر احمد انکل کے شہ بالے بنے تھے۔""
میں نے انہیں یاد دلاتے ہوئے کہا اور یہ سنتے ہی ان کی بوڑھی آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک نظر آئی

اوہ اچھا تو تم ان کے بیٹے ہو۔ کیسے ہیں اب وہ؟" ان کے چہرے پر شناسائی کی جھلک نظر" آنے لگی۔

جی انکا تو گذشتہ برس پاکستان میں انتقال ہوگیا تھا۔" میں نے قدرے دھیرے سے" کہا۔

اور تمھاری امی، وہ کہاں ہیں؟" انھوں نے افسردہ لہجے میں دریافت کیا؟"

جی وہ تو فی الحال پاکستان میں ہی ہیں لیکن میں کوشش کررہا ہوں اور انشاءاللہ انہیں" "بھی یہاں ہی اپنے پاس بلوالوں۔

اب اس سے پہلے کے وہ کوئی اور نیا سوال کرتیں میں نے ہی ان سے وہ سوال کرڈالا جو کے گذشتہ تیس برسوں سے میرے زہن میں کلبلا رہا تھا۔

"آنٹی آپکے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی وہ سب اب کہاں ہیں؟"

بیٹا وہ توسب کے سب اب امریکی شہری بن چکے ہیں۔ بچوں میں سب سے بڑی تو میری بیٹی ہے جسکی بہت سالوں قبل ایک پاکستانی نژاد امریکی نوجوان جسکا کیلیفورنیا میں اپنا کاروبار ہے، سے شادی ہو گئی تھی۔ ماشاء اللہ وہ خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے۔ میرے بیٹے بھی عرصہِ دراز ہوئے امریکا آ گئے تھے اور ریاستِ ٹکساس میں مقیم ہیں اور اپنے اپنے کاروبار میں مصروف ہیں اور میں اب اپنے بچوں کے پاس یہی امریکا میں ہی مقیم ہوں اور یہاں اورلینڈو اپنے ایک عزیز کے بچوں کی شادی میں شرکت کی غرص سے آئی ہوں۔

اس روز اورلینڈو سے ڈیٹونا بیچ کا 70 میل کا سفر کرتے ہوئے میرے دل و دماغ میں بس یہ ہی بات گردش کر رہی تھی:

بے شک اللہ بڑا مُسبب الاسباب ہے

اور اسی روز مجھ پر یہ راز بھی افشاں ہوا کے آخر اس سوال کے جواب کو پاتے پاتے تیس سالوں کا طویل ترین عرصہ ہی کیوں لگا؟ شاید اللہ تعالیٰ مجھ پر

یہ بات اپنے پورے اور مکمل انجام پر آشکارہ کرنا چاہتا تھا کے وہ کتنا بڑا مُسبب الاسباب ہے اور اللہ نے میرے سوال کا جواب خود مجھے پر دنیا کے اس کونے پر آشکار کیا کے جہاں مجھے اس کے ملنے کی کوئی موہوم سی بھی امید نہ تھی کیونکہ یہ سوال میرے زہن میں شہر کراچی میں اس وقت جاگا تھا کے جب میں صرف چھے سال کا ایک کمسن اور نا سمجھ سا بچہ تھا اور اسکا جواب مجھے تیں سالوں بعد لاکھوں میل دور سات سمندر پار خود میرے سامنے لاکر اس وقت فراہم کیا جب وہ ہی چھے سال کا ایک کمسن اور نا سمجھ سا بچہ چھتیس سالہ دو بچوں کا باپ بن چکا تھا! اور اس سوال کا جواب مکمل طور پر پایہء تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔!!!!!!!!۔

کچھ عرصے بعد جب امی میرے پاس امریکا آگئیں اور میں نے ان سے اس بات کو تذکرہ کیا تو انہوں نے مجھ پر یہ حیرت انگیز انکشاف کیا کہ وہ اور ابو تو ہمیشہ سے ہی احمد انکل کے بچوں کے حالات سے آگاہ تھے اور وہ اس بات سے بھی مکمل طور پر واقف تھے کہ وہ سب لوگ عرصہ دراز ہوئے، امریکا جا بسے تھے لیکن نہ تو انہیں اور نہ ہی ابا مرحوم) کو ہرگز کبھی یہ اندازہ تک ہو سکا کہ میں یہ سوال اس وقت سے اپنے زہن) میں لیئے پھر رہا ہوں اور ہو بھی کیسے سکتا تھا کیونکہ ایک پانچ چھے سالہ بچے سے بھلا کون ایسی سوچ کی امید رکھ سکتا تھا اور وہ تو ہمیشہ یہ ہی سمجھتے رہے کہ شاید مجھے احمد انکل کے بچے تو کیا

خود احمد انکل تک یاد نہ ہوں اور شاید یہ بھی انکی ہی کوئی مشیت خاص تھی کہ میں ہمیشہ چاہتے ہوئے بھی امی اور ابو دونوں ہی سے یہ سوال کرتے ہوئے کتراتا رہا اور اکثر یہ سوال زبان کی نوک پر آ کر واپس پلٹ گیا اور واقعی اس میں اس کی کوئی خاص ہی رمز تھی، کیونکہ اس سوال کا جواب اگر مجھے امی یا ابو کی زبانی محض لفظوں کی صورت ہی میں مل جاتا تو شاید وہ بات مجھ پر اسقدر اثر انداز نہ ہوتی کہ جتنا اس جواب کو 30 سالوں کے بعد اس طرح سے پا کر ہوئی تھی!!!!!!!!!!!!---------

کبھی ہم خوبصورت تھے

لکڑی جل کوئلہ بھئی، کوئلہ جل بھئیو راکھ
ہم دکھیا ایسے جلے کوئلہ بھئیے نہ راکھ

جی ہاں ! آپ پڑھنے والوں کا حیران ہوتا درست بھی ہے اور لازم بھی، تحریر کا موضوع اسقدر رومان پرور اور مضمون کا ابتدائیہ اتنا ہی المیہ !!! اور اس پر سونے پہ سہاگہ یہ کہ دونوں کے مابین کوئی خاص ربط و تعلق بھی ہرگز دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن عزیزانِ من ان دونوں کے درمیان اتنا ہی گہرا تعلق ہے جتنا گہرا ہماری نام نہاد اپوزیشن اور نکمّی حکومت کے درمیان ہے جو چھپتا بھی نہیں اور نظر آتا بھی نہیں ! بقولِ شاعر:

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

لیکن اس خفیہ تعلق کو جاننے کیلیئے آپ کو ہمارے ساتھ ہمارے ماضی میں چلنا ہوگا۔ یہ اس وقت کی بات ہے کے جب آتش کچھ ضرورت سے زیادہ ہی جواں تھا، جی ہاں اس

وقت ہماری عمر غالباً کوئی بیس بائیس برس رہی ہوگی اور چونکے اوائل عمری سے ہی برادرم راشد اشرف کی طرح کتابوں اور لائبریوں سے کچھ عشق ہی سا رہا ہے لہٰذا کبھی کبھار شام کو فرصت کے اوقات میں بناء نفع و نقصان کے تحت چلنے والی ایک مقامی لائبریری میں اعزازی خدمات سرانجام دے دیا کرتے تھے۔ لگ بھگ پنتیس چھتیس سال کے ایک صاحب باقاعدگی سے وہاں کتابیں لینے کی غرض سے آتے تھے اور ہم انہیں ہمیشہ ہی انکل کہہ کر مخاطب کیا کرتے۔ ہمارے منہ سے لفظِ انکل سن کر ان کے منہ کا ذائقہ جسطرح سے بدمزا ہوتا، اسکا اندازہ محض ان کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر ہی لگایا جاسکتا تھا۔

اب ایسا بھی نا تھا کہ ہم کوئی جان بوجھ کر انہیں انکل کہہ کر پکارتے تھے اور اس بات کی تو بہت سے پڑھنے والے خود گواہی دینگے کہ اس عمر میں آپ کو جہاں کسی کے سر پر چاندی کا کوئی ایک تار بھی نظر آجائے تو وہ موصوف انکل انکل اور اگر موصوفہ ہوں تو آنٹی آنٹی سی لگنے لگتیں ہیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی زبان سے انکل یا آنٹی کا قطعاً غیر پارلیمانی لفظ نکل ہی پڑتا ہے اب یہ اور بات ہے کہ آپ کی زبان سے بے دھیانی میں نکلا ہوا یہ بظاہر بے ضرر سا لفظ سننے والے کے دل و دماغ پر برچھی کی طرح سے جا لگتا ہے اور وہ محض تلملا کر ہی رہ جاتا ہے۔

تو صاحبان، جیسے ایک لفظ ہوتا ہے انکل تو ایسے ہی ایک دوسرا لفظ بھی ہوتا ہے، مکافاتِ عمل۔۔۔۔۔۔۔!!! جی ہاں یہ یقیناً مکافاتِ عمل ہی ہے کہ:

تینوں انکل انکل کیندا میں آپے انکل ہویا

ہمارے بچپن میں ریڈیو پاکستان سے اکثر و بیشتر احمد رشدی (مرحوم) کا گایا ہوا ایک گیت بجا کرتا تھا:

جنٹلمین جنٹلمین میرا نام ہوگیا

یہ نام میرا لوگوں میں بدنام ہوگیا

اب بھی یہ گانا ہمارے کانوں میں گونجتا ہے لیکن کچھ یوں:

انکل مین انکل مین میرا نام ہوگیا

یہ نام میرا لوگوں میں بدنام ہوگیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

ہمیں آج بھی یاد ہے کہ اپنے بچپن میں ہم جب بھی اپنے ننہال جایا کرتے تھے تو ہمارے سارے ماموں زاد بھائی بہنیں جن میں سے سب سے چھوٹے بھی ہم سے عمر میں کم از کم دس ایک برس بڑے تھے، تو کوئی ہمیں بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں والا کہتا، تو کوئی گورے گورے گالوں والا کہہ کر ان کو اپنی دو انگلیوں میں پکڑ کر انہیں پیار سے کھینچتا، تو کوئی ہمیں ٹافیاں کھلاتا تو کوئی گود میں

اٹھا کر آئسکریم کھلانے کیلیئے چل پڑتا اور اب وقت کی ستم ظریفی تو ملاحظہ فرمائیں جناب، حال یہ ہے کہ اگر ہم اپنے پیسوں سے بھی کسی کو آئسکریم کھلانے کی دعوتِ عام دیں تب بھی غالباً ہمارے ساتھ کوئی چلنا گوارا نا کرے۔

یہ وقت بھی بھلا کتنی ظالم شے ہے، کسقدر جلد گزر جاتا ہے اور گزرتے گزرتے انسان کے چہرے پر کیسے کیسے نقش و نگار ثبت کرجاتا ہے، لیکن جب یادوں کے بند دریچوں کو کھول کر بیٹھیں تو ان سے اس گزرے ہوئے وقت کی معطر و مدھر خوشبویں ہواؤں کے دوش پر کچھ ایسے آتیں ہیں کے کیا کہنے، بس زرا لمحہ بھر کو اپنے گردوپیش سے ماورا ہونے کی ضرورت ہوتی ہے، بقول فیص:

جو گزر گئ ہیں راتیں
انہیں پھر جگا کے لائیں
جو بسر گئ ہیں باتیں
انہیں یاد میں بلائیں
جو گزر گئ ہیں راتیں
جو بسر گئ ہیں باتیں

کوئی ان کی دھن بنائیں
کوئی ان کا گیت گائیں

اس کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ ہماری سولہویں سالگرہ کو اب کم و بیش چھبیس سالوں کا طویل عرصہ گزر چکا ہے لیکن آج بھی ہمیں ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے جانو کل ہی کی تو بات ہے! ہمارا کیک کاٹنا، ابو امی کے ہنستے مسکراتے چہرے اور حتیٰ کہ اس کیک کا ذائقہ بھی آج دن تک اسی طرح سے ذہن میں تازہ ہے اور کسی طور یقین نہیں آتا کہ ذہن کے نہاں خانوں میں آج بھی تازہ اس سولہویں سالگرہ کو گزرے اتنے سال بیت گئے ہیں۔

یہ وقت کیسے، کب گزرا اور گزرتے گزرتے کب اور کیسے ہمارے چہرے پر اپنے انمٹ نقوش ثبت کر گیا خود ہمیں بھی اسکا کوئی اندازہ نہ ہو سکا اور اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ ہم جب صبح سو کر اٹھتے ہیں تو غسلخانے میں داخل ہوتے ہوئے جب نظر سامنے لگے آئینے پر پڑھتی ہے تو بلا مبالغہ ایک لمحے کے لیئے تو ہمارا نیم خوابیدہ ذہن خود کو دیکھ کر خود سے ہی یہ سوال کر بیٹھتا ہے:

لگتا ہے کہ انہیں ضرور کہیں دیکھا ہے؟

اور پھر اگلے ہی لمحے یہ حقیقت آشکارہ ہوتی ہے کہ میاں کس ہوش میں ہو، یہ

!!!!! صاحب کوئی اور نہیں خود تم ہی ہو۔۔۔
خیر یہ بات تو رہی نیم خوابیدگی کی لیکن بخدا ہم خدا کو حاضر و ناضر جان کر یہ عرض کر رہے ہیں کہ ایک بار ایک بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے اندر ہم اپنی سوچوں میں گم تیزی کے ساتھ باہر کی جانب جا رہے تھے کہ اچانک سامنے سے ایک شناسا شناسا سی صورت کو تیزی کے ساتھ اپنی جانب آتے دیکھا اور یک لحضہ سوچ میں پڑ گئے کہ:
ضرور انہیں کہیں دیکھا ہے؟
لیکن اگلے ہی لمحے ذہن میں ایک بجلی سی کوند گئی اور احساس ہوا کہ ہم دیوار پر نصب قدِ آدم آئینے میں خود اپنا ہی سراپا دیکھ رہے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ !!!!! بقول منیر نیازی:

میں تو منیر آئینے میں خود کو تک کر حیران ہوا
یہ چہرہ کچھ اور طرح تھا پہلے زمانے میں

اور بقول قتیل:

اپنی نظر بھی اب مجھے پہچانتی نہیں

چلیئے قصہ مختصر کرتے ہیں، بات صرف بچے بالوں تک ہی محدود رہے تو کچھ خاص شکوہ نہ ہو لیکن کسی حسیں ماہ جبیں کے لبوں سے یہ ناس پیٹا لفظ انکل سن کر جسقدر دکھ ہوتا ہے، اس دکھ کو وہ احباب ہی محسوس کر سکتے ہیں بلکہ اب تک تو بخوبی کر ہی چکے ہونگے کہ جو اس وادیِ پرخار سے گزر کر آبلہ پائی کا لطف اٹھا چکے ہیں اور گاہے بہ گاہے اٹھاتے رہتے ہیں، اب یہ اور بات ہے کے وہ آبلے پاؤں پر نہیں سیدھے دل پر پڑتے ہیں۔

جی چاہتا کے کسی طور اگر وزارتِ قانون کا قلمدان ہمارے ہاتھوں لگ جائے تو بخدا ہم اس لفظِ انکل پر دفعہ ایک سو چوالیس نافذ کروادیں اور اپنے جیسے بزعمِ خود نوجوانوں کیا ہوا جو اب ہم جیسوں کی پیشانی اور سر زرا کشادگی کی جانب مائل ہے اور باقی رہے سہے بالوں میں سے چاندی کے تار جابجا جھلک رہے ہیں، آنکھوں کے سامنے عینکیں ٹکیں ہوئیں ہیں لیکن دل تو اب بھی ان نام نہاد نوجوانوں سے کہیں بڑھکر جوان ہے) کو انکل کہنے والوں اور والیوں کو انکے معصوم جذبات مجروع کرنے کی پاداش میں قانونی زباں بندی کے ساتھ ساتھ کم از کم ہم جیسے سو لوگوں کو سرِ عام لڑکا کہہ کر بلانے اور اپنے حلقہِ احباب میں اس کارِ خیر کی پرزور تشہیر کرنے کی سزا سنائی جائے، لیکں افسوس کے ہمارے پاس گریجویشن کی ڈگری تو ضرور ہے مگر وہ جعلی نہیں للہذا اب ہمیں وزارت تو ملنے سے رہی۔

ہاں البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ ہم اور ہم جیسے چند ہم خیال لوگ مل کر ایک ادارہِ تحفظِ جذبات و احساساتِ سابق نوجوانانِ ملت (واضح ہو کہ یہاں ہم نے سابق کا لفظ اپنے دل پر بڑا ہی بھاری پتھر رکھ کر استعمال کیا ہے) کا قیام عمل میں لے آئیں اور پھر آپ کو قومی اخبارات میں کچھ اس قسم کی پریس ریلیز پڑھنے کو ملا کریںگیں: ادارہِ تحفظِ جذبات واحساساتِ سابق نوجوانانِ ملت کی جانب سے ریگل چوک پر مظاہرہ

تنظیم کے اراکین نے گذشتہ دنوں اپنے صدر جنھیں شر پسند عناصر کی جانب سے سرِ عام انکل کہہ کر پکارا گیا، جس پر انکے جذبات شدید مشتعل و مجروح ہوئے، ریگل چوک صدر پر اپنی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے شدید غم وغصے کا اظہار کیا اور ان کی جانب سے تمام شر پسند عناصر کو واضح لفظوں میں متنبہ کیا گیا ہے کہ اگر آئندہ اس قسم کی کوئی بھی شر انگیزی ہوئی تو تنظیم اپنے اگلے لائحہ عمل پر غور کریگی جو کہ یقیناً محض مظاہرے تک ہی محدود نہ رہے گا اور کسی بھی ناخوشگوار واقعہ اور اسکے نتیجے میں ہونے والے نقصانات کی تمام تر ذمہ داری مخالفین ہی پر عائد ہوگی۔ مظاہرے میں شامل چند جیالوں کی جانب سے اپنے صدر کے حق میں مسلسل نعرہ بازی کی جاتی رہی اور وہاں موجود چند افراد جن کے جذبات شدید مشتعل تھے نے اس کو بیرونی طاقتوں کی سازش قرار

دیا۔

ویسے ان کی بات میں دم تو ہے کیونکہ ان بیرونی ممالک میں تو ایک سے لیکر سو سالہ مرد و خواتین کو ان کے نام نامی ہی سے پکارے جانے کا رواج ہے، اور یہ لوگ اس انکل و آنٹی کے تکلفات میں بالکل نہیں پڑتے، للہذا ممکن ہے کے ہم لوگوں میں محض تفرقہ ڈلوانے ہی کی نیت سے ان لوگوں نے یہ نگھوڑ مارا انکل و آنٹی کا مسئلہ ڈلوا دیا ہے۔

مگر بھائیوں خوش ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے، کیونکہ نا تو کوئی ایسی تنظیم ہی بنی ہے اور کبھی بن بھی نہ پائے، یہ تو سب ہم اپنے دل کے جلے پھپھولے پھوڑ رہے تھے

اور بقول چچا جان:

دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اب جب دل کو بہلانا ہی ٹھرا تو پھر اپنے احمد مشتاق صاحب کا یہ کہنا بالکل درست معلوم ہوتا ہے

آئینہ دیکھ کے دل ڈولا تو میں نے سوچا
عمر بھر کون جواں کون حسیں رہتا ہے

واضح ہو کہ یہ شعر کچھ یوں ہے :

دل فسردہ تو ہوا دیکھ کر اس کو لیکن

عمر بھر کون جواں کون حسیں رہتا ہے

جسکے اولین مصرعے میں ہمارے بہت ہی مہربان دوست جناب اسد ضیاء حسن نے بطورِ خاص ہمارے اس مضمون کے لیئے یہ تضمین فرمائی ہے۔

سائیکو منیشن

ابنِ صفی کی تخلیقات کو ادب کا درجہ نہ دینے والے ناقدین کے منہ پر طمانچہ۔
نامور اداکار وحید مراد مرحوم پر انکی ایک یادگار فلم ''دوراھا'' میں ایک گانا فلمایا گیا جو کہ سدا بہار ثابت ہوا:

بھولی ہوئی ہوں داستاں گزرا ہوا خیال ہوں
جس کو نہ تم سمجھ سکے میں ایسا اک سوال ہوں

اکثر یہ گیت سنتے وقت ایک بڑا ہی قوی احساس ماضی کے حوالے سے دل و دماغ پر چھانے لگتا ہے اور ماضی سے جڑی ہر شئے پر یہ گیت صادق آتا دکھائی دیتا ہے۔ خصوصاً آج کے اس ڈیجیٹل و انٹرنیٹ دور میں جہاں لوگوں کو اپنے کمپیوٹروں کے اسکرین اور باقی رہے سہے وقت میں انگنت ٹی وی چینلوں ہی سے سر اٹھانے کی فرصت میسر نہیں ہے، ایسے میں محسوس تو یہ ہی ہوتا ہے کہ بھلا کون اب آج سے تیس اکتیس برس پہلے تک لکھے جانے والے جاسوسی ناولوں کے مصنف جناب ابنِ صفی مرحوم اور ان کی لکھی گئیں ''جاسوسی دنیا'' اور ''عمران سیریز'' کو یاد رکھے ہوئے ہوگا اور باوجود اس حقیقت کے ابنِ صفی کو پڑھنے والے انہیں اب

بھی اپنے حافظوں میں محفوظ رکھے ہوئے ہیں، پھر بھی کم از کم گزشتہ ایک آدھ دھائی تک تو بظاہر ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اب ابنِ صفی محض اپنی لکھیں کتابوں اور ان کتابوں کو اس دور میں پڑھنے والوں تک ہی محدود رہ گئے ہیں۔

لیکن در حقیقت ابنِ صفی اور انکی جملہ تحاریر، ان کے اپنے ہی کہے ہوئے ان اشعار کی سچائی پر ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ اور مزید کماحقہ طور پر پورا اترتے نظر آتے ہیں

۔

مدتوں گونجوں کا ذہن میں سوالوں کی طرح
تجھ کو یاد آؤں گا گزرے ہوئے سالوں کی طرح
ڈوب جائے گا کسی روز جو خورشید انا
مجھ کو دہراؤگے محفل میں مثالوں کی طرح

زیرِ تزکرہ کتاب میں شامل ابنِ صفی کے فرزندِ ارجمند ڈاکٹر احمد صفی، اپنے ہی تحریر کردہ ایک مضموں ''ابنِ صفی کے بارے میں'' میں اسی حوالے سے رقمطراز ہیں کہ:

ان کی وفات کے بعد سے اب تک کوئی اور نام سری ادب میں اتنا مقبول نظر نہیں آتا اور اس میں تو کوئی کلام نہیں ہے کہ کسی نے بھی اشاعت

یا فروخت میں ان کا ریکارڈ نہیں توڑا ہے۔ ان کی کتابیں اب بھی ہندوستان اور پاکستان میں اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہو رہی ہیں۔ انگریزی تراجم ان کو دنیا کے ان حصوں میں بھی روشناس کرا رہے ہیں جہاں پہلے ان سے واقف نہ تھے۔ اب تو ان کی انٹرنیٹ پر موجودگی بھی قابلِ ذکر ہوتی جا رہی ہے۔ گوگل پر ان کا نام لاکھوں صفحات تلاش کرکے دے دیتا ہے۔ فیس بک پر موجود ان کے صفحے پر ان کے ہزاروں قارئین کی اوسط عمر بیس سال کے قریب ہے یعنی ایسے نوجوان جو ان کی وفات کے بعد پیدا ہوئے۔ ان کی حیات اور ادبی کارناموں پر تحقیق کرنے والوں میں بھی سرفہرست نوجوان ہی شامل ہیں۔

(بحوالہ: سائیکو منیشن، مولف و مرتب: خرم علی شفیق، صفحہ نمبر: 19/18)

ہم نے ابتداء میں وحید مراد مرحوم اور ان پر فلمائے گئے گیت کا حوالہ پیش کیا تھا اور یہ حوالہ ہم نے کافی سوچ و بیچار کے بعد یہاں شامل کیا ہے، کیونکہ اگر بغور اس شعر کو پڑھ کر جناب ابن صفی مرحوم کے اِن اشعار کو پڑھا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ ایک منظوم سوال کا منظوم جواب ہے۔

علاوہ ازیں "سائیکو مینشن" میں تین سے زائد مقامات پر وحید مراد مرحوم کا تذکرہ آیا ہے اور مولف نے باقاعدہ ثبوت کے ساتھ وحید مراد کا تعارف ابنِ صفی کے ایک مداح کی حیثیت سے بھی کروایا ہے۔ وحید مراد کے تذکرہ کا فائدہ

اٹھاتے ہوئے ہم ان کے اور ابنِ صفی مرحوم کے درمیان ایک قدرِ مشترک کا بھی تذکرہ کرتے چلیں۔ جیسا کہ احمد صفی کی تحریر کے اقتباس میں قارئین پڑھ ہی چکے ہیں کہ آج ابن صفی کے مداحین میں غیر معمولی طور پر اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے اور انمیں سے زیادہ تر کا تعلق نوجوان نسل سے ہے اور ایسا ہی کچھ سلسلہ وحید مراد مرحوم کے ساتھ بھی ہے۔ 23 نومبر 1983 میں اپنے انتقال کے بعد ہی سے مسلسل ان کے مداحین میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے اور آج ان کے مداحین میں بھی سب سے زیادہ تعداد نوجوانوں ہی کی ہے!!!!!!!

جیسا کہ خود جناب ابنِ صفی کے عرصہِ حیات ہی میں ''دانشوران و ناقدینِ ادب'' انکے تخلیق کردہ ادب کو کسی ''ادبی خدمت'' میں شمار کرنے سے ازخود گریز کرتے ہوئے انہیں ''ادبِ عالیہ'' تخلیق کرکے کچھ ''ادبی خدمت'' کرنے کے ''گرانقدر'' مشورجات عنایت کرتے رہتے تھے، جسکا تذکرہ خود ابنِ صفی نے اپنے ایک سوانحی مضمون ''میں نے لکھنا کیسے شروع کیا؟'' میں اپنے اور ان نام نہاد ''دانشوران و ناقدینِ ادب'' کی جانب سے لگائے گئے ''ادب کی خدمت نہ کرنے'' کے الزام کے حوالے سے کیا تھا۔ حالانکہ ابنِ صفی نے محض اپنے جاسوسی ناولوں ہی کی مدد سے نہ صرف اردو زبان اور اردو ادب کی بلکہ برصغیر پاک و ہند کے اردو قارئین کے ادبی و جمالیاتی

ذوق کی اصلاح و مہمیز کرکے اور ان میں احترامِ قانون و آدمیت کے احساس کو جگا کر جو عظیم الشان خدمات سرانجام دیں ہیں اور بفضلِ خدا بعد از مرگ بھی دے رہے ہیں، اسکے عشرِ عشیر کا اندازہ بھی، انہیں ایک اعلیٰ پائے کے ادبی مصنف اور انکی تحاریر کو ادبی شہ پاروں میں شمار نہ کرنے والے یہ نام نہاد ادبی ناقدین نہیں کر سکتے۔

انہی نام نہاد ادبی ناقدین کے بارے میں ابنِ صفی اپنے عمران سیریز 58 کے ناول پاگلوں کی انجمن" میں رقمطراز ہیں: صاحبزادے ادبی ذوق رکھتے تھے۔ ذہین بھی" تھے، لٰہذا جارحیت پسندی نے انہیں ناقد بنا دیا۔

(بحوالہ: سائیکو مینیشن، مولف و مرتب: خرم علی شفیق، صفحہ نمبر: 244)

ادبی ناقدین کی اسی جارحیت پسندی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم نے اپنے فکاہیہ مضمون میں ہوں جلاد مجھے تم جان لو پیارے" میں ان جیسے ادبی ناقدین کا تعارف بطور "ادبی" جلاد" کروایا تھا۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجیئے اور اس کی روشنی میں ان کے کردار اور انکی ابنِ صفی جیسے بلند پایہ و "جمھوری ادیب" کے ساتھ روا رکھی گئی ناانصافی کا بھی اندازہ لگائیں:۔

ادبی جلاد:۔

آپ نے "دائرہِ اسلام" کے بارے میں تو ضرور سنا ہوگا، جی آپ درست سمجھے بالکل وہی والا کہ جہاں آپ نے کچھ "ایسی ویسی" حرکت کی وہاں آپ ہوئے "دائرہِ اسلام" سے خارج! اسی طرح جلادوں کا زیر نظریہ طبقہ جو کہ بہ زعم خود ادب کا ٹھیکیدار، تھانیدار اور چوکیدار (اب یہ آپ کی منشاء ہے کہ جو بھی چاہیں خطاب ان کیلیئے منتخب کرلیں کیونکہ جلاب، ارے توبہ استغفار یہ ہم کیا کہہ گئے، دراصل ہم کہنا چاہ رہے تھے کہ گلاب کو کسی بھی نام سے پکاریے، گلاب گلاب ہی رہتا ہے، مگر یاد رہے کہ اس گلاب میں رنگ و بو کم اور کانٹے زیادہ ہیں)، بن کر اپنے ہی میں کبھی کسی کو شامل کرتا ہے تو کبھی کسی کو مکمل فارغ خطی لکھ کر خارج کردیتا ہے۔ ویسے یہ بات تو طے ہے کہ سب قارئین قیامت کی نظر رکھتے ہیں (نا نا، بخدا آپ ہمیں غلط سمجھ رہے ہیں، ہم آپ سب کو "تاڑنے والے" کہنے اور سمجھنے کا گناہِ عظیم بھلا کیسے کر سکتے ہیں اور اگر آپ میں سے چند ایک ایسے ہوں بھی تو یہ آپ کا اپنا ذاتی فعل و کردار ہے، اب ہم کون ہوتے ہیں بھلا کچھ کہنے اور اعتراض کرنے والے) فوراََ سمجھ گئے کہ ہمارا اشارہ ادب کے ناقدین ہی کی جانب ہے جو کہ بڑی حد تک ادب کے حق میں بلا شرکتِ غیرے جلاد ثابت ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ "ساون میں اندھے کو ہری ہری سوجھتی ہے" لیکن ہمارے ادب کے ان پیدائشی اندھوں کو محض "کھری کھری" سوجھتی ہے، اب یہ اور بات ہے کہ عقل کے ان اندھوں اور گانٹھ کے پوروں کو اپنی جو تنقید "کھری کھری" دیکھائی دیتی ہے وہ لکھنے اور خود ان کے پڑھنے

والوں کو "جلی کٹی" سنائی دیتی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب موصوف سالہا سال میدانِ ادب میں کوئی قابل ذکر کارنامہ سرانجام نہ دے سکے تو اغیار کی نگارشات پر ہلہ بول کر اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہیں اور خود تو سرزمینِ ادب میں محض تنقید نگاری کے نرم و سہل سبزہ زار پر اٹکھیلیوں اور خراماں خراماں چہل قدمیوں کے باوجود بھی خود کو تو "اپنے منّہ میاں مٹھو" نہایت ہی قدآور ادبی شخصیت قرار دیں (اب یہ تو خدا ہی جانتا ہے کہ وہ ادبی شخصیت ہیں کہ محض ایک دبی ہوئی شخصیت) لیکن اسکے برعکس اپنے قلب و روح کو شب و روز تخلیقی کرب کے پلِ صراط سے گزارنے والے نجانے کتنے ادبی "منصوروں" کو انکے مستانہ نعرہِ "اناالحق" کے ناقابلِ معافی جرم پر خود وہ اور انکے ہم پیالہ و ہم نوالہ تنقیدوں کے سنگ.برسا.برسا کر اپنے ہی خود ساختہ "ادبی دائرے" سے ہمیشہ ہمیشہ کیلیے جلاوطن کردیتے ہیں اور پھر تمام عمر اپنی ایڑی چوٹی ایڑی اپنی اور چوٹی۔۔۔۔۔۔۔۔۔اب یہ نہ پوچھیے گا کہ چوٹی کس کی، کیونکہ عقلمندوں) کیلئیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے) کا زور لگا کر انہیں اس "ادبی دائرے" سے خارج ہی رکھے جانے میں کوشاں رہتے ہیں اور ان کی گردنوں نہ جانے کتنے ادبی "منصوروں" کا خونِ ناحق ہے۔

فکاہیہ مضمون ''میں ہوں جلاد مجھے تم جان لو پیارے'' سے اقتباس، تحریر: امین ('' صدرالدین بھایانی)۔

ان ادبی ناقدین جو کہ اب بھی ابنِ صفی کے عظیم ادبی قد و کاٹھ سے انکاری ہیں کے لیئے سائیکو منشن جیسی بلند پایہ تحقیقاتی کتاب کے اجراء کے بعد ایک زریں موقعہ ہے کہ وہ اپنی پہلی فرصت میں اسکا عمیق مطالعہ کرکے یہ جاننے کی حتیٰ الامکان کوشش کریں کہ ابنِ صفی کس بلند پایہ ادب کے تخلیق کار تھے۔ باالفاظِ خرم علی شفیق: ''سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیوں ہمارے دانشور برصغیر کی آزادی اور ابنِ صفی کی مقبولیت کے درمیان اس واضح تعلق کو محسوس کرنے سے قاصر رہے جسے پوری قوم کے اجتماعی شعور نے اتنی شدت کے ساتھ محسوس کرلیا تھا؟''۔

(بحوالہ: سائیکو منیشن، مولف و مرتب: خرم علی شفیق، صفحہ نمبر: 7)

مولف جناب خرم علی شفیق نے اپنی کتاب سائیکو منشن کے دیباچے میں بطور مصنف ابنِ صفی کی امتیازی خصوصیات پر بحث کرتے ہوئے مندرجہ ذیل پانچ نکات کا تذکرہ کیا ہے کہ جس کی بناء پر وہ انہیں ایک ''جمھوری مصنف'' اور انکے تخلیق کردہ ادب کو جمھوری ادب'' قرار دیتے ہیں۔''

نمبر 1: ابنِ صفی ہی وہ سب سے بلند آواز تھی جو قانون اور اخلاقی اقدار کے دفاع میں بلند ہوئی، وہ محض چٹخارے دار کہانیاں نہیں لکھ رہے تھے۔

(بحوالہ: سائیکو منیشن، مولف و مرتب: خرم علی شفیق، صفحہ نمبر: 8)

نمبر 2: علمی حوالوں کی جس قدر بہتات ان کے یہاں پائی جاتی ہے، اور ان حوالوں کے درمیان جتنا تنوع ہے، وہ نہ صرف کسی دوسرے جاسوسی ناول نگار کو نصیب نہیں ہوا بلکہ اردو میں 1936 کے بعد ابھرنے والے کسی بھی ادیب کے حصے میں نہیں آیا۔

(بحوالہ: سائیکو منیشن، مولف و مرتب: خرم علی شفیق، صفحہ نمبر: 9/8)

نمبر 3: اس زمانے کے معاشرے کے جتنے متنوع کردار اور آئیڈیلز ابنِ صفی کے یہاں موجود ہیں وہ اردو کے کسی اور ناول نگار یا افسانہ نویس کے یہاں نہیں ملتے۔ عموماً ادبِ عالیہ' والے ادیبوں نے اپنا دائرہ صرف نچلے طبقے کے افراد یا ذہنی طور پر بیمار قسم' کے کرداروں تک ہی محدود رکھا ہے۔ صرف ابنِ صفی ہی کے یہاں ہمیں احمد کمال فریدی اور علی عمران جیسے کرداروں میں قوم کے عظیم رہنماؤں کے شخصی اوصاف کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور دوسری طرف معاشرے کے عام کرداروں کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں نمونے بھی یہاں موجود ہیں۔

(بحوالہ: سائیکو منیشن، مولف و مرتب: خرم علی شفیق، صفحہ نمبر: 9)

نمبر 4: اگر اقبال کی شاعری کو الہامی شاعری کہا جاتا ہے تو ابنِ صفی کی نثر کو الہامی نثر کہا جاسکتا ہے۔

(بحوالہ: سائیکو منیشن، مولف و مرتب: خرم علی شفیق، صفحہ نمبر: 10)

مولف نے اس بات کو مذکورہ کتاب میں پیش کردہ منتخب اقتباسات کی مدد سے ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

نمبر 5: انہوں نے مستقبل میں پیدا ہونے والے مسائل کی صرف نشاندہی نہیں کی بلکہ ان کے حل بھی پیش کیے۔ یہ امتیاز علامہ اقبال کے بعد کسی دوسرے ادیب کو حاصل نہیں ہوا تھا۔

(بحوالہ: سائیکو منیشن، مولف و مرتب: خرم علی شفیق، صفحہ نمبر: 10)

مولف نے اس بات کے ثبوت کے طور پر عمران سیریز کے ناول ''تین سنکی'' جسمیں) موجودہ دور میں قبائلی علاقہ جات سے مماثل واقعات اور جاسوسی دنیا کے ناول انوکھے رقاص'' جو کے گلوبل وارمنگ سے متعلق ہیں کی مثالیں پیش کی ہے)۔''

جبکہ اب اس بات کا ایک اور بھرپور مظاہرہ ناول ''آدھا تیر آدھا بیٹر'' سے بھی ہو چکا ہے جو کے ریمنڈ ڈیوس والے واقعے سے مماثلت رکھتا ہے۔

مذکورہ بالا انہی خصوصیات کے پیشِ نظر مولف جناب خرم علی شفیق کا یہ

استدلال یقیناً بالکل مناسب، بجا اور درست معلوم ہوتا ہے کہ: کسی دوسرے جاسوسی ناول نگار کے ساتھ ان کا موازنہ ممکن ہی نہیں۔ غالباً یہ ہی وجہ ہے کہ ہمارے ادب میں ان کے مقام کا تعین نہیں کیا جاسکا کیونکہ 1936 بعد سے ہماری ادبی تنقید کا صرف ایک ہی رخ رہا ہے اور وہ ہے مغرب کے کسی نہ کسی تنقیدی پیمانے کے مطابق اپنے ادب کا تجزیہ کرنا۔ چونکہ ابنِ صفی کی مثال نہ مغرب کے جدید ادب میں ہے نہ ہمارے روایتی ادب میں بلکہ وہ برصغیر کی ملتِ اسلامیہ کے نئے عزائم کی نمائندگی کرتے ہیں، لہٰذا انہیں ادبی تنقید کے کسی مروجہ پیمانے کی روشنی میں جانچنے کی بجائے اسے ملت کے مشترکہ آئیڈیلز کی روشنی میں جانچنا ہوگا۔ اِس کام کے لئیے وہ اخلاقی جرات درکار جسکی امید ہمارے نقادوں اور دانشوروں سے ذرا کم ہی ہے۔ وہ جاسوسی ناول نگار سے بہت زیادہ کچھ اور بھی تھے۔

(بحوالہ: سائیکو مینشن، مولف و مرتب: خرم علی شفیق، صفحہ نمبر: 11)

زیرِ تزکرہ کتاب میں شامل ابنِ صفی کے فرزندِ ارجمند ڈاکٹر احمد صفی اپنے ہی تحریر کردہ ایک مضموں ''ابنِ صفی کے بارے میں'' وہ اپنے والدِ گرامی کے ایک سوانحی مضمون میں نے لکھنا کیسے شروع کیا'' کا حوالہ دیتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ: ۔''ابنِ صفی پر'' ادب عالیہ کے ہمعصروں نے اکثر مقبولیت کا الزام لگا کر عموماً ان کو وہ ادبی مقام دینے سے انکار کیا جس کے وہ مستحق

تھے۔ مغرب سے درآمد شدہ افکار کے تحت ہمارے نقاد حضرات بھی عام طور پر اس بات پر متفق پائے جاتے ہیں کی دلچسپ اور مقبول عام شہکار عموماً ادب میں کوئی مقام نہیں رکھتے۔ ابن صفی اس طرح کی تنقید کا جواب کچھ یوں دیتے ہیں :-

۔"افسانوی ادب خواہ کسی پائے کا ہو محض ذہنی فرار کا ذریعہ ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی معیار کی تفریح فراہم کرنا ہی اس کا مقصد ہوتا ہے جس طرح فٹبال کا کھلاڑی شطرنج سے نہیں بہل سکتا۔ اسی طرح سے ہماری سوسائٹی کے ایک بہت.بڑے حصے کے لیے اعلیٰ ترین افسانوی ادب قطعی بے معنی ہے تو پھر میں گنے چنے ڈرائنگ روموں کے لیے کیوں لکھوں؟ میں اس انداز میں کیوں نہ لکھوں جسے زیادہ پسند کیا جاتا ہے شاید اسی بہانے عوام تک کچھ اونچی باتیں بھی پہنچ جائیں"۔

(بحوالہ: سائیکو مینیشن، مولف و مرتب: خرم علی شفیق، صفحہ نمبر: 17/16)

کل 250 صفحات پر مشتمل اس کتاب کو مولف نے اسے دو حصوں ""جمھور نامہ" اور مزاح نامہ" میں تقسیم کرکے ابنِ صفی کے چالیس ناولوں میں شامل ایسے اقتباسات" پیش کیئے ہیں جو کہ شامل تو ابنِ صفی کے جاسوسی ناولوں ہی میں تھے لیکن انکا جاسوسی و سراغرسانی سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ اپنے پڑھنے والوں کو ایک مکمل افسانے کا سا مزہ فراہم کرتے ہیں بقول مدون کے: ۔"ایسے

افسانے جو حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ امید کا پیغام بھی دیتے ہیں اور معاشرے کی برائیوں کا بہت گہری نظر کے ساتھ تجزیہ کرنے کے باوجود دل میں مایوسی کی نہیں عزم اور آرزو کو پروان چڑھاتے ہیں۔ کوئی بھی نقاد اِس مجموعے کو جاسوسی ادب ثابت نہیں کر سکتا بلکہ اِسے سماجی تبصروں اور فکاہیہ ادب کے زمرے ہی میں رکھنا پڑے گا''۔
(بحوالہ: سائیکو مینیشن، مولف و مرتب: خرم علی شفیق، صفحہ نمبر: 12)
مذکورہ کتاب کے پسِ ورق پر ابنِ صفی، مولف و مرتب خرم علی شفیق اور سائیکو منشن کا انتہائی اختصار کے ساتھ تعارف پیش کیا گیا ہے جس کے مطابق: '' سائیکو منشن میں خرم علی شفیق ابنِ صفی کی ناولوں اسے ایسے اقتباسات پیش کرتے ہیں جو ان کے ایک جمہوری ادیب'' ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ ''جمہوری ادب'' کی اصطلاح اُردو'' ادب میں ان کی متعارف کردہ ہے۔ وہ سرسید احمد خان، مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبال کے ساتھ ساتھ ابنِ صفی کو بھی جمہوری ادیبوں میں شمار کرتے ہیں''۔
گزشتہ دنوں ابنِ صفی مرحوم کے فرزندِ ارجمند ڈاکٹر احمد صفی صاحب سے ہماری اسی جمہوری ادب'' ہی کے حوالے سے بذریعہ برقی ڈاک کچھ گفت و شنید ہوئی اور انہوں'' نے اس اصطلاح کی بڑی ہی جامع تشریح انتہائی عمدگی کے ساتھ پیش کی

:جو کہ تمام قارئین کی دلچسپی معلومات کے لیئے پیشِ خدمت ہے

دو طرح سے جمہوری ادب کو دیکھئے:۔

جمہوری ادب وہ ادب ہے جس کو معاشرے کے تمام طبقات میں یکساں طور سے پڑھا اور پسند کیا جائے۔۔۔ اس میں عوام بھی شامل ہو گئے اور خواص بھی۔۔۔۔

جمہوری ادب عوام و خواص میں اس واسطے مقبول ہوتا ہے کہ اس میں وہ رویئے لہریں لے رہے ہوتے ہیں جن کا منبع یا سورس جمہور یعنی کسی قوم کے افراد ہیں۔۔۔ ان قارئین کی آراء سے وہ اندازہ لگاتا ہے کہ قوم کا ذہن کیا سوچتا ہے۔۔۔ پھر وہ ان کو موزوں خیالات ان کے پسندیدہ انداز میں ان تک پہنچا دیتا ہے۔۔۔۔

اب ابن صفی کو لیجئے (بھائی ایک مرتبہ پھر میں یہ تبصرہ ایک قاری کی حیثیت میں کر رہا ہوں اسے پدرم سلطان بود کا نعرہ نہ سمجھا جائے)۔ آپ جانتے ہیں کہ ان کی تخلیقات بغیر کسی تفریق کے معاشرے کے ہر طبقہ میں یکساں مقبول تھیں۔۔۔۔ جنہیں ہم عوام کہتے ہیں یعنی سڑکوں پر مزدوری کرنے والے، کسان، محنت کش، طلباء و طالبات، پیشہ ور حضرات، اساتذہ، سائنسدان، وغیرہ وغیرہ۔

ان کے علاوہ ادب کے بڑے نام اور ان کے علاوہ بہت سے۔ پھر حکومتی عمال جن میں سیاستدانوں سے لیکر فوجی جرنیلوں اور حکمرانوں کے نام آجاتے ہیں۔ تو یہ پہلی شرط تو ابن صفی پوری کرتے نظر آتے ہیں۔

دوسری بڑی شرط ایسے ادیب کا اپنی قوم سے تعلق ہے جس سے وہ اپنی تخلقات کا ڈھانچہ کھڑا کرتا ہے۔۔۔ ان کی زندگی میں ہم نے دیکھا کہ وہ کسی قاری کا خط بغیر جواب دیئے نہیں جانے دیتے تھے۔۔۔ اور کس قیامت کے نامے ان کے پاس آتے تھے۔۔۔ لوگ اپنی بات ان تک پہنچانے میں بالکل تلکف نہیں کرتے تھے۔۔۔ ابھی ایک لیکچر میں میں نے دو نمائندہ خطوط حاضرین سے شئیر کیئے تھے جن میں سے ایک اردو کے بڑے شاعر اور ادیب حضرت بہزاد لکھنوی صاحب کا تھا (آپ کو غزل، اے جذبہ دل گر میں چاہوں، تو یاد ہی ہو گی!)۔ انہوں نے کتابوں کی اور ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔

دوسرا خط ٹرک ڈرائیور اشتیاق کا تھا جس نے اپنی ہی زبان میں بے تکلفی سے خط لکھوایا تھا۔ وہ پڑھ نہیں سکتا تھا مگر ابن صفی کی کتابیں جمع کرتا تھا اور پڑھوا کر سنتا تھا۔۔۔ اس نے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔۔۔ ابن صفی صاحب نے نادیدہ ہمدرد کے پیشرس میں اس کا جواب بھی دیا۔۔۔ یہ اور ایسے ہزاروں خطوط اور ملاقاتی ان کو قوم سے جوڑے رکھتے تھے اور ان سے وہ اپنا ادب اخذ کرتے تھے۔۔۔

اس ادب کی ایک خاص بات ہے۔۔۔ وہ یہ کہ اس کو اگر اپنی امت پر قیاس کریں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہے کہ میری امت کبھی کسی غلط بات پر مجتمع نہیں ہوگی۔۔۔ لہٰذا اگر اجتماعی طور پر قوم کوئی فیصلہ کرتی ہے تو وہ اس کلیئے سے غلط نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح امت کے اجتماعی شعور سے جو کچھ بھی اخذ کیا جائے گا وہ بھی اس کے لئے مفید اور بہتر ہی ہوگا۔

اگر وہ خالی عوامی ادیب ہوتے تو نقاد ان کو چٹکی سے نکال کر ایک طرف پھینک چکا ہوتا۔۔۔ ان کا ادب تو سب کے لئے اور سب سے تھا۔۔۔ لہٰذا ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اب کوئی بھی ادیب اٹھا لیجئے اور اسے اسی پیمانے پر پرکھئے۔ کیا اس کا ادب پڑھنے والے ہر طبقہ میں تھے۔۔؟؟؟ کیا وہ ہر طبقے سے کسی طور جڑا ہوا تھا یا صرف ڈرائنگ روم میں یا اپنی اسٹڈی میں بیٹھ کر ادب تخلیق کر رہا تھے جسے معدودے چند لوگ سمجھیں اور اس پر واہ واہ کریں۔۔۔ وہ بڑا ادیب تو ہوگا مگر جمہوری ادیب نہیں۔۔۔ مجھے ڈر ہے کہ آپ اس طرح ناپنے بیٹھے تو بہت سے ادیب اس معیار پر پورے نہ اتریں گے۔ اور یہی حقیقت ہے۔

جمہوری ادب اور جمہوری ادیب کی اور بہت سی پرتیں ہیں جو اب کھل رہی ہیں اور

ہمیں پتہ چلتا ہے کہ تاریخ میں بھی ایسے ہی ادیب تھے جنہوں نے تاریخ کا رخ بدل ڈالا۔۔۔۔

بطور ایک قاری اور ابنِ صفی کے مداح کے اس کتاب (سائیکو مینشن) کی جو باتیں ہمیں سب سے زیادہ اچھی لگی وہ اس میں پیش کردہ تمام تر اقتباسات کا مکمل تعارف اور ساتھ ہی ساتھ اسکے تمام تر متعلقہ حوالہ جات اور پسِ منظر کی ممکنہ وضاحتوں کی موجودگی ہے۔

علاوہ ازیں مولف نے خطِ نسخ کے استعمال سے ابنِ صفی کے اصل اقتباسات جو کے خطِ نستعلق میں دیئے گئے ہیں میں تفاوت پیدا کرنے کی کوشش کرکے اپنے قاری کو کسی بھی ممکنہ مخمصے کا شکار ہونے سے بھی محفوظ رکھا ہے۔

مولف نے جہاں نہ صرف پیش کردہ تمام تر اقتباسات کا مکمل تعارف اور ساتھ ہی ساتھ اسکے تمام تر حوالہ جات اور پسِ منظر کی ممکنہ وضاحتیں پیش کیں ہیں، وہیں ان اقتباسات کے حوالے سے متعدد سوالات اور خیالات کو ابھار کر قارئین کو ان پر غور و خوص کرنے کی بھی دعوت دی ہے۔ باالفاظِ دیگر انہیں ان اقتباسات اور ان کو بیان کرنے کے پیچھے کارفرما محرکات پر غور کرنے کے لیے (فوڈ فار تھاٹ) کا بھرپور اہتمام بھی کیا گیا ہے جو اس بات کا مکمل غماز ہے

کہ دراصل ابنِ صفی کا مشن عوام اور خواص میں یکساں طور پر آگہی کی فراہمی اور انکی ذہنی نشونما و شعوری ارتقا کے عمل میں مدد و معاون ثابت ہونا تھا اور جس میں وہ پوری طرح سے کامیاب و کامران رہے تھے۔

بحر طور مولف جناب خرم علی شفیق کے ذہن میں اس کتاب کی تکمیل کے ضمن میں جو عظیم مقصد تھا کہ پڑھنے والوں کو اس دانشور جمھوری ادیب سے متعارف کروایا جائے جس پر ناقدینِ ادب نے محض ایک جاسوسی ادیب کا ٹھپہ ثبت کرکے انہیں از خود متعین شدہ ادبی دائرے سے خارج کرنے کی جو ناکام کوشش کی ہے اسکا اصل پردہ چاک ہو سکے اور مولف اپنی اس کوشش میں نہ صرف سو فیصدی کامیاب رہے ہیں بلکہ انہوں نے اپنے قارئین کو یہ بھی سوچنے پر مجبور کردیا ہے کہ ادب محض ہرائے ادب سے آگے کچھ اور بھی ہے اور اسکا کام اپنے پڑھنے والے تمام مکتبہ ھائے فکر کی ذہنی نشونما و بالیدگی اور تعمیر کردار و اصلاحِ شخصیت میں مثبت کردار کی ادائیگی ہے۔ بلاشبہ یہ عظیم وصف جناب ابنِ صفی کے یہاں بدرجہِ اتم پایا جاتا ہے۔

آخر میں ہم اس اعلیٰ نوعیت کی تحقیقی کتاب کی اشاعت پر ہم اپنے دل کی گہرائیوں سے کتاب کے مولف و مرتب جناب خرم علی شفیق، ڈاکٹر احمد صفی، کتاب کے سرورق بنانے والے آرٹسٹ جناب عطاء الرحمٰن (برنگ ڈیزائیر) کو اسقدر عمدہ

کارکردگی پر انہیں اور اس کتاب کے ناشر فضلی سنز کے طارق رحمن فضلی اور ساجد
رحمن فضلی صاحبان اور تمام مداحینِ ابنِ صفی کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

پوپ کہانی

شیخ مقصور الٰہی نے "پوپ کہانی" کے نام سے ایک نئی صنف متعارف کروائی ہے۔ یہ ایک انتہائی دلچسپ اور لذیذ کہانیوں پر مشتمل تجربہ ہے جسے چھوٹے چھوٹے خیالات و احساس کو دوسروں تک پہنچانے کا موثر ذریعہ قرار دیا گیا ہے، (علی سفیان آفاقی)۔

پوپ کہانیوں کا اولین مجموعہ جو کے "پوپ کہانیاں" کے عنوان سے ابھی حال ہی میں شائع ہوا ہے، اور ہم اِس سے۔برادرم ارشد اشرف کی فیس بک پر بپا فروغِ علم و ادب کی کاوشوں کے توسط سے متعارف ہوئے اور اس مجموعے میں شامل محترم جناب احمد صفی صاحب کی چار عدد عمدہ و اعلیٰ پوپ کہانیاں پڑھنے کو ملیں اور اُن کو پڑھ کر ہمارے دل میں بھی اس نئی صنف پر طبع آزمائی کا خیال آیا اور یہ تازہ ترین کوشش تمام احباب سے اپنی گرانقدر رائے فراہم کرنے کی مؤدبانہ درخواست کے ساتھ پیشِ خدمت ہے۔

سمندر سے اٹھتیں دیو ہیکل موجوں نے ساحل کا رُخ کرلیا اور پھر دیکھتے ہی

دیکھتے موجیں ساحل کو روندتے ہوئے ساحل اور اسکے ساتھ گزرتی متوازی سڑک کو تقسیم کرنے والی دیوار کو کئی میٹر کی بلندی سے پھلانگتیں سڑک پر جا پہنچیں۔

سڑک کے کنارے، دیوار کے ساتھ قطار اندر قطار کھڑی سینکڑوں کاریں ان بھپری ہوئیں موجوں کے بے پناہ زور کے سامنے کسی معصوم بچے کی ننھی منی کھلونا کاروں کی طرح سے بے قابو ہو کر بھپرے ہوئے پانیوں میں ایک دوسرے سے ٹکراتیں اِدھر اُدھر بہنے لگیں۔

اس خوفناک منظر کو دیکھ کر اسکی آنکھیں پھٹیں کی پھٹیں رہ گئیں اور وہ ابھی کچھ اور سوچ ہی نا پایا تھا کہ اچانک ایک اور منظر دیکھ کر تو اسکا سانس اسکے سینے میں ہی اٹک کر رہ گیا۔

ایک کافی بڑی بوٹ انتہائی تیزی کے ساتھ موجوں کے بہاؤ میں ڈولتی چلی آ رہی تھی اور پھر اس بڑی سی بوٹ کا پیندا پانی میں ڈوبی ہوئی دیوار کی منڈیر سے جا ٹکرایا جس سے بوٹ اُلٹ گئی اور بارش کے پانی میں بہتے ہوئے خزاں رسیدہ پتوں کی مانند اِدھر اُدھر ڈولتیں کاروں پر آن پڑی اور ان سے ٹکراتی ہوئی بے قابو موجوں میں ڈوبکیاں لگاتی تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔

اسی طرح کی چند مزید لانچیں، بوٹیں اور کاریں جو کے اُن دیو ہیکل موجوں میں بہتی ہوئیں اب اُس سڑک کے کنارے ایک پُل کے نزدیک پہنچ چکیں تھیں اور پانی کے زور اور اونچائی کا یہ عالم تھا کہ وہ اس بلند و بالا پُل کی چھت کو چُھو رہا تھا اور پھر یک بعد دیگرے وہ تمام لانچیں، بوٹیں اور کاریں اس پُل کی چھت اور ریلینگ سے ٹکراتیں پُل کے نیچے سے گزرنے لگیں اور اُن کے زور سے پانی فواروں کی مانند پُل کی ریلینگوں سے فضاء میں دُور تک بلند ہو رہا تھا۔

اس ہیبتناک منظر نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ موجوں کی نذر ہو جانے والیں ان گاڑیوں، بوٹوں اور لانچوں کے مسافروں کا آخر کیا انجام ہوا ہوگا؟

یہ تمام دلخراش مناظر دیکھ دیکھ کر اب اسکی برداشت کی انتہا ہو چکی تھی، اس نے سوچا کہ کیا وہ اسی طرح سے ایک خاموش تماشائی بنا محض یہ تماشا ہی دیکھتا رہیگا؟ اسے کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا اور اگر وہ یونہی ایک تماشبین کی طرح سے یہ سب کچھ ہوتا دیکھتا ہی رہا تو شدید ذہنی اختلاج سے اسکی دماغ کی تمام رگیں پھٹ جائیں گیں۔

اور پھر آخر اس نے فیصلہ کر ہی لیا کے وہ اب مزید ایک خاموش اور بے حس تماشائی بنکر یہ سب کچھ دیکھتے رہنا ہرگز گوارا نہ کریگا، اس نے کئی گہرے گہرے سانس لے کر خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ چند لمحوں بعد جب اسے اپنے حواس مجتمع ہوتے محسوس ہوئے تو اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اپنی مسہری کے بالکل ساتھ لگی ہوئی چھوٹی سی میز پر رکھا ریموٹ اٹھا لیا اور اسکا رُخ ٹی وی کی طرف کرکے اسے بند کر دیا اور پھر اسی میز پر لگے ٹیبل لیمپ کو بجھا کر سونے کے لیئے دراز ہو گیا۔

چند ہی لمحوں بعد اسکے فلک شگاف خراٹے بیڈ روم کے سناٹے کو چیر رہے تھے۔۔۔۔۔

۔

ٹیلی فون کی گھنٹی

پوپ کہانی-2

شیخ مقصود الٰہی نے ''پوپ کہانی'' کے نام سے ایک نئی صنف متعارف کروائی ہے۔ یہ ایک انتہائی دلچسپ اور لذیذ کہانیوں پر مشتمل تجربہ ہے جسے چھوٹے چھوٹے خیالات و احساس کو دوسروں تک پہنچانے کا موثر زریعہ قرار دیا گیا ہے، (علی سفیان آفاقی)۔

پوپ کہانیوں کا اولین مجموعہ جو کے ''پوپ کہانیاں'' کے عنوان سے ابھی حال ہی میں شائع ہوا ہے، اور ہم اِس سے برادرم ارشد اشرف کی فیس بک پر بپا فروغِ علم و ادب کی کاوشوں کے توسط سے متعارف ہوئے اور اس مجموعے میں شامل محترم جناب احمد صفی صاحب کی چار عدد عمدہ و اعلیٰ پوپ کہانیاں پڑھنے کو ملیں اور اُن کو پڑھ کر ہمارے دل میں بھی اس نئی صنف پر طبع آزمائی کا خیال آیا اور یہ تازہ ترین کوشش تمام احباب سے اپنی گرانقدر رائے فراہم کرنے کی مودبانہ درخواست کے ساتھ پیشِ خدمت ہے۔

میں پورے انہماک کے ساتھ اپنے فرائضِ منصبی کی انجام دہی میں مصروف تھا کہ

اچانک سامنے رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی زور زور سے بجنا شروع ہو گئی، جس نے نہ صرف مجھے بُری طرح سے چونکا دیا بلکہ میرے تمام تر انہماک کو بھی توڑ کر رکھ دیا۔

میں نے قہر آلود نگاہیں فون پر ڈالیں اور سوچا کہ کاش میری آنکھوں سے سُپر مین کی طرح سے شعاعیں نکلیں اور اس شُور مچاتے فون کو جلا کر بھسم کر دیں۔

میں ہمیشہ سے ہی فون کی گھنٹی سے شدید کوفت کا شکار ہو جاتا ہوں، بطورِ خاص وہ عین اس وقت بج اٹھے جب میں کسی اہم کام، مطالعہِ کتاب، ٹی وی دیکھنے، اہم گفتگو یا گہری سوچ میں مشغول ہوں اور فون پر گفتگو کرنا ہمیشہ ہی سے اپنے قیمتی وقت کی بربادی کے مترادف ہی محسوس ہوتا ہے۔

فون کی گھنٹی مجھے کبھی بھی اچھی نہیں لگی، بلکہ سچ پوچھیے تو اس فون کی گھنٹی سے مجھے ہمیشہ ہی سے نفرت سی رہی ہے، بس نہ جانے کیوں مگر میرا اس سے اللہ واسطے ہی کا بیر ہے!

جہاں یہ بجی وہاں ہوا میرا موڈ آف!!!۔

کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان نحوست مارے ناس پیٹے فونوں میں یہ چیختی چنگاڑتیں گھنٹیاں محض مجھ جیسوں کو ذہنی اختلاج میں مبتلا کرنے

ہی کے لیے تو نصب کی گئیں ہوں اور جب جب وہ بجتیں تب تب مجھے ایسا ہی محسوس ہوتا کہ جیسے ہزاروں ہتھوڑے میرے دماغ پر برس رہے ہوں اور جی چاہتا کہ یا تو دنیا سے سارے فون یا پھر کم از کم ان کی گھنٹیوں ہی کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا جائے۔
بحرحال اپنے دل ہی دل میں فون کے موجد اور اسکی سات پشتوں کو سلواتیں سناتا بادل ناخواستہ فون کا ریسیور اٹھا کر اپنی آواز میں شامل تمامتر ناگوار تاثرات کو پیشہ ورانہ شائستگی کی ملمہ کاری کی متعدد تہوں میں چھپا کر گویا ہوا: ''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''
دوسری جانب سے ایک خاتون کی آواز ابھری: یہ سماعت و گویائی سے محروم افراد کی خصوصی فون سروس ہے، آپکی کسٹمر گفتگو کرینگی اور میں ترجمان کے فرائض انجام دونگی، وہ اپنے فون پر نصب کی بورڈ پر جو پیغام ٹائپ کر کے ارسال کرینگیں میں آپکو پڑھ کر سناؤں گی اور اِسی طرح آپ کی بات میں ان تک پہنچاؤں گی جسے وہ فون پر نصب اسکرین پر پڑھ سکیں گیں، کیا آپ اس گفتگو کا حصہ بننے پر رضامند ہیں؟
مجھے فوراً ہی سماعت و گویائی سے محروم اپنی کسٹمر یاد آ گئی، وہ جو کہنا

چاہتی کاغذ پر لکھ دیا کرتی اور میں جو کہنا چاہتا اسے کاغذ پر لکھ کر دکھا دیا کرتا۔ بحر طور میری رضامندی کے بعد ترجمان خاتون نے گفتگو کا آغاز کروا دیا میری کسٹمر کو محض اپنی ایک جملے پر محیط بات کو مجھ تک پہنچانے میں منٹوں صرف ہو رہے تھے اور میرا جواب پڑھ کر دوبارہ مجھ تک اپنی بات پہنچانے میں تو اکثر پانچ سے دس منٹ تک لگ رہے تھے اور محض چند مختصر سوالات و جوابات پر مشتمل گفتگو کا دورانیہ کم و بیش پینتالیس منٹوں تک جا پہنچا اور مجھے اس وقت شدت سے اپنی کسٹمر کی بے چارگی کا احساس ہو رہا تھا۔

دورانِ گفتگو مجھے برسوں پہلے دیکھی ایک بھارتی فلم "شور" مسلسل یاد آتی رہی جسمیں فلم کا ہیرو منوج کمار جسے شور سے شدید نفرت ہوتی ہے اور وہ ہر قسم کے شور سے شدید بیزار رہتا ہے۔ لیکن فلم کے آخری منظر میں جب وہ ایک حادثے کا شکار ہو کر قوتِ سماعت سے محروم ہو جاتا ہے تو اسے آسمان پر اڑتے ایک ہوائی جہاز کو، جسکی آواز سے بھی اسے کبھی شدید نفرت تھی، کی آواز نہ سن سکنے کے سبب انتہائی حسرت بھرے انداز میں دیکھتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔

نہ جانے کیوں ہم انسانوں کو ہر نعمت کی قدر اسکے چھن جانے کے بعد ہی ہوتی ہے۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اور وہ رہا کرا لیا گیا

پوپ کہانی- 3
شیخ مقصود الٰہی نے ''پوپ کہانی'' کے نام سے ایک نئی صنف متعارف کروائی ہے۔ یہ ایک انتہائی دلچسپ اور لذیذ کہانیوں پر مشتمل تجربہ ہے جسے چھوٹے چھوٹے خیالات و احساس کو دوسروں تک پہنچانے کا موثر ذریعہ قرار دیا گیا ہے، (علی سفیان آفاقی)۔
پوپ کہانیوں کا اولین مجموعہ جو کے ''پوپ کہانیاں'' کے عنوان سے ابھی حال ہی میں شائع ہوا ہے، اور ہم اِس سے۔برادرم ارشد اشرف کی فیس بک پر بپا فروغِ علم و ادب کی کاوشوں کے توسط سے متعارف ہوئے اور اس مجموعے میں شامل محترم جناب احمد صفی صاحب کی چار عدد عمدہ و اعلیٰ پوپ کہانیاں پڑھنے کو ملیں اور اُن کو پڑھ کر ہمارے دل میں بھی اس نئی صنف پر طبع آزمائی کا خیال آیا اور یہ تازہ ترین کوشش تمام احباب سے اپنی گرانقدر رائے فراہم کرنے کی مؤدبانہ درخواست کے ساتھ پیشِ خدمت ہے۔
گاؤں کے چوپال میں تل تک دھرنے کی جگہ نہ تھی اور لوگوں کا ایک عظیم اژدھام

بےچینی کے ساتھ پنچوں کا انتظار کر رہا تھا جو کے چوپال سے ملحقہ کمرے میں بند دروازے کے پیچھے مسلسل صلاح و مشورے میں مصروف تھے۔

پاک پورہ گاؤں کے پنچوں کے سامنے یہ معاملہ آج ہی رکھا گیا تھا حالانکہ اس معاملے کے مرکزی ملزم رحمت عرف رحمو کو آج سے دو ماہ قبل وقوع پذیر ہونے والے اس واقعے والے دن ہی رنگے ہاتھوں پکڑ کر حوالہِ پولیس کر دیا گیا تھا اور اب اس پر باقاعدہ عدالت میں کیس بھی چل رہا تھا لیکن اب فریقین کی جانب سے یہ معاملہ گاؤں کے پنچوں کے سامنے پیش کر دیا گیا تھا۔

رحمت عرف رحمو پاک پورہ گاؤں کے چودھری دولت دار کے انتہائی قریبی دوست ملک مبارک دبدبہ کا بیٹا تھا، جو کہ پچاس دیہاتوں کا چوہدری تو تھا ہی بلکہ اس سارے ضلع و تحصیل کا ''وڈا چودھری'' بھی مانا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ چودھری دولت دار کو الیکشن میں کامیاب کروا کر حکومتی ایوانوں تک پہنچانے میں بھی اسی کا ہاتھ تھا اور چودھری دولت دار ٹھرا محض چھوٹے چھوٹے چار دیہاتوں کا چودھری، کہلاتا تو وہ اسکا دوست ہی تھا لیکن درحقیقت وہ اسکے زیرِ نگیں ہی تھا۔

شُنید ہے کہ اُس روز رحمت اپنی گاڑی میں سوار پاک پورہ گاؤں کے پنگھٹ پر

پانی بھرتی خواتین سے چھیڑ خانیوں میں مصروف تھا اور اسکی یہ حرکات دیکھ کر اسے گاؤں ہی کے دو نوجوانوں نے للکارا اور اس بدبخت نے اپنی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی اپنے ریوالور سے پے درپے فائر کرکے دونوں کو موقعے ہی پر ہلاک کردیا لیکن آس پاس کھیتوں میں کام کرتے مزارعوں نے آگے بڑھ کر اسکی گاڑی کو گھیر لیا اور گھسیٹ کر باہر نکال لیا۔

رحمت کی گاڑی کے پیچھے اسکے حواریوں نے جو کہ ایک دوسری گاڑی میں سوار تھے جب یہ منظر دیکھا تو وہ رحمت کی مدد کو آگے بڑھے لیکن وہاں موجود مشتعل لوگوں نے اس گاڑی کو بھی گھیرنے کی کوشش کی جس پر گاڑی تیز رفتاری سے ریورس کرنے کی کوشش میں ایک سائیکل سوار پر چڑھ دوڑی اور اسے روندتی وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

بعد ازاں رحمت عرف رحمو نے پولیس کو یہ بیان دیا کہ ان دونوں نوجوانوں نے اسے اغوا اور لوٹنے کی کوشش کی تھی جس پر اسنے اپنے دفاع میں ان پر فائر کردیا۔

اس واقعہ کے بعد سے گاؤں بھر میں مسلسل رحمت اور ملک مبارک دبدبہ کے خلاف مظاہروں کا سلسلہ جاری تھا اور رحمت کو سخت سزا دیے جانے کا مطالبہ

کیا جارہا تھا اور ان مظاہروں میں یہ باتیں بھی سننے میں آرہی تھیں کے گاؤں کا چودھری دولت دار اپنے دوست کے بیٹے کو بچانے اور حقِ نمک کی ادائیگی کے لیے پولیس اور مقامی انتظامیہ سے ساز باز کر رہا ہے۔

اور پھر اچانک آج یہ معاملہ گاؤں کے پنچوں کے سامنے رکھ دیا گیا اور وہ اس وقت صلاح و مشورے میں مصروف تھے اور گاؤں بھر کے لوگ گاؤں کی چوپال میں جمع تھے اور اس سے ملحقہ کمرے کے بند دروازے پر اپنی نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔

اچانک وہ بند دروازے کھلا اور اسمیں سے گاؤں کے پانچ بڑے بزرگ یکے بعد دیگرے برآمد ہوئے اور چوپال کے عین مرکز میں ایک بڑے تخت پر براجمان ہوگئے۔

پنچوں میں سے ایک جو کہ ان میں سب سے معمر و معتبر دکھائی دیتا تھا، اٹھا اور اسنے چوپال میں بکھرے ہوئے ہوئے مجمع کو اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر مخاطب کیا: سنو سنو سنو گاؤں والوں سنو، گاؤں چودھری دولتدار کا، معاملہ رحمت عرف رحمو کا انصاف اور فیصلہ پنچوں کا۔۔۔۔۔۔۔۔۔!۔

گاؤں پاک پورہ کے عظیم تر مفاد میں ہم پنچوں کے متفقہ فیصلہ کے مطابق رحمت عرف رحمو ولد ملک مبارک دبدبہ اور جملہ مقتولین کے ورثاء کے درمیان خُون

بھا کی ادائیگی کے عوض صلح نامہ کروایا گیا ہے اور ویسے بھی ملک مبارک دبدبہ کے ہمارے گاؤں پاک پورہ پر بے پناہ احسانات ہیں اور ان ہی کی امداد پر یہ سارا کا سارا گاؤں پل رہا ہے اور اس فیصلے پر انھوں نے مزید امداد کا وعدہ بھی فرمایا ہے، لہٰذا خُون بھا کی ادائیگی اور صلح نامے کی دستاویزات عدالت میں داخل کرکے رحمت عرف رحمو کو با عزت.بری کروا لیا جائے گا اور پنچوں کے اس مثالی فیصلے کے بعد یہ پنچایت .برخواست کی جاتی ہے۔

پنچوں کے فیصلے کی منادی ہو چکنے کے بعد وہاں موجود ملک مبارک دبدبہ اور چودھری دولت دار.بڑی دیر تک ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر زیرِ لب مسکراتے ہوئے مسلسل اپنی مونچھوں کو تاؤ پر تاؤ دیتے رہے۔۔

میں بتاؤں گا انہیں کروڑپتی۔۔۔۔۔!!!۔

پوپ کہانی۔ 4
شیخ مقصود الٰہی نے ''پوپ کہانی'' کے نام سے ایک نئی صنف متعارف کروائی ہے۔ یہ ایک انتہائی دلچسپ اور لذیذ کہانیوں پر مشتمل تجربہ ہے جسے چھوٹے چھوٹے خیالات و احساس کو دوسروں تک پہنچانے کا موثر زریعہ قرار دیا گیا ہے، (علی سفیان آفاقی)۔
پوپ کہانیوں کا اولین مجموعہ جو کہ ''پوپ کہانیاں'' کے عنوان سے ابھی حال ہی میں شائع ہوا ہے، اور ہم اِس سے برادرم ارشد اشرف کی فیس بک پر بپا فروغِ علم و ادب کی کاوشوں کے توسط سے متعارف ہوئے اور اس مجموعے میں شامل محترم جناب احمد صفی صاحب کی چار عدد عمدہ و اعلیٰ پوپ کہانیاں پڑھنے کو ملیں اور اُن کو پڑھ کر ہمارے دل میں بھی اس نئی صنف پر طبع آزمائی کا خیال آیا اور یہ تازہ ترین کوشش تمام احباب سے اپنی گرانقدر رائے فراہم کرنے کی مودبانہ درخواست کے ساتھ پیشِ خدمت ہے۔
اس کہانی کا محرک محترم افزا خالد صاحبہ کا ہماری گزشتہ ''پوپ کہانی''

:اور اسے رہا کرالیا گیا!'' کے کمنٹس میں شامل یہ لطیفہ بنا''

کسی سائیکل سوار نے راستہ چلتے کسی چھوٹے بچے کو ٹکر مار دی. بچہ زار و قطار رونے لگا. سائیکل سوار نے جلدی سے اس بچے کو چپ کرانے کے لیے دس روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا. بچہ چپ ہوگیا اور جب وہ سائیکل سوار اپنی سائیکل پر پیڈل مار ہی "رہا تھا تو پیچھے سے بچے نے چیخ مار کر پوچھا: "انکل پھر کب آئیں گے؟

ناشتے کی میز پر بیٹھتے ہوئے بیرسٹر جمیل احمد پاشا نے ایک ہاتھ سے بٹر سلائس اور دوسرے ہاتھ سے صبح کا تازہ اخبار اٹھایا لیکن اخبار کے صفحِ اول پر چھپی ایک خبر کی سرخی اور اسکے ساتھ لگی تصویر دیکھ کر سلائس اسکے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

یہ اسی نوجوان کی تصویر تھی جو کل صبح اسکے دفتر آکر صرف اسی سے ملنے کی ضد کرتا رہا اور اپنی ضد پر اڑا رہا اور بلا آخر تھک ہار کے اسے چیمبر میں آنے کی اجازت دے دی گئی۔

کمرے میں داخل ہونے والا وہ ستائس اٹھائس سالہ نوجوان اپنے پیراہن، چہرے و

چال ڈھال سے کسی نچلے متوسط طبقے مگر شریف خاندان کا فرد دکھائی پڑتا تھا، البتہ اسکی آنکھیں گہری سُرخ ہو رہیں تھیں اور ان میں شدید بیچینی مترشح تھی۔

اپنی قمیض کی جیب سے ایک تہہ کیا ہوا لفافہ نکال کر اسکی طرف بڑھاتے ہوئے بولا: یہ سربند لفافہ آپ کل صبح کا اخبار دیکھنے کے بعد کھول کر پڑھ لیجیئے گا۔ آپ کی ایمانداری کی بے پناہ شہرت کے سبب آپ سے یہ امید رکھتا ہوں کہ آپ یہ لفافہ کل صبح کا اخبار پڑھنے سے قبل ہر گز نہ کھولیں گے، بس مجھے اتنا ہی کہنا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ اس سے کچھ کہہ پاتا، نوجوان تیزی کے کمرے کا دروازہ کھول کر نکل گیا۔

اس نے وہ لفافہ میز کی دراز میں ڈالا اور عدالت کے لیے نکل پڑا۔ پھر مصروفیات نے اسکے ذہن سے لفافے کا خیال نکال ہی دیا۔

اخبار کی اُس خبر میں نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ ناشتہ بھول کے اخبار کو ہاتھ میں دبائے ایک دم سے ہی دوڑ پڑا۔ دفتر پہنچ کر میز کی دراز سے وہ

لفافہ ڈھونڈا اور اسکے اندر موجود ایک تہہ شدہ کاغذ باہر نکالا اور اسے کھول کر پڑھنے لگا

:

جناب بیریسٹر صاحب

آج کے اخبار میں یہ خبر پڑھ ہی چکے ہوں گے کہ میں اب اس دنیا سے جا چکا ہوں۔ لہٰذا اب میں آپ کو بعد از مرگ اپنا وکیل مقرر کرتا ہوں۔ اس خط کے ہمراہ بطور ایڈوانس پچاس ہزار روپے کا چیک ہے۔ یہ رقم میں نے اپنی بیوی کے زیورات بیچ کر حاصل کی ہے۔

آپ نے خبر میں پڑھ ہی لیا ہوگا کے میری موت ایک انتہائی تیز رفتار کار سے کچل جانے سے ہوئی۔ آپکو یہ بھی معلوم ہو چکا ہوگا کہ وہ کار ایک بڑے اور امیر ملک کے سفارتخانے کے ایک اہم ترین افسر کی ہے، لہٰذا اب آپکو میرے ورثاء و لواحقین کی جانب سے ہرجانے و خون بہا کا دعویٰ دائر کرنا ہے۔

اب یہ آپ کا کام ہے کہ میری موت کا بڑے سے بڑا ہرجانہ و خون بہا وصول کر کے میرے پسماندگان کو دلوائیں اور اسمیں آپکا بھی فائدہ ہے اور حاصل ہونے والی رقم کا پچیس فیصد بطور فیس کے رکھ سکتے ہیں۔

آخر میں صرف اتنا کہوں گا کہ میں یہ صرف اس لیے کر رہا ہوں کہ جو ملکی حالات ہیں اور اپنی دیرینہ بیروزگاری کے سبب میرے لیے اپنے خاندان کو نانِ شبینہ فراہم کرنا بھی ممکن نہیں البتہ میری یہ قربانی میرے خاندان کے مَصائب دور کر دیگی اور میرا کیا ہے، مر تو میں ہر لحضہ گھٹ گھٹ اور کُڑھ کُڑھ کر رہا ہی ہوں اور جیتے جی تو اپنے خاندان والوں کے لیے شاید کبھی بھی کچھ نا کر پاؤں تو کیوں نا یوں مر کے ہی اُن سب کو کروڑ پتی بنا جاؤں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!!۔

ہم ہیں پاکستانی ہم تو جیتے گے (انشاءاللہ)۔

پوپ کہانی- 5

ٹی وی پر چلتے قومی نغمے کی صدا نے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے تمامتر نفوس کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا تھا اور اسکے ایک ایک بول پر ہر کوئی جھوم جھوم کر اسکے ساتھ اس گیت کو پورے جوش و خروش کے ساتھ زیرِ لب دھرانے میں مشغول تھا۔

!!! ہم ہیں پاکستانی ہم تو جیتں گے ہاں جتیں گے

بس ایک ننھا احمر ہی تو تھا کہ جو ٹکر ٹکر سب گھر والوں کو حیرت و استعجاب سے دیکھے جارہا تھا اور اسکے ننھے سے دماغ میں ایک ہی سوال بار بار گونج رہا تھاکے آخر یہ گزشتہ چند دنوں سے اسکے گھر میں ہو کیا رہا ہے؟

کیا یہ وہ وہی سب لوگ ہیں جو محض چند دنوں پہلے تک کوئی اور ہی راگ الاپ رہے تھے۔

چچا ریاض جو ہر وقت یہ کہہ کہہ کر سارا گھر سر پر اٹھائے رکھتے تھے کہ: "ارے پاکستان میں بھلا رکھا ہی کیا ہے، مجھے تو بس باہر ہی بھجوا دیں"۔ اور اب "ہم ہیں پاکستانی" کہتے ہوئے جو سرخی انکے چہرے پر دوڑ رہی تھی وہ احمر نے اس سے پہلے کبھی نا دیکھی تھی۔

اسکے ابو جسطرح سے دادا جان کے پرانے پاکستانی فلمی گیتوں کو باآوازِ بلند سننے پر جھنجھلاہٹ کا شکار ہوتے اور بے اختیار کہہ اٹھتے کہ: "بھلا ان گھٹیا پاکستانی فلموں اور انکے گھسے پٹے گانوں میں رکھا ہی کیا ہے، ارے کچھ سننا ہی ہے تو بھارتی فلموں کے گانے سنو اور انکی ایک سے ایک بڑھ کر فلمیں دیکھو۔ کچھ بھی ہوں ہماری فلمیں و موسیقی کبھی انکا مقابلہ کر سکیں تھیں اور نہ کر سکیں گیں"۔

اور یہ کہہ کر وہ دادا جان کی ضد میں اپنے فیوریٹ نغمات کی سی ڈی لگا کر "مُنی بدنام ہوئی" اور "شیلا کی جوانی" خوب زور زور بجا کر سننا شروع کر دیتے۔

اسکی امی جنھیں "اسٹار پلس" کے ڈراموں کا تو بس جسے ہوکا ہی لگا ہوا تھا، وہ کھانا کھائے بغیر تو رہ سکتیں تھیں لیکن مجال ہے کہ وہ کبھی کسی ایک بھی ڈرامے کی کوئی قسط ہی چھوٹ جائیں، بھلے ہی اسکے لیے انہیں کوئی تقریب، کوئی

اہم کام اور کوئی ضروری وعدہ ہی کیوں نا توڑنا پڑے۔ اگر جو غلطی سے بھی کہیں کوئی انّھیں پاکستانی ڈرامے دیکھنے کا مشورہ دے ڈالے تو بس اسکی اور پاکستانی ڈراموں کی تو خیر ہی نہیں اور وہ بھڑک کر چیخ اٹھتیں: "یہ روکھے پھیکے پاکستانی ڈرامے بھی بھلا کوئی دیکھنے کی چیز ہیں، انمیں نا ہی جدید تراش خراش کے زنانہ ملبوسات دیکھائے جاتے ہیں اور نا تو سسرالی رشتہ داروں بطورِ خاص ساس و نندوں کی سازشوں سے بچاؤکے ہتھکنڈے سیکھائے جاتے ہیں، جو تیز و طرار سڑک چھاپ زبان ان میں بولی جاتی ہے اور سب سے بڑھ کر ان کیں ایمان افروز مذہبی رسومات دکھائی جاتیں ہیں، باخدا میرا تو ایمان تازہ ہوجاتا ہے"۔

احمر کو سب سے زیادہ حیرت تو ان پاکستانی ٹی وی چینلز ہر ہو رہی تھی کہ بھارتی اداکاروں کو چھینک یا بخار آجانے کی خبر کو بھی بریکنگ نیوز میں پیش کرتے ہیں، ہر پروگرام میں بھارتی فلموں اور اداکاروں کی جے جے کار اور واہ واہ کیا کرتے ہیں لیکن اب جب سے پاکستان اور بھارت کی کرکٹ ٹیمیں وڑلڈ کپ کے سیمی فائنل میں مدِمقابل ہونے کو ہیں، انکا تو لہجہ ہی بدل گیا اور اب وہ اسی بھارت جسکی تعریف کرتے وہ نا تھکتے تھے، نیچا دیکھانے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دے رہے۔

کبھی کبھی تو احمر یہ سوچنے پر ہی مجبور ہو جاتا کہ اس کے گھر والوں کا جو والہانہ ذہنی و قلبی لگاؤ بھارتی فلموں، ڈراموں فنکاروں و موسیقی سے ہے اور جو کراہت انکے چہروں پر پاکستانی فلموں، ڈراموں فنکاروں و موسیقی کے نام پر امنڈ آتی ہے، تو پھر اچھا ہی تھا کے ہم ان سے الگ ہی نا ہوتے۔

اور اب یک بیک اپنے گھر اور ٹی وی والوں کی کایا پلٹے دیکھ کر وہ شدید حیرت زدہ تھا اور اُس وقت اسکے ننھے سے دل میں ایک خواہش ابھری: "اللہ میاں، کچھ ایسا کریں کے پاکستان اور بھارت کی کرکٹ ٹیموں کا یہ میچ کبھی ختم ہی نا ہو اور ہمارا سارا پاکستان ہمیشہ اسی طرح سے یک دل و یک جاں ہو کر پاکستان سے بھرپور محبت کرتا رہے" آمین۔

وصیت

پوپ کہانی- 6

بیرسٹر جلیس الحسن نے نگاہیں ہاتھ میں پکڑے کاغذ سے اٹھا کر کمرے میں موجود افراد پر ڈالیں اور ایک گہرا سانس لیکر اپنا گلہ کھنکارنے کے بعد گویا ہوئے:۔

اب میں آپ سب کے سامنے اپنے مرحوم مؤکل حسیب بیگ کی وہ وصیت پڑھ کر سناؤں گا جو انھوں نے اپنے مرنے سے تقریباً ایک برس قبل لکھوائی تھی:۔

میں حسیب بیگ ولد نصیب بیگ بقائمی ہوش و حواس یہ وصیت اپنے قانونی مشیر بیرسٹر جلیس الحسن کو قلمبند کروا رہا ہوں۔

ایک برس قبل میرے معالجین نے متفقہ فیصلہ سنایا کے میرا مرض لاعلاج ہے اور مجھے بمشکل دو اڑھائی سال کی مدتِ حیات ہی میسر ہے جس پر میں نے فوراً ہی اپنا وصیت نامہ مرتب کروالیا تھا، لیکن گزشتہ ایک سال کے دوران اپنے ماضی پر بھرپور غور و خوص کے بعد میں نے وصیت نامہ کو دوبارہ مرتب کروانے کا فیصلہ کیا۔

بظاہر میں نے اپنی زندگی بھر کی کمائی جو کے اربوں روپوں میں ہے، جمع کرنے کیلیئے کوئی ایسا کام نہیں کیا جسے قانون کے دائرے سے باہر قرار دیا جا سکے لیکن سچ تو یہ ہے کہ میں نے یہ دولت اپنی بیشمار ملوں، درجنوں فیکٹریوں اور سینکڑوں تجارتی و کاروباری دفاتر میں کام کرنے والے کئی ہزار کارکنوں کا جائز حق مار مار کے جمع کی ہے۔

میرے اداروں میں تین چار اسامیوں کا کام محض ایک کارکن بھرتی کر کے لیا جاتا ہے اور بمشکل ایک اسامی کے برابر اجرت ادا کی جاتی ہے، معیاری اوقاتِ کار سے زائد کام لیکر انہیں انکی قانوناً واجب الادا اوور ٹائم سے کہیں کم ادائیگی کی جاتی ہے اور انہیں تمام تر جائز مراعات سے یونین لیڈران و حکومتی اہلکاران کے ساتھ ملی بھگت کر کے محروم رکھا جاتا ہے۔

کارکنان کے لواحقین کے علاج و معالجے اور بچوں کے تعلیمی اخراجات کی جعلی ادائیگیاں دکھا کر لاکھوں کا انکم ٹیکس بچا لیا جاتا ہے اور اس ضمن میں حکومتی اداروں سے ملنے والی مراعات و امدادی رقوم بھی خرد برد کرلیں جاتیں ہیں۔

سالہا سال اسی طریقہ کار کے تحت میں اپنی تجوریوں اور ملکی و غیر ملکی بنک کھاتوں میں دولت کے انبار جمع کرتا چلا گیا۔

اپنے کارکنان کا حق مار مار کے میں نے جو یہ دولت دن رات اکھٹا کی اس نے میری اولادوں کو ناخلف، نافرمان، خودسر، باغی اور مجرمانہ ذہنیت کا حامل بنا دیا ہے، انکی مکمل کفالت میری ہی دولت ہر ہوتی ہے جسکے باعث یہ سب مکمل طور پر ہڈحرام، کاہل اور کام چور بن چکے ہیں اور دنیا کی وہ کونسی برائیاں ہیں جو ان میں نہ ہو۔ آئے دن اپنی دولت کا دریا بہا کر انہیں قانون کے شکنجے سے بری کروانا پڑتا ہے۔

میں نے اپنی اولادوں کو زندگی ہی میں اتنا کچھ دیدیا ہے کے وہ تمام زندگی کچھ کیئے بغیر بسر کر سکتے ہیں، لیکن اب بھی ان کی بھوکی نظریں میری دولت پر گڑیں ہوئیں ہیں اور یہ سب شدید بےچینی کے ساتھ میرے مرنے کے منتظر ہیں۔

لہٰذا ان تمام باتوں کے پیشِ نظر میں اپنے جملہ کاروباری، تجارتی و صنعتی ادارجات، نقد دولت اور منقولہ و غیر منقولہ جائیداد سے اپنے تمام قانونی ورثاء کو عاق کرنے کا اعلان کرتے ہوئے اسے اپنے تمامتر کارکنان کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔

کیا پیرس بھی جہنم جیسا ہی ہے؟

(پوپ کہانی- 7)
وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا، اس وقت جلسہ گاہ میں ایک انتہائی دھواں دھار تقریر جاری تھی اور وہ اسٹیج کے عین سامنے لگے کھمبے جسپر چہار اطراف لاوڈ اسپکرز نصب تھے کے عین نیچے ہی زمین پر بیٹھا تھا۔
تقریر کرنے والے لیڈر کے ایک ایک جملے پر فلک شگاف نعرے بلند ہو رہے تھے تو ایسے میں یہ ممکن ہی نہ تھا کہ کوئی اپنے خیالات کا تسلسل قائم رکھ سکے۔
تقریر کرتے لیڈر نے اچانک کوئی ایسی بات کہہ دی تھی کہ وہ اپنے خیالات کے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں سے باہر آنے پر مجبور ہو ہی گیا، لیڈر کہہ رہا تھا:۔
"میں یقین دلاتا ہوں کے اگر اس الیکشن میں آپ سب نے مجھے اس حلقہِ انتخاب اور میری پارٹی کو ملک بھر سے کامیاب کرکے اقتدار میں پہنچا دیا تو میں آپ کے اس علاقے، جو ہمارا قدیمی و پشتینی سیاسی گڑھ ہے، کو پیرس بنادوں گا"۔

اس بات پر جلسہ گاہ زندہ باد، آوے ہی آوے اور نا تھمنے والیں تالیوں سے گونج اٹھا تھا لیکن اسکے چہرے پر تو بس ایک زہر خند مسکراہٹ ہی رقصاں تھی۔

کوئی 20 یا 25 سالوں پہلے ٹھیک اسی جگہ پر ہونے والے اسی سیاسی پارٹی کے جلسے میں وہ ایک ایسا ہی وعدہ پہلے بھی سن چکا تھا، بس فرق اتنا تھا کہ وہ اس وقت صرف 8 یا 10 سال کا ایک بچہ ہی تو رہا ہوگا اور جس لیڈر نے اُس روز وہاں تقریر کرتے ہوئے وہ وعدہ کیا تھا وہ آج تقریر کرنے والے لیڈر ہی کے سیاسی خانوادے کا سربراہ تھا۔

اس روز کیئے گئے وعدہ کے بعد وہ سیاسی جماعت متعدد بار اقتدار کے ایوانوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی اور خود اس علاقے کے عوام کا تو یہ عالم تھا کہ مذکورہ سیاسی پارٹی اپنی تائید و حمایت کے ساتھ اگر بیچ چوراہے پر ایک کھمبے بھی گاڑ دیتی تو وہاں کے باسی اسے بھے اپنا ووٹ دیکر اسمبلیوں میں پہنچا دیتے۔

لیکن اسکا وہ علاقہ جو کہ ویسے ہی شہر بھر کا سب سے پسماندہ ترین علاقہ شمار کیا جاتا تھا، مزید پسماندگیوں کی تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ پانی، گیس و بجلی، تعلیم، صحت، روزگار اور امن و امان کی بنیادی سہولیات کا تو

ویسے ہی فقدان تھا اب دھیرے دھیرے یہ حال ہوا کہ چوری، ڈکیتی، جبری بھتہ وصولی، اغوا برائے تاوان، ٹارگیٹ کیلنگ، منشیات فروشی، گینگ وار وڈرگ مافیا الغرض وہ کونسا جرم ہے جو اسے علاقے سے منسوب نہ کیا جاتا۔

وہ اکثر سوچا کرتا کہ میں نے اپنے بزرگوں کو کہتے سنا تھا کہ جلد ہمارا علاقہ پیرس بنے والا ہے اور اب میں اپنے بچوں سے یہ ہی کہا کرتا ہوں اور شاید وہ بھی اپنی آنے والیں نسلوں کو یہ ہی دلاسہ دیتے رہینگے لیکن۔۔۔۔۔!!!!۔

میرے علاقے کو جو بنا دیا گیا ہے کیا یہ اُسی وعدہ کی تکمیل ہے؟

کیا میرے علاقے اور جہنم میں اب کوئی فرق باقی ہے بھی یا کے نہیں؟

تو کیا پیرس بھی ہمارے اس جہنم کے جیسا ہی ہے؟

اس نے پیرس تو نا دیکھا تھا، ہاں البتہ اپنے علاقے اور خود اپنی زیست کو لحظہ بہ لحظہ جہنم بنتے ہوئے ضرور دیکھا تھا،اسکا جی چاہتا کہ یا تو وہ خودکشی کر لے یا کسی کو مار دے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ خودکشی کرنے والا

جہنمی ہے، لیکن اب بھی وہ کونسا جہنم کی آگ میں جھلس نا رہا۔

مفلسی کا جہنم، بھوک کا جہنم، بے روزگاری کا جہنم، بیماری کا جہنم، بے چارگی کا جہنم، حقارت و نفرت کا جہنم اور نہ جانے کتنے ہی انگنت جہنموں کی آگ ہر ہر لمحہ اسے جھلسائے دی رہی تھی۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور آس پاس بیٹھے لوگوں پر سے دوڑتا پھلانگتا اسٹیج کے بالکل قریب پہنچ کر اپنی جیکٹ کے اندر ہاتھ ڈالا اور پھر اگلے ہی لمحے ایک خوفناک دھماکہ ہوا اور چاروں طرف تقریر کرتے لیڈر سمیت لوگوں کی لاشیں ہی لاشیں بکھریں پڑیں تھیں۔۔

۔۔۔۔!!!!۔

جائیں کہاں دیوانے لوگ

(پوپ کہانی-8)

اس نے اپنے بیڈ روم کی کھڑکی پر لگے پردے کو ذرا سا سرکا کر درز سے باہر جھانکا۔ اسکی توقع کے عین مطابق آمنے سامنے والے دونوں فلیٹوں کی بالکونیوں میں طوطا مینا کا کھیل زور و شور سے جاری تھا۔

ایک بالکنی سے وہ خوشکل نوجوان مسلسل سامنے والی بالکنی میں کھڑی نوجوان و حسین لڑکی کو اشاروں و کنایوں سے اپنی جانب متوجہ کرنے میں مشغول تھا اور دوسری جانب کے ردِ عمل سے بھی یہ ہی ظاہر ہو رہا تھا کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔

ہاں البتہ اتنا ضرور تھا کہ وہ دونوں ہی تھوڑی دیر کے بعد بڑے ہی محتاط انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ کر یہ اطمینان کر لیتے کہ کوئی انہیں یہ آنکھ مچولی کا کھیل کھیلتے دیکھ تو نہیں رہا۔

اسنے پردہ دوبارہ برابر کر دیا اور اپنی آرام کرسی پر آ بیٹھا۔ اسکے چہرے پر

ایک آسودہ سی مسکراہٹ رقصاں تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اسے یہ سب دیکھ کر بہت اطمینان حاصل ہوا ہو۔ وہ ہر روز ہی اپنے بیڈ روم کی کھڑکی سے یہ منظر دیکھا کرتا تھا اور اب اس سلسلے کو چلے کچھ چار پانچ ماہ ہونے کو آئے تھے۔

ان دونوں کو دیکھ کر اسے ایک بار پھر یہ یقین ہو چلا تھا کہ اب بھی اس خود غرض دنیا میں نا تو محبت ہی ختم ہوئی ہے اور نا ہی محبت کرنے والے ! ان دونوں کو آنکھوں ہی آنکھوں سے سلام و پیام کا تبادلہ کرتے دیکھ کر اسے عجیب سی خوشی محسوس ہوتی اور وہ انہیں نا جانتے ہوئے بھی انکے ملن کی دعائیں مانگا کرتا تھا۔ شاید اسے اِن دونوں میں اپنا ماضی نظر آتا تھا۔۔۔ !!!۔

وہ اور مہتاب بھی تو ابتداء میں اسی طرح سے اپنے اپنے گھروں کی بالکنیوں سے ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں سلام و پیام بھیجا کرتے اور پھر بات بالکنی سے آگے بڑھ کر ریستورانوں، سنیماؤں اور پارکوں میں ہونے والی ملاقاتوں تک جا پہنچی تھی۔ کھائیں تو دونوں ہی نے زندگی بھر ساتھ نبھانے کی قسمیں تھیں لیکن اب یہ اور بات ہے کہ دونوں ہی کے گھر والے اُس محبت کے شدید مخالف ثابت ہوئے اور صنف

نازک ہونے کے ناطے مہتاب اپنے گھر والوں کے دباؤ کے سامنے زیادہ دنوں تک ٹھر نہ سکی اور یوں اسکی پریت پرائی ہو گئی۔

اُس بات کو آج دو عشرے بیت گئے تھے لیکن نا تو وہ اسے بھول سکا تھا نا ہی پھر اسنے کسی اور طرف دیکھنا ہی گوارا کیا، شاید وہ محبت میں بھی وحدانیت کا قائل تھا۔ وہ آج بھی گھنٹوں اُن راستوں اور جگہوں پر جا کر گزارتا جہاں کبھی وہ مہتاب کے ساتھ اپنی زندگی کے حسین ترین لمحات گزار چکا تھا اور اب وہ اس نوخیز جوڑے کو محبت کی انکھیلیاں کرتے دیکھ اپنی نا آسودہ محبت کے جذبے کی تسکین ہی تو کر رہا تھا۔

ان دونوں کی اس معصوم محبت میں اسے اپنی گم گشتہ محبت کی پرچھائیاں نظر آتیں تھیں اور وہ بے اختیار دعائیں کرنے لگتا کہ انکا بھی جنوں ناکام نہ ہو۔

نہ جانے سوچتے سوچتے کتنا وقت گزر گیا اور اسے تو اسکا احساس اس وقت ہوا جب شام کے ڈھلتے سائے نے اسکے کمرے کی تاریکیوں میں اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ "اوہ شام ہو گئی اور مجھے ہاؤسنگ سوسائٹی کے مکینوں کی انجمن کی سالانہ تقریبِ ملاقات میں شرکت بھی تو کرنی ہے"۔

وہ کوئی دو گھنٹوں بعد سوسائٹی کے کمیونٹی ہال جہاں تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا پہنچا۔ ہال کے داخلی دروازے ہی پر اسے انجمن کے عہدراران نے خوش آمدید کہا اور سیکرٹری آگے بڑھ کر اس سے معانقہ کرتے ہوئے بولا: " آخاہ، زہے نصیب ! مسعود احمد صاحب تشریف لائے ہیں، جناب آپ تو بس عید کا چاند ہوئے جاتے ہیں، دیکھ لیں پورے ایک سال بعد اس تقریب میں ہی نظر آئے ہیں"۔

سیکرٹری نے اسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھاما اور یہ کہتے ہوئے اسے ہال میں بیٹھے مہمانوں کی جانب چل دیا: "چلیئے میں آپ کا تعارف سوسائٹی میں نوآمدہ مکینوں سے کروا دوں"۔

سامنے نشستوں پر بیٹھے لوگوں میں اسے وہ دونوں بھی نظر آئے لیکن یہ کیا؟ وہ دونوں تو ایک دوسرے سے دور اور یکسر لاتعلق سے بنے بیٹھے ہوئے تھے۔ فوراً ہی اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ ٹھیک ہی تو تھا، بھلا اب یہاں سب کی موجودگی میں وہ ایک دوسرے سے اپنا تعلق ظاہر کرکے لوگوں کی نظروں میں تو آنے سے رہے۔

ان سے ملیئے"۔ سیکرٹری نے اسی بالکنی والے نوجوان اور اسکے ساتھ کھڑی معمولی صورت کی ایک نوجوان خاتون" کا تعارف کرواتے ہوئے کہا: "یہ ہیں جناب

اور بیگم عدنان "۔اور پھر انکی پچھلی نشستوں پر بیٹھی بالکنی والی خوبرو لڑکی اور اسکے پہلو میں بیٹھے ایک قدرے.بڑی عمر کے شخص کی جانب اشارہ کرتا ہوا بولا: "اور یہ ہیں جناب اور بیگم مشکور"۔

اور پھر سیکرٹری نے اسکی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا: "اور خواتین و حضرات یہ ہیں جناب مسعود احمد" اور مسعود احمد صاحب کا حال یہ تھا کہ اگر کاٹو تو بدن میں چھٹانک بھر خون بھی نا نکلے۔۔۔۔۔۔

طوطا کہانی قصہ اس عاقبت نا اندیش طوطے کا جسنے ناحق جان گنوائی

طوطا کہانی۔ کرکٹ ورلڈکپ اسپیشل

محلے کے چند شریر لڑکے کو.برابر والے محلے کی لڑکیوں کو چھیڑنے اورانکو اپنے چکر میں پھانسنے کی.بڑی.بڑی ڈینگیں مارتے سن سن کر ایک روز وہ بھی اسی محلے کی جانب چل دیا اور پھر اُس محلے کے لڑکوں نے اسکی حرکات دیکھ کر وہ وہ ٹھکائیاں لگائی کہ بس خدا کی پناہ اور پھر اُس دن کے بعد سے اُس تو کیا خود اپنے محلے کی لڑکیاں، اسے لڑکیاں کم ماں بہنیں زیادہ دکھائی دینے لگیں۔

چلیں خیر سے اِن صاحبزادے کا قصہ تو ٹھکائی اور پھر ہفتوں سِکائی تک ہی محدود رہا لیکن اُس کمبخت، کوتاہ نظر و عاقبت نا اندیش طوطے کا کیا کیجئے جو کرکٹ ورلڈکپ پاکستان کے جیتنے کی پیشن گوئی کرکے خدائی خدمتگار بننے چلا تھا اور شیو سینا کے ہاتھوں اپنی جان ہی گنوا بیٹھا۔

ہاں اگر پاکستان فائنل نا سہی سیمی فائنل ہی جیت جاتا تو اس نامراد طوطے کا خون رائیگاں نا جاتا اور ممکن تھا کہ پاکستان سے والہانہ محبت کے صلے میں اسے حکومتِ پاکستان شہیدِ کرکٹ گردانتے ہوئے نشانِ حیدر سے نہ سہی، کسی

دیگر سول ایوارڈ ہی سے بعد از مرگ ہی نواز دیتی کیونکہ یہ ہمارے یہاں کا خاصہ ہے کہ عموماً مرنے کے بعد ہی کسی کو اس قابل سمجھا جاتا ہے۔

لیکن صد افسوس کے اس کم عقل طوطے نے اک بے پرواہ سجن کے ہاتھوں کھجل خوار ہو کر اور اک سیاں اناڑی کے چکر میں اپنی متاعِ حیات گنوا دی۔ کاش کہ پرائی آگ میں کودنے والے اس طوطے نے بزرگوں ہی کے کہے "جسکا کھاؤ اسی کے گن گاؤ" کو کچھ جان کر ہی اپنی زندگی اور عاقبت ہی سنوار لی ہوتی، عاقبت اس لیے کہ پاکستان کی شکست کے بعد غلط پیشن گوئی غلط ثابت ہونے پر داروغہِ جنت نے اسے درے لگاتے ہوئے حرام موت مرنے کے جرم میں داروغہِ جہنم کو اس تاکید کے ساتھ حوالے کیا کہ اس ناہنجار کو جہنم کے سب سے زیریں طبقے میں داخل کیا جائے۔

باخبر زرائع نے بتایا ہے طوطوں کی عالمی برادری نے اِس طوطے کے عبرت ناک انجام سے سبق حاصل کرتے ہوئے نہ صرف یہ تہیہ کرلیا ہے کے آئندہ کوئی بھی طوطا کبھی اُس ملک کے خلاف کوئی پیشن گوئی نا کریگا جسکا کہ وہ خود باسی ہے اور اپنی آئندہ نسلوں تک اس سبق کو منتقل کرنے کیلیئے یہ لازم قرار دیا گیا ہے اب سے ہر طوطا بجائے یہ رٹنے کے "میاں مٹھو چوری کھاؤگے" یہ کہا کریگا کے "میاں مٹھو جھوٹی پیشن گوئی کروں گے؟" جسے سن کر انکی نسلِ نو کو اس

طوطے کا عبرت ناک انجام ہمیشہ یاد رہیگا۔

ہمارے خیال میں اس طوطے کے انجام سے تو ہم پاکستانیوں کو سبق حاصل کرنا چاہیے کہ ہمارا تعلق جس زمین سے ہے اگر ہم نے اسی سے وفا نہ کی اور ہر معاملے میں اوروں ہی کے گن گاتے رہے تو ہمارا بھی حال اس طوطے جیسا ہی ہو سکتا ہے۔

زرا سوچیئے کہ اگر کہیں اس کم عقل طوطے نے بھارت کے جیتنے کی پیشن گوئی کردی ہوتی تو یہ شیو سینا جو اسکی قاتل بن گئی، سیمی فائنل کے بعد اسی طوطے کو بھگوان کا کوئی اوتار مان کر اسکی پوجا پاٹھ شروع کر دیتی اور اسے خالص سونے کے پنجرے میں رکھا جاتا اور کھانے کو صبح و شام دیسی گھی کی چوری اور پینے کو دودھ ملا کرتا اور جب وہ مرتا تو اسکے جسم کو حنوط کرکے اسے بھارت کے سب سے بڑے مندر میں بھگوان کا درجہ دیکر اس پر دن رات چڑھاوے چڑھائے جاتے اور اسکی مورتیاں بننا شروع ہو جاتیں اور گھر گھر میں پائیں جاتیں۔ لیکن اس نمک حرام طوطے کے جی میں نا جانے کیا سمائی کہ پاکستان کے حق میں ایک بار نہیں پانچ بار ورلڈ کپ کے فاتح ہونے کی پیشن گوئی کر کے کتا نا ہونے ہوئے بھی کتے کی موت مارا گیا۔ بے وقوف اور پاگل کہیں کا۔۔۔۔

۔ !!!!۔

بھارت میں تو اسے مار ہی دیا گیا اور بس کہانی ختم! لیکن اگر یہ کم عقل طوطا جو کہیں پاکستان میں ہوتا اور اس کی پیشن گوئی اسطرح سے جھوٹی پڑتی تو وہ ہم پاکستانیوں کے ہاتھوں جس ہزیمت کا شکار ہوتا اسکے تو عشر عشیر کا بھی شیو سینا والے مظاہرہ نا کر سکے۔ سب سے پہلے تو سیمی فائنل ہارتے ہی اسکے خلاف دروغ گوئی اور جھوٹی پیشن گوئیاں اور فال نکالنے کے قطعاً غیر اسلامی و غیر شرعی فعل پر اسے دائرہِ اسلام سے خارج اور کافر کہہ کر "واجب القتل" قرار دے دیا جاتا اور خود کش حملہ آور اسکی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔ کم از کم دو چار ماہ تک باقاعدگی کے ساتھ بعد نماز جمعہ ریگل چوک صدر سمیت ملک بھر کے چھوٹے بڑے چوکوں پر اسکے خلاف احتجاجی مظاہرے کیئے جاتے جسمیں شامل مشتعل افراد پہلے تو یہ نعرے لگاتے:۔

۔"جو قوم کا غدار ہے وہ موت کا حقدار ہے"۔

اور پھر اشتعال کی آخری حدود کو پہنچ کر سرکاری و غیر سرکاری املاک اور پبلک و نجی ٹرانسپورٹ کو آگ لگا اپنے اپنے زورِ بازو کے مطابق ملک و قوم کی خوب خدمت کرتے۔

اصل بات تو ہم آپکو بتاتے ہیں جو ان بے چارے شیو سینا والوں کی پتہ ہی نا تھی ورنہ وہ اس معمولی سے جاہل طوطے کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ کر کبھی اسے طوطے کو پاکستانی عوام کی آنکھوں میں ہیرو بننے کا موقعہ ہی نا دیتے۔ دراصل انکو یہ پتہ ہی نا تھا کہ طوطے تو ہوتے ہی "طوطا چشم" ہیں اور جسکا کھاتے ہیں اسی سے آنکھ پھیر لیتے ہیں اور چاہے کوئی انہیں سونے کے پنجرے ہی میں رکھ کر سونے کے نوالے ہی کیوں نا کھلائے، جہاں موقعہ ملا وہیں نگاہیں پھیر کر اڑا جاتے ہیں۔ لہذا اگر وہ اس قسم کو کوئی بکواس کریں بھی تو درگزر سے کام لیا جائے اور اسے کم عقل اور نا سمجھ پرندہ سمجھ کر اسکے قول و فعل کو دیوانے کی بڑ سے زیادہ اہمیت نا دی جائے۔

بطورِ ثبوت آپ اسی طوطے کو لے لیجئے، احمق نا ہو تو، اگر اس قسم کی احمقانہ ڈینگیں نا مارتا تو آج کسی پنجرے میں ہی سہی کم از کم زندہ تو ہوتا اور اگر جو کہیں اس نے بھارتی کرکٹ ٹیم کے حق میں کوئی پیشن گوئی کرڈالی ہوتی تو سیمی فائنل کے بعد تو اسکی تو پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہوتا۔

زرا اس طوطے کی عظیم حماقت کا اندازہ تو لگائیں کے جس ٹیم کے جیتنے کی اسنے

پیشن گوئی کرکے اس ٹیم کی ہار جیت کے فیصلے سے قبل ہی موت کو گلے لگا لیا وہی ٹیم ہار کے بھی خادمِ و وزیرِ اعلیٰ پنجاب کی جانب سے پانچ پانچ لاکھ روپے فی کھلاڑی کے مستحق قرار پائے ہیں اور خود اسے نا معلوم پانچ انچ.برابر قبر کی زمین بھی میسر آئی کہ نہیں پا پھر شیو سینا والوں نے ہندو دھرم کے مطابق شمشان گھاٹ میں اسکی چتا ہی جلا ڈالی۔

وہ جو کہتے ہیں نا کہ عافیت اسی میں ہے کے آپ جو ہیں وہی رہیں، باالفاظِ دیگر.بڑے بوڑھے کچھ یوں بھی کہہ گئے ہیں:۔

کوا چلا ہنس کی چال اور اپنی بھی بھول گیا

اور اُن طوطے صاحب کے ساتھ تو کچھ یوں ہوا کے:۔

طوطا چلا پاکستانیوں کی چال اور اپنی جان سے ہی گیا!۔

اے حمید۔۔۔ یادگار کہانیوں اور لافانی کرداروں کے تخلیق کار

اُس کہانی کے ہیرو ''عنبر'' کو کسی نے یہ دُعا یا بد دُعا دی ہوتی ہے کہ وہ کبھی نہ مرے گا اور پھر آج سے پانچ ہزار سال قبل فرعونِ مصر کے زمانے میں پیدا ہونے والا وہ نوجوان وقت کے دھارے میں بہتا، تہذیب و تمدن کے عروج و زوال، قوموں و سلطنتوں کے ابھرنے و ڈوبنے اور عظیم شخصیتوں و اکابرین کی آمد و رخصت کے احوال کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا کرتا بلاآخر عصرِ حاضر میں آ پہنچتا ہے!۔

اُس کہانی کا ہیرو ''انسپکٹر احمر'' ایک نیک روح کی مدد سے تاریخ کے گہری کھائیوں اور اندھیرے غاروں میں گم پراسرار اور ناحل پذیر سمجھ کر داخلِ دفتر کیئے جانے والے کیسوں کی اسرِ نو تفتیش کے لیے ماضی میں واپس جا کر انمیں چھپے رازوں کو افشاں کرتا ہے!!۔

اُس کہانی کا ہیرو ''ندیم'' اسلامی ممالک کی سیاحت کے شوق میں کم عمری ہی میں اپنے گھر سے بھاگ کر خود اپنے بل بوتے پر تنِ تنہا نکل کھڑا ہوتا ہے اور پھر ہر منزل و مقام سے اپنے گھر والوں کو اپنے خطوط کے ذریعہ سے اپنے خوفناک سفری حالات سے آگاہ کرتا چلا جاتا ہے!!!۔

اُس کہانی کا ہیرو ٹین ایجر ہیرو ''عمران'' جسے دنیا بھر کی سیاحت کا شوق ہوتا ہے اپنے ایک ہم عمر دوست ریحان کے ہمراہ لنڈی کوتل کے راستے افغانستان، ایران اور ترکی سے ہوتا ہوا، یورپی ممالک اور پھر امریکا تک جا پہنچتا ہے۔ وہ دونوں تمام راستے تگ و دو کرتے، کبھی محنت و مشقت تو کبھی کسی سوپر اسٹور پر عارضی ملازمت اختیار کرکے اپنا زادِ راہ اکھٹا کرتے ہیں اور بذریعہ خطوط اپنے اہلِ خانہ کو اپنے اس انوکھے ایڈونچر سے لمحہ نہ لمحہ آگاہ کرتے جاتے ہیں اور جسکے دوران انہیں نا صرف بے پناہ دشواریوں اور مصائب بلکہ خطرناک جرائم پیشہ افراد کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے لیکن وہ ہر دشواریوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے منزل پر منزل مارتے چلے جاتے ہیں !!!۔

اُس کہانی کا ہیرو برٹش انڈیا کے دوٗر کا ''انسپکٹر بہرام'' ہے جو ایک جنونی ڈاکٹر جو قبروں سے مرنے والوں کے انتہائی صحتمند اور مضبوط اعضاء کو حاصل کرکے انہیں جوڑ کر ایک ایسا انسان تخلیق کرتا ہے جو کہ جسمانی طور پر بے پناہ قوت و صلاحیت کا حامل ہے اور اسکے سر میں ایک مرے ہوئے انتہائی ذہین سائنسدان کا دماغ لگ کر اسے آسمانی بجلی کے لاکھوں میگا وولٹس کا جھٹکے سے زندہ کرکے اسے انسانیت کی بھلائی کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے لیکن بدقسمتی سے وہ جنونی ڈاکٹر سارے مراحل کامیابی سے طے کرنے بعد جب مرحوم

سائنسدان کا محفوظ شدہ دماغ چرانے کیلیئے پہنچتا ہے تو غلطی سے ساتھ رکھے ایک پاگل و جنونی قاتل کا دماغ اٹھا لاتا ہے اور پھر وہ لاش زندہ ہو کر تباہی و بربادی مچانا شروع کردیتی ہے، کا نہ صرف جوانمردی اور کمال بہادری کے ساتھ پتہ لگاتا ہے بلکہ اسکا خاتمہ بھی کردیتا ہے!!!!۔

متذکرہ پانچوں طویل سلسلہ وار کہانیاں بلترتیب ''موت کا تعاقب''، پرانے قلعے کی فائل''، ''ندیم کا خوفناک سفر نامہ''، ''عمران ریحان ایڈونچر'' اور ''لاش زندہ ہو گئی'' جسے اے حمید کے جادو اثر قلم سے وجود میں آئیں اور ہم نے اپنے بچپن میں انگنت بار یہ تمام سلسلہ وار کہانیاں نہ صرف پڑھیں بلکہ یہ تمام کی تمام مکمل سیٹس کی صورت میں ہماری ذاتی لائبریری کی زینت تھیں۔

لیکن اپنے بچپن سے لیکر آج تک ایک ہی سوال ہمارے ذہن میں گردش کرتا رہا:۔

ان کہانیوں کے ہیروز یعنی ''عنبر''، ''انسپکٹر احمر''، ''ندیم'' ، ''عمران'' اور ''انسپکٹر بہرام'' محض اے حمید کے تخیلات میں جنم لینے والے چند کردار ہی تھے یا پھر سچ مچ کے زندہ جاگتے، گوشت پوشت کے احساسات و جذبات کے حامل لوگ تھے یا پھر اے حمید صاحب نے حضرتِ انسان کی چند انہونی خواہشات مثلاً:۔

وہ ابدی زندگی حاصل کرے اور ہمیشہ زندہ رہ کر رہتی دنیا تک کے واقعات کا چشم دید گواہ بن جائے !۔

ماضیِ قریب و ماضیِ بعید میں خود جا کر وقوع پذیر ہونے والے تمام پراسرا واقعات کے اصل راز کی حقیت جان لے !!۔

دنیا کے گوشے گوشے اور چپے چپے کی ناصرف سیاحت کر لے بلکہ قدم قدم پر پھیلے قدرت کے نظاروں، راہوں کی بھلبھلیوں، ہر رنگ و نسل کے انسانوں کو دیکھ اور پرکھ لے !!!۔

مافوق الفطرت اور غیر مرئی قوتوں کو تخلیق و تسخیر کرنا اور اگر ان سے انسانیت کو خطرہ لاحق ہو تو اسے کیفرِ کردار تک پہنچا کر انسانیت کا دفاع کرنا !!!!۔

جیسی انسانی شعوری و لاشعوری خواہشات کے تابع اپنی ذاتی آسودہ و ناآسودہ خواہشات کو اپنے قارئین کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور دراصل انکے یہ تمام ہیروز انکی اپنی ہی شخصیت میں تہہ در تہہ پنہاں زیلی شخصیات ہی کا

پرتو ہیں۔

ہم یہاں پڑھنے والوں کو یہ بھی بتاتے چلیں کہ وہ خواہ ''موت کا تعاقب'' کا موت کو شکستِ فاش دینے والا لافانی کردار ''عبنر'' ہو یا ''پراسرا قلعے کی فائل'' کا ''انسپکٹر احمر'' ہو جو ماضی کا مسافر بنکر کبھی سالوں، تو کبھی عشروں تو کبھی صدیوں قدیم رازوں پر سے پردہ اٹھاتا ہے یا ''ندیم کا خوفناک سفر نامہ'' کا کمسن ''ندیم'' ہو جو تن تنہا اسلامی ممالک کی سیاحت کرنے کو نکل کھڑا ہوتا ہے یا ''عمران ریحان ایڈونچر'' کا ٹین ایجر مہم جو اور ایڈونچر پسند ''عمران'' ہو یا ''لاش زندہ ہو گئی'' کا برٹش انڈیا کا بہادر و دلیر ''انسپکٹر بہرام'' ہو۔ یہ سب کے سب کردار انتہائی ایماندار، اصول پرست، قول و کردار کے پکے وسچے، مظلوم کی مدد و دادرسی کو ہم وقت سر دھڑ کی بازی تک لگانے کو تیار رہتے ہیں۔
بطور ایک دیرینہ قاری ہمیں ایسا محسوس ہوتا کے جناب اے حمید کے تخلیق کردہ مذکورہ بالا تمام تر کردار دراصل خود اپنی بنجارہ و درویش فطرت، سیاحانہ طبعیت ایماندارانہ و اصول پرستانہ شخصیت اور انکی ایڈونچرس و رومان پرور زینت ہی کے متفرق پہلو ہیں۔

یہ سب کہانیاں تو ہمارے بچپن کا حصہ تھیں، لیکن پھر جُوں جُوں آتش جوان ہوتا گیا، ہم اُس اے حمید سے بھی آشنا ہوتے گئے جو پُھولوں، خوشبوں، تتلیوں، خوش رنگ پرندوں، ابلتی چائے کی بھاپ اڑاتے اور خوشبو بکھرتے سماوار، رنگون و برما کی گرجتی برستی ہوئی بارشوں میں درختوں کی گھنی شاخوں سے چھتی ہوئی گلیوں اور گھنے جنگلات کے رومان انگیز تذکروں، عالمی جنگوں کے کنیوس پر بکھریں رومانٹک داستانیں اور دیس بدیس کی حسیناؤں کے حسین احوال اپنے جادو اثر قلم سے تخلیق کر کے ان میں اپنے مخصوص رومان انگیز اسلوب کی چاشنی گھول گھول کر اپنے قاری کو ایک ایسے منفرد رنگ، نور و آھنگ سے روشناس کرواتے ہیں کہ جو اسے کسی خوابناک جہانِ دیگر کی سیر کرواتا ہے اور اسپر اس جہانِ نو کے وہ وہ نہاں دریچے وا ہوتے چلے جاتے ہیں جو پھر زیست کے ہر لمحہ و لحضہ اسکے احساسات میں اسکے دوش بدوش رہ کر اسکے زوقِ جمالیات کو مہمیز بخش کر اسے زندگی اور اسکی رنگینیوں اور اس رنگ برنگی دنیا جہاں ہر قدم پر نت نیے پھول، خوشبو، تتلیاں، رنگ برنگے پرندے، روح میں اترتی بارشیں اور نا جانے کیا کچھ اور موجود ہیں، سے لطف اٹھانے اور ان میں اپنی زات کو تیاگنے کا فن و ہنر سکھاتے چلے جاتے ہیں۔

منٹو نے کہا تھا:۔۔"اے حمید تم بکواسی ہو، کھمبے کو دیکھ بھی رومانٹک ہوجاتے ہو"۔

اور ہم (ناچیز اور کچھ کہنے کے لائق نا ہوتے ہوئے بھی) کہتے ہیں:۔۔ ''اے حمید کی کتابیں پڑھ کر تو کوئی کھمبہ بھی رومانٹک ہو جائے''۔

ہم سب کا یہ محبوب مصنف اے حمید پچھلے کچھ عرصے سے بستر علالت پر دراز ہے۔ آئیں ہم سب مل کر دعا کریں کہ پھولوں، خوشبوں، تتلیوں، پرندوں، بارشوں، جنگلوں اور ساری دنیا سے محنت کرنے اور اس محبت کا اپنی تحریروں میں برملا اظہار کرنے والے اس عظیم قلمکار کو خدا اتنی بھرپور صحت اور اتنی طویل عمر عطا فرمائے کہ ہم اب تک اس کے جادوئی قلم سے نکلے جتنے حسین اور پراثر الفاظ پڑھ چکے ہیں، اس سے بھی کہیں گنا اور زیادہ پڑھ سکیں آمین۔

اے حمید۔۔۔۔لو وہ چل دیئے

اے حمید۔۔۔۔ لو وہ چل دیئے اک جہانِ نو کے پھولوں، پتوں، پرندوں، خوشبوؤں اور تتلیوں سے ملنے۔

رات کافی گہری ہو چکی تھی، مال روڈ پر ایک ہو کا سا عالم طاری تھا۔ شاید روزافزوں بڑھتی ہوئی دہشت گردی اسکا سبب تھی یا پھر زندہ دلان۔لاہورِ، شہر میں دن دہاڑے ہونے والیں ڈکیتیوں اور لوٹ مار کی وارداتوں سے شدید نالاں ہیں اور ویسے یہ تو وقت بھی آدھی رات کا تھا، لٰہذا انہیں اتنی رات گئے شہر کی سڑکیں ناپنے سے بہتر اَپنے تَیئیں گھروں میں دُبکے رہنے میں ہی عافیت محسوس ہوئی ہو گی۔

پھر آج تو کارپوریشن کی جانب سے نصب شدہ کھمبوں کے قُمقُمے بھی اجالوں کی بجائے اندھیرے ہی اُگل رہے تھے۔ اندھیرا، سناٹا اور ویرانی، ایک آسیب کی مانند ساری مال دوڑ پر مسلط تھا۔

اچانک مال روڈ پر قائم ایک بہت.بڑے کتب خانے کے صدر دروازے کے پاس ٹمٹماتے تاروں کی دھیمی دھیمی سی روشنی میں چند تاریک سائے حرکت کرتے نظر آئے۔

وہ تمام سائے اُس کتب خانے ہی سے برآمد ہوئے تھے اور انکی تیز رفتار چال اس امر کی غماز تھی کے وہ سب جلد ہی کہیں پہنچنا چاہتے ہیں۔ مسلسل کافی دیر تک چلنے کے بعد وہ تمام سائے لاہور کے میانی صاحب قبرستان میں داخل ہو رہے تھے۔ رات کے اُس پہر میں قبرستان ایک عجب ہیبتناک ماحول پیش کر رہا تھا، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے تمام محو۔استراحت اہلِ قبور گھپ اندھیرے ہی کو اپنی چادر بنا کر اسے ہی اوڑھے سو رہے ہوں۔ دُور قبرستان کے گورکن کی کوٹھری کے بند کواڑوں کے عین اوپر پیشانی پر جلتا ہوا ایک ذرد کمزور سا بلب اپنی ملگجی سی روشنی سے اندھیروں سے لڑنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ گھپ اندھیروں سے سر پٹکتی ہوئی ذرد ملگجاہٹ قبرستان کے ماحول کو مزید خوفناک بنا کر پیش کر رہی تھی اور وقفے وقفے سے قبرستان کے مختلف کونوں سے اٹھتیں سگان۔آوارہ کی صدایں ماحول کی سنگینی کو مزید دوچند کر دیتی۔

وہ تمام سائے ایک تازہ قبر کے سامنے آجمع ہوئے۔ اس کچی قبر کی مٹی بھی ابھی خُشک نہ ہوئی تھی، اس پر بکھریں گلاب کی پتیاں بھی پوری طرح سے نا مرجھائیں تھی اور بعدِ تدفین لگائیں گئیں اگربتیاں گو کے بجھ تو ضرور گئیں تھیں لیکن اب بھی قبر کے اطراف کا ماحول انکی مہک سے معطر ہو رہا تھا۔

تاروں کی دھیمی روشنی میں اُن تمام نفوس کے چہروں پر ثبت غم و اندوہ کی گہری پرچھائیوں کو بآسانی پڑھا جاسکتا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ تمام اہلِ قبر سے کوئی خصوصی نسبت رکھتے ہوں اور اُس سے اُنکا کوئی انتہائی قریبی رشتہ تھا۔

ان سایوں میں سے ایک نوجوان نے اپنے ساتھیوں کو فاتحہ خوانی کا اشارہ کرتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اٹھاکے باآوازِ بلند فاتحہ خوانی کرنا شروع کردی اور اسکے دیگر ساتھی بھی اسکی کی تقلید میں فاتحہ خوانی کرنے لگے۔

فاتحہ خوانی سے بعد از فراغت سب قبر ہی کے ارد گرد ادب و احترام کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے زمین پر براجمان ہوگئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی مزار پر مجاورین کی جماعت عقیدمندوں کی آمد سے قبل اپنے پیر و مرشد کو اپنا اجتماعی نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کی غرض سے اکھٹے ہوئے ہوں۔

فاتحہ خوانی کروانے والا نوجوان جسکے چہرے سے وقار، سنجیدگی اور متانت جھلکتی تھی، قدرے طویل قامت، ہلکے سنہرے بال، گہری نیلی آنکھیں اور رنگت کھلتی ہوئی سی تھی، دیگر حاضرین سے مخاطب ہوا:۔

میں اور آپ سب ہی جناب اے حمید مرحوم و مغفور کے لافانی قلم کی نوک سے ٹپکے" ہوئے چند کردار ہیں اور دیکھا جائے تو وہ ہم سب کے خالق تھے لیکن فرق صرف اتنا ہے کے خالقِ حقیقی کی ابدیت اور مخلوق کا مٹنا ایک امر لازم ہے، جبکہ یہاں تو معاملہ ہی الٹ ہے، کہاں خالق خود تو جسمانی طور پر فنا ہوگیا لیکن اپنے تخلیق کردہ کرداروں کو ابدیت عطا کرگیا، شاید انہیں یہ حقیت معلوم تھی کہ ایک نا ایک روز تو انہیں جانا ہی ہوگا تو کیوں نا میں کچھ ایسے لافانی کرداروں تخلیق کر جاؤں جو کہ نا صرف خود لافانی ہوں بلکہ میرا نام بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ و تابندہ رکھیں"۔

اس نوجوان نے فرداً فرداً شرکاء کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے، سلسلہِ بیان جاری رکھا:۔

میں اور میرے ساتھی ایک کُتب خانے کی کتابوں سے نکل کر اپنے تخلیق کار کو" خراجِ تحیسن پیش کرنے کے لیے یہاں آنے کی سعادت حاصل کرکے ہیں، یہ دراصل ہماری خوش نصیبی ہے، کیونکہ جناب اے حمید ہی لکھی ہوئی ان ہی انگنت کتابوں میں شامل رنگ.برنگے پھول، حسین چہچہاتے پرندے اور ان پرندوں کی چہکار سے گونجتے گھنے درختوں کی سبز شاخوں سے چھپتے ہوئے جنگل، ان جنگلوں کی ہواؤں

اور فضاؤں میں لہراتے ہرے بھرے، سرسبز و شاداب درخت و پودے، حتیٰ کے ان درختوں پر لگا پتہ پتہ اور ان پتوں کی اوٹ میں گھونسلے بنا کر رہنے والے پرندے، ملکِ دمشق کے قہوہ خانوں میں فرشی نشِستوں پر گاؤ تکیوں سے ٹیک لگا کر گرما گرم بھاپ اڑاتے قہوے کی پیالیوں سے رہ رہ کر چسکیاں بھرتے اور تارہ بھرے ہوئے حقوں سے کش لگا لگا کر اس کے دھویں سے قہوے خانے کی فضاؤں کو دھندلاتے، کسی اجنبی و جہاںِ نامعلوم کے وہ سب مُسافِران، قاہرہ کے قدیمی و چھتے ہوئے طلسماتی بازار جہاں کاندھے سے کاندھا چھلتا ہے، کی رونقوں سے دل بہلاتے وہ سب راہگیر، وہ سب آبشار، تالاب، ندیاں، جھیلیں دریا و سمندر اور ان میں چلتے بادبانی جہاز اور ان جہازوں کے عرشوں پر کھڑے افق پار کے دھندلکوں میں بناء کسی مقصد تکتے وہ مسافر اور تو اور ان ہی سمندروں مین اپنے ٹوٹے پھوٹے جہازوں میں بھٹکتے بحری قزاق اور ان ہی سمندروں سے لگے وہ سب جزائر اور ان میں بسنے والے غیر مہذب قبائل کے جن پر آج تک مُہذِب دنیا کوئی سایہ تک نہیں پڑا اور ہاں پیرس کی گلیوں میں بھٹکتا ہوا وہ بے روزگار مُصوّر بھی جسے جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں و کساد بازاریوں نے فٹ پاتھ پر چلتے پھرتے راگیروں کے پنسل اسکیچ بنا کر اپنا پیٹ پالنے پر مجبور کر دیا تھا، جنگِ عظیم دوئم میں برما فرنٹ پر گورے جرنلوں کی کمانڈ میں اتحادی فوجوں کی جانب سے لڑتے ہوئے وہ سب کے سب کالے دیسی فوجی اور دروان جنگ وہ نوخیز مقامی گہری سانولی رنگت والیں دوشیزائیں

جن کے گھنے اور کالے سیاہ بال ناریل کے تیل سے چیپڑے ہوئے ہوتے ہیں اور جو اپنے جوڑوں میں چمپئی رنگ کے پھول اڑستیں ہیں، پانچ ہزار سال قبل مصر کے قدیم شہر تھیبس میں آبادی سے کافی دور بیچ صحرا فرعونِ مصر کے اپنے حکم پر خود اُسی کے اِس جہاںِ فانی سے کوچ کر جانے کے بعد اُسکی آخری آرام گاہ قرار پانے والے اہرامِ مصر کی تعمیر میں مصروف وہ تمام پتھر تراش اور بطورِ خاص رات کے سناٹے میں صحرا کی وسعتوں میں گونجتیں ان پتھر تراشوں کی چھینیوں کی چھن چھناہٹ، وہ نسطور عرف عینک والا جن اور وہ "ٹرے بی ناٹ" کا نعرہ لگاتا زکوٹا جن اور ہامون جادوگر اور چڑیل بل بتوڑی، ہمیشہ حیات پانے والا عنبر الغرض اے حمید کے قلم سے نکلا اور اس قلم کی سیاہی کے خشک ہونے سے بھی پہلے شہرت کے آسمانوں کو چھو لینے والا وہ کون سا کردار، واقعہ، مقام، جگہ اور میری بیان کردہ وہ تمام تر چیزیں جو آج یہاں اپنے اس عظیم تخلیق کار اور نابِغۂِ روزگار مصنف کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے حاصری دنیے نا آنا چاہتے ہوں لیکں سچ تو یہ ہے کے اگر اے حمید صاحب کیں لکھیں ہوئیں سبھی کتابوں کے جملہ کردار و لوازمات، ان کے پھول، تتلیاں، خوشبویں، جنگل، درخت، پتے، سماور، قہوہ خانے، چھتے ہویے قدیمی بازار اور انمیں چلتے پھرتے سودا بیچنے والے سوداگر اور ان سے حیل و حُجّت کرتے گاہک سب ہی یہاں آجائیں تو یہ قبرستان تو کیا یہ سارے کا سارے شہر بھی ان سب کے لیے بہت ہی چھوٹا پڑ جایئگا اور اُن سب کی فوجِ ظفر موج کو سنبھالنے کے لیے کئی

ممالک کی افواج بھی شاید کافی ثابت نا ہو سکے''۔

اتنا کہہ کر نیلی آنکھوں والا وہ نوجوان اک لحضہ رکا اور پھر گویا ہوا:۔
اے حمید کے دوست عطا الحق قاسمی اپنے کالم میں لکھتے ہیں کہ:۔''اے حمید سے میری'' آخری ملاقات آج سمن آباد لاہور کی مسجدِ خضریٰ کی گراؤنڈ میں ہوئی جہاں ایک چارپائی پر انکا جسدِ خاکی سفید کفن میں لپٹا ہوا پڑا تھا، میں ان کے پاس گیا، میں نے پوچھا''حمید صاحب ! آپ جا رہے ہیں؟'' انہوں نے کہا''ہاں میں جا رہا ہوں لیکن میں پھولوں، خوش رنگ پتوں، رنگ برنگے پرندوں، اور یادوں کے دریچوں سے تمھیں ملنے آتا رہوں گا۔۔۔۔۔۔ میرا انتظار کرنا!''۔
کہنے کو تو اے حمید صاحب نے کہہ دیا کہ میں پھولوں، پتوں، پرندوں سے ملنے آؤں گا'' لیکن اب وہ کیوں یہاں آنے لگے ؟'' ''جہاں وہ گئے ہیں وہاں کے پھولوں، تتلیوں، خوشبوؤں، درختوں، پتوں، جنگلوں، قہوؤں اور چائے کے ساوروں کا بھلا اس عارضی جہانِ رنگ و بو سے کیا مقابلہ ؟ اور ہم آپ سب ان کے رومانچک مزاج سے بخوبی آشنا ہیں، لہٰذا ان کی رومان پسند طبیعت کو وہاں کی

رومان پرور فضاء ایسے مقید کریگی کہ وہ سدا کے لیے وہیں کے ہو رہینگے اور اپنی برخُواست شدہ محافل کو نیاء رنگ و روپ دیکر کچھ یوں بپا کریں گے کے اُس کا ثانی ڈھونڈے بھی اِس جہاںِ فانی میں میسر نہیں آسکتا۔

گلوکار اخلاق احمد مرحوم کی بارھویں برسی پر کچھ باتیں کچھ یادیں

یہ 70ء کی دھائی کے اواخر کے سالوں زکر کا ہے۔ ہم کراچی میں کسٹم ہاؤس سے زرا سا ہی آگے موجود کے پی ٹی گراؤنڈ کے عین سامنے والے علاقے پنجابی کلب، کھارادر میں رہا کرتے تھے۔ اکثر اپنے والدِ مرحوم صدرالدین بھایانی کے ہمراہ انکی لال ہنڈا ففٹی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر قریبی واقع نیٹی جیٹی پل پر سے ہوتے ہوئے مولوی تمیزالدین خان روڈ (ایم ٹی خان روڈ) جسے عرف عام میں اولڈ کوئینز روڈ کہا جاتا تھا، ہمارا گزر ہوا کرتا تھا۔

والدِ مرحوم کو نہ جانے وہ سڑک کیوں اتنی اچھی لگتی تھی کہ اکثر و بیشتر اپنی سواری وہیں سے گزارا کرتے اور سچ پوچھیئے تو ہم کو بھی وہ سڑک اپنی کشادگی، وہاں موجود قطار در قطار، بلند قامت، سرسبز درختوں اور سڑک کے بیچوں بیچ قائم رنگ برنگے، دلفریب و دلکش پھولوں سے لدھے سبز قطعات کے سبب بہت ہی بھاتی تھی اور وہاں سے ابو کے ساتھ موٹر سائیکل میں انکے پیچھے بیٹھ کر کم و بیش ہر روز گزرنا بہت ہی بھلا معلوم ہوتا تھا۔

اکثر ہم ابو کے ساتھ اسلامیہ کالج کے عین سامنے استادہ ٹرے سے گلوب اور پھر

کشمیر روڈ سے ہوتے ہوئے موٹر سائیکل میں. براجمان ٹھنڈی تیز ہوائیں کھاتے گزرا کرتے تھے۔ ہمیں وہ سب مقامات اور سڑکیں ایسے دیرینہ مہربان دوستوں کی مانند معلوم ہوتے تھے جو ہمیشہ اپنی بانہیں واکئے ہمیں خوش آمدید کہنے کو تیار کھڑے ہوں اور اُن سب خاموش مگر اپنی خاموشی میں ہی بہت کچھ کہتے سنتے راستوں، سڑکوں اور مقامات سے گزرتے ہوئے محسن نقوی کے کہے یہ اشعار ہمارے ذہن کے دریچوں میں بازگشت کیا کرتے تھے :

اِتنی مدّت بعد ملے ہو!
کن سوچوں میں گم رہتے ہو؟
تیز ہوا نے مجھ سے پوچھا
ریت پہ کیا لکھتے رہتے ہو؟
کّون سی بات ہے تم میں ایسی
کیوں اتنے اچھے لگتے ہو؟
ہم سے نہ پوچھو ہجر کے قصے
اپنی کہوں اب تم کیسے ہو؟

یہ 1980ء کی بات ہے، پاکستانی فلموں کے جغادری ہدایتکار نذرالسلام (دادا) مرحوم کی فلم ''نہیں ابھی نہیں'' 21 اکتوبر کو ریلیز ہوئی۔ یہ فلم دادا نے مشہور انگریزی فلم SUMMER OF 1942 سے متاثر ہو کر بنائی تھی اور کہا جاتا

ہے کہ یہ پاکستان کی پہلی فلم تھی جو لڑکپن کی حدود کو عبور کرکے نوجوانی کی پُر پیچ سرحدوں پر قدم دھرتے نوجوانوں کے جذباتی مسائل و کیفیات کے موضوع پر بنے والی والین اور شاید ابتک کی آخری فلم ہے۔

ابو کو ہدایتکار نذرالسلام مرحوم کی سابقہ فلموں بطور خاص ''آئینہ'' کے سبب بہت زیادہ امیدیں وابستہ تھیں، لہٰذا وہ اس فلم کی ریلیز کے والین دن ہی ہم سب گھر والوں کو کراچی کے پلازہ سنیما لے گئے لیکن وہاں لگا ''ہاؤس فل'' کا بورڈ دیکھ کر انھوں نے اپنی موٹر سائیکل کا رُخ موڑا اور لائٹ ہاؤس سنیما کا طرف چل دیئے اور پھر ہم سب نے یہ فلم لائٹ ہاؤس سنیما میں دیکھی۔

اب ہمیں یہ تو نہیں معلوم کے اس فلم سے ابو کی وابستہ امیدیں پوری ہوئیں کہ نہیں؟ البتہ وہ دن اور آج کا دن، عرصہِ اکتیس سال بعد بھی ہم اس فلم اور اس فلم میں شامل اخلاق احمد مرحوم کے گائے ایک گیت کے سے سحر سے نکل نہیں پائے۔

اُس فلم کا ہیروُ فیصل الرحمٰن (پاکستانی فلم انڈسڑی کے مایہ ناز سنیما ٹو گرافر مسعود الرحمٰن مرحوم کے صاحبزادے اور بھارتی اداکار رحمٰن مرحوم کے بھتیجے) اُسی اولڈ کوئینز روڈ، اسلامیہ کالج کے گلوب اور کشمیر روڈ پر اپنی

بائیسائیکل پر لہرا لہرا کر یہ گیت گاتا ہے
سماں وہ خاب سا سماں
ملے تھے دل سے دل جہاں
کہاں لے کے چلا
مجھے یہ دل میرا
وہ دن کبھی تو آئیں گے
مجھے گلے لگائیں گے
کبھی آتے ہوئے، کہیں آتے ہوئے
ہم انہی راہوں میں مل جائیں گے
یہ آتے جاتے چہرے مانا کہ ہیں حسیں
ایسے تو ہیں ہزاروں تجھ سا کوئی نہیں
لگتی ہے زندگی ادھوری
کیسے یہ دور ہوگی دوری
وہ دن کبھی تو آئیں گے
مجھے گلے لگائیں گے
کبھی آتے ہوئے، کہیں آتے ہوئے
ہم انہی راہوں میں مل جائیں گے
ہر پھول منتظر ہے کب ہو تیرا کرم

کلیوں کو آرزو ہے چھو میں تیرے قدم
تیرے لیے تو کب سے راہیں
کھولے ہوئے ہیں اپنی باھیں
وہ دن کبھی تو آئیں گے
مجھے گلے لگائیں گے
کبھی آتے ہوئے، کہیں جاتے ہوئے
ہم انہی راہوں میں مل جائیں گے
وہ مہرباں نگاہیں ابتک نظر میں ہے
یہ رات دن ہمارے جن کے اثر میں ہیں
تیرے بناء تو یہ نظارے
ایسے ہیں جیسے غم کے مارے
سماں وہ خاب سا سماں
ملے تھے دل سے دل جہاں
کہاں لے کے چلا مجھے یہ دل میرا
وہ دن کبھی تو آئیں گے
مجھے گلے لگائیں گے
کبھی آتے ہوئے، کہیں جاتے ہوئے
ہم انہی راہوں میں مل جائیں گے

http://www.youtube.com/watch?v=5FO-_SlbR5U&feature=channel_video_title

ویڈیو: بشکریہ عرفان خان

سرور بارہ بنکوی مرحوم کے لکھے، اخلاق احمد مرحوم کے گائے اس گیت کی موسیقی ہمارے آل ٹائم فیوریٹ موسیقار روبن گھوش نے مرتب کی تھی اور آپ اس گیت کا ایک ایک مصرعہ پڑھ لیں، چاہیں تو اسکے ویڈیو کا ایک ایک منظر دیکھ لیں، آپ کو ایسا محسوس ہوگا کے جو باتیں ہم نے اس تحریر کی ابتداء میں قلمبند کیں ہیں وہ ہو بہو شاعر نے اپنی شاعری میں اور فلم کے ہدایتکار نے پردہِ سیمیں پر کچھ اسطرح سے پیش کردیں ہیں کہ جیسے یہ گیت سرور بارہ بنکوی نے نہ لکھا ہو، خود ہم نے ہی لکھا ہو اور اسے دادا نے نہ فلمایا ہو، خود ہم نے ہی فلمایا ہو۔

گو کہ اس گیت سے قبل بھی ہم اخلاق احمد مرحوم کے بے شمار مقبول گیت ریڈیو پاکستان سے سنتے اور اپنا سر دھنتے رہے تھے، لیکن اس گیت نے تو ہمیں اخلاق احمد مرحوم کا غلامِ بے دام قسم کا مداح بنادیا۔ اب اخلاق احمد مرحوم کا گایا یہ گیت تھا، ہم تھے اور ابو کی ہنڈا ففٹی کی سواری تھی، ہم جب جب بھی ابو کے ہمراہ ان مقامات سے گزرتے، ہمارے ہونٹوں پر یہ گیت ہوتا اور ہم خود کو فیصل الرحمٰن کی طرح کوئی ہیرو گردانتے ہوئے اپنے کسی خیالی محبوب کے

تصور میں غلطاں و پیچاں رہتے اور پھر قسمت کی خوبی دیکھئے کے اس بات کے کچھ چھے ایک برس بعد ہمیں اپنی پیشہ ورانہ زندگی کی دوسری ملازمت اِسی اولڈ کوئینز روڈ پر بحریہ کامپلیکس کے عقب میں واقع لالہ زار ایریا میں قائم بیچ لگژری ہوٹل کے بلمقابل ایک عمارت میں قائم دفتر میں ملی۔

بس صاحب پھر کیا تھا ہم تھے، اخلاق احمد مرحوم کا یہ گیت تھا اور ایم ٹی خان روڈ کی وہ رومان پرور فضائیں تھی اور اب تو یہ گیت ہمارے لئے کچھ اور ہی معنویت کا حامل ہوچکا تھا، ہماری پشہ ورانہ زندگی کا آغازِ نو تھا اور اب یہ گیت ہمیں مستقبل کی دبیز دھند میں اٹیں راھوں اور انپر چلکر ملنے والیں انجان منزلوں اور نہ معلوم کامیابیوں کی نوید سنایا کرتا تھا:

تیرے لیے تو کب سے راہیں
کھولے ہوئے ہیں اپنی باھیں
وہ دن کبھی تو آئیں گے
مجھے گلے لگائیں گے
کبھی آتے ہوئے، کہیں جاتے ہوئے
ہم انہی راہوں میں مل جائیں گے

اور ان کیفیات تک ہماری رسائی میں ان چاروں ہی کا برابر کا تو ہاتھ تھا،

گلوکار اخلاق احمد، شاعر سرور بارہ بنکوی، ہدایتکار داد ااور اداکار فیصل الرحمٰن۔

آج 31 برسوں بعد بھی جب ہم اخلاق احمد مرحوم کا گایا ہوا یہ گیت سنتے ہیں اور کم و بیش روز ہی سنتے ہیں، تو دل و دماغ پر وہی دورِ نوجوانی کی کیفیات غالب آنے لگتیں ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کے اب بھی یہ گیت ہمیں مستقبل کی دبیز دھند میں اٹیں راھوں اور انپر چلکر ملنے والیں نہ معلوم کامیابیوں کی نوید سناتا ہے:

تیرے لیے تو کب سے راہیں
کھولے ہوئے ہیں اپنی باھیں
وہ دن کبھی تو آئیں گے
مجھے گلے لگائیں گے

ممکن ہے کہ ہم نے اپنی ذات سے وابستہ یہ قصہ سنا کرآپ سب کو شدید کوفت میں مبتلا کیا ہو لیکن کیا کیا جائے کہ ہم جب بھی اخلاق احمد مرحوم اور اوپر زکر شدہ شخصیات کا تذکرہ کرتے ہیں، ہمارے نہ چاہتے ہوئے بھی یہ قصہ ہماری زبان پر آہی جاتا ہے۔

عموماً کہا یہ جاتا ہے کہ اخلاق احمد مرحوم کی آواز سب سے زیادہ اداکار ندیم پر سوٹ کرتی تھی اور خود ندیم صاحب کا بھی یہ ہی کہنا ہے۔ گو کہ اس بات کی سچائی میں کوئی کلام نہیں لیکن زیل میں ہم اخلاق احمد مرحوم کے گائے ہوئے چند گیت پیش کر رہے ہیں جو ندیم، وحید مراد مرحوم، محمد علی مرحوم، رحمٰن، جاوید شیخ اور فیصل الرحمٰن پر فلمائے گئے تھے اور آپ خود ان تمام نغمات کو دیکھ کر اندازہ لگا سکتے ہیں کے اخلاق احمد اسقدر اعلیٰ پائے کے گلوکار تھے کہ اداکار خواہ کوئی بھی ہو، انھوں نے محسوس نہیں ہونے دیا کہ یہ گانا وہ گا رہے ہیں یا کہ وہ اداکار جس پر کہ گیت فلمایا گیا ہے۔

1. سونا نہ چاندی نہ کوئی محل جانِ من تجھ کو میں دے سکوں گا، فلم "بندش" - ندیم

http://www.youtube.com/watch?v=l9t4I4QmDCc

2. ساتھی میرے بن تیرے، بن تیرے، کیسے بیتے گی عمریا بن تیرے، فلم "زبیدہ" - وحید مراد

http://www.youtube.com/watch?v=UBWUdmUP02A

3. تقدیر کے ہاتھوں میں کھلونا ہے آدمی، فلم "آدمی" - محمد علی

http://www.youtube.com/watch?v=7e4jK9pMAGA

4. ایک تھی گڑیا بڑی بھولی بھالی، فلم ''دوساتھی'' - رحمٰن

http://www.youtube.com/watch?v=HiV83zYFkUI

5. ساون آئے ساون جائے جائے، فلم ''دوساتھی'' - رحمٰن

http://www.youtube.com/watch?

v=c7ifcYOcbzc&feature=related

6. ''نیلی نیلی آنکھوں میں نہ جانے کیا ہے، ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے، فلم ''ہم اور تم
جاوید شیخ)۔)

http://www.youtube.com/watch?v=FnZhv6yEaGI

7. اس نے دیکھا میں نے دیکھا، فلم ''نہیں ابھی نہیں'' - فیصل الرحمٰن

http://www.youtube.com/watch?

v=yzeSp8kzPB8&feature=channel_video_title

8. لوٹا قرار میرے من کا، فلم ''نادانی'' - فیصل الرحمٰن

http://www.youtube.com/watch?v=zgvC-

dzlcB8&feature=related

اخلاق احمد 8 مئی 1946 کو دہلی غیر منقسم شدہ بھارت میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال 4 اگست، 1999 کو لندن میں خون کے سرطان کے سبب ہوا۔

اخلاق احمد مرحوم کے صاحبزادے آفاق احمد پاکستان سے باہر غالباً لندن میں ریڈیو ہوسٹ ہیں اور انکو ہمارے محترم گلوکار دوست جناب ظفر رامے صاحب کی اس ویڈیو میں دیکھا جاسکتا ہے۔ انہوں اخلاق احمد مرحوم کو خراجِ تحسین پیش کرنے کی غرض سے سونا نہ چاندی نہ کوئی محل جانِ من تجھ کو میں دے سکوں گا"، گا کر اسکا ویڈیو تمام" احباب کی نذر کیا ہے۔

http://www.youtube.com/watch?v=ywPEka6Bb60&feature=youtu.be

ندیم - ایک لیجنڈ اداکار

انٹرویو: وجیہہ جواد، ہفت روزہ مینگ، کراچی، اشاعت: مورخہ: 16 جولائی، 2011

ء

ترجمہ: امین صدرالدین بھایانی، اٹلانٹا، امریکا۔

تمام احباب کی خدمت میں یہ احقر اپنے پسندیدہ ترین اداکار ندیم کے تازہ ترین انٹرویو کے ترجمے جوکے ہفت روزہ مینگ کراچی کی 16 تا 22 جولائی 2011ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے، کے ساتھ حاضر ہے۔ یہ ایک انتہائی دلچسپ انٹرویو ہے جو کہ تمام دوستوں کو یقیناً حد پسند آیگا۔ اس انٹرویو میں جہاں ندیم صاحب نے اپنے فلمی کیریئر پر سیر حاصل گفتگو کی ہے وہیں انہوں نے بھارتی فلمی اداکار امیتابھ بچن کے فن پر بھی بطورِ خاص روشنی ڈالی ہے جو کہ پڑھنے والوں کی خصوصی دلچسپی کا باعث ثابت ہوگا۔

(امین صدرالدین بھایانی)

-.-

-.

قوم کے دل کی دھڑکن، ندیم ایک مشہور فلم سٹار جو گزشتہ چار دہائیوں سے اپنی غیر معمولی اداکارانہ صلاحیتوں کے بل بوتے پر ہمیں محظوظ کر رہے ہیں۔ مرزا نذیر بیگ، بلمعروف العام ندیم، پاکستانی سنیما کے ایک زندہ لیجنڈ اداکار

ہیں، فلم ''چکوری'' کے ساتھ ابتداء کی اور اس کے بعد پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا. اس عظیم اداکار کے کریڈٹ میں کئی کامیاب فلمیں ہیں اور وہ انتہائی مہارت کے ساتھ ہر قسم کے کردار باآسانی ادا کرلیتے ہیں. انہوں نے 1979 سے 1992 تک چودہ مسلسل نگار ایوارڈ حاصل کئے. صدارتی ایوارڈ برائے حسنِ کارکردگی ان کی پاکستانی سنیما کے لئے سرانجام دی گئیں خدمات کے اعتراف کا ایک ثبوت ہے. حال ہی میں ینگ نے افسانوی شہرت کے حامل اس اداکار سے رابطہ کیا اور ان کی زندگی کے بارے میں ان سے پوچھا:۔

آپ شوبز میں کس طرح آئے؟

میں اسے ایک حادثہ ہی کہوں گا. میرے والد صاحب مشرقی پاکستان میں مقیم تھے اور میں ان سے ملنے وہاں گیا ہوا تھا. ڈھاکہ میں قیام کے دوران میری کیپٹن احتشام سے ملاقات ہوئی. میری درخواست پر انہوں نے مجھے اپنی آئندہ آنے والی فلم ''چکوری'' کے لئے ایک گیت گانے کا موقعہ فراہم کیا لیکن بعدازاں حالات نے میرے حق میں کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ مجھے اس فلم میں اداکاری کی پیشکش ہوئی. ابتدائی طور پر میں اس پیشکش کو قبول کرنے میں ہچکچا رہا تھا، کیونکہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ اداکاری میرے بس کا روگ ہے لیکن قسمت نے میرے لئے کچھ اور ہی فیصلہ کر رکھا تھا اور آخرِ کار میں نے اس فلم میں مرکزی کردار ادا کیا. خوش قسمتی سے فلم میگا ہٹ ہوئی اور لوگوں نے میری

کارکردگی اور گلوکاری کو پسند کیا اور اس طرح سے آغاز ہوا۔

آپ پاکستان فلم انڈسٹری کے بہترین اداکار کے طور پر شمار کیے جاتے ہیں. اپنی کامیابی کے بارے میں آپ ہمیں کیا بتا سکتے ہیں؟

مجھے نہیں لگتا کہ مجھ میں کوئی غیر معمولی خصوصیات ہیں جن کی بناء پر میں ایک اسٹار بن گیا، یہ سب اُس وقت کی مرہونِ منت تھا جب میں شوبز کی دنیا میں داخل ہوا اور مجھے چند بہت اچھے مصنفوں، ہدایتکاروں، فلمسازوں، ساتھی فنکاروں اور شاعروں کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل گیا. ان سب نے میری مدد کی اور میری کامیابی کے لئے ایک بہت اہم کردار ادا کیا. اس کے علاوہ میری انتھک محنت کے سبب مجھے پذیرائی ملی. میرا یہ پختہ یقین ہے کہ کوئی بھی انسان محنت اور لگن سے اپنے شعبے میں عروج حاصل کر سکتا ہے. میں ہمیشہ خلوص نیت اور سخت محنت کے ساتھ اپنا کام کرتا ہوں اور نتیجہ خدا پر چھوڑ دیتا ہوں. وہ ہمیشہ مجھے میری امید سے بڑھ کر دیتا ہے.

ابتداء میں آپ نے کس طرح سے شہرت کا سامنا کیا؟

ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک کامیاب اداکار بننے کے ساتھ آنی والی شہرت کا سامنا کرنے میں ہر کسی کو بہت مشکل پیش آتی ہے اور اس کے لئے پاؤں زمین پر رکھنا مشکل ہو جاتا ہے. مزید برآں، جب کسی کو شہرت ملتی تو وہ اسکا مزید

متقاضی ہو جاتا ہے اور اسکی کوئی حد نہیں رہتی، میں نے اداکاری کو ایک عمومی کام ہی کے طور پر لیا اور خود کو کبھی ایک اسٹار نہیں سمجھا اور نہ ہی کبھی شہرت کو اپنے سر پر سوار کیا۔

آپ کسی فلم کی پیشکش کو قبول کرنے سے پہلے کن چیزوں پر غور کرتے ہیں؟

میری پہلی ترجیح یہ ہوتی ہے کہ میں یہ دیکھوں کے جس کردار کے لئے مجھے منتخب کیا گیا ہے وہ میری شخصیت سے (جسمانی اور نفسیاتی) طور پر قریب ہے کہ نہیں. فلمساز عام طور پر اپنی فلم میں کسی خاص اداکار کو باکس آفس پر اسکی قدر و منزلت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کاسٹ کرتے ہیں، لیکن یہ فیصلہ کرنا اداکار کی ذمہ داری ہے کہ اُس کردار کے ساتھ انصاف کر سکتا ہے یا نہیں۔ کمرشل سنیما میں شاز و نادر ہی عمیق مطالعہ کی ضرورت پیش آتی ہے، ہمارے مرکزی کرداروں کے لئے بہت زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہیں پڑتی ہے لیکن میں نے ہمیشہ بہت منتخب کام کیا گیا ہے.

کہا جاتا ہے کہ ہر ہدایتکار دوسرے ہدایتکار سے بہت مختلف ہوتا ہے، ایک فلم بنانے میں ہدایتکار کا کیا کردار ہوتا ہے؟

ٹیلی ویژن اور فلم ہدایتکار کے میڈیم ہیں، تکنیکی عملے سے لیکر اداکاروں تک وہ سب سے بہترین کام لے سکتا ہے،، ہدایتکار فلم کے جمالیاتی اور ڈرامائی

پہلوؤں کو کنٹرول کرتا ہے. میری نظر میں وہ فلم کے یونٹ کا اہم رکن ہے جو ایک بُرے ڈرامہ کو ایک اچھوتا موڑ دے سکتا ہے اور وہ اپنی کارکردگی سے ایک سست اختتام کو مہارت کے ساتھ نمٹنے ہوئے اسکے سُقم چھپا سکتا ہے۔

اداکاری میں چہرے کے تاثرات اور باڈی لینگویج کی کتنی اہم ہیں؟

اداکار کو اپنی باڈی لینگویج پر مکمل دسترس ہونی چاہئے. وہ اپنے ہاتھوں، چہرے کے تاثرات اور اشاروں کی مدد سے اپنے کردار میں زندگی پھونک سکتا ہے. ایک اداکار اپنے ناظرین پر اس وقت تک تاثر نہیں چھوڑ سکتا ہے جب تک اس کی اداکاری بھرپور اور اسکے چہرے کے تاثرات، باڈی لینگویج میں اکملیت نہ ہو۔

کیا آپ نے کبھی تھیٹر کیا ہے؟

میں نے تھیٹر کبھی نہیں کیا، کیونکہ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو ہدایتکار کا زیرِ نگیں (ڈاریکٹرز بوائے) سمجھا ہے. جبکہ تھیٹر خالصتاً ایک اداکار کا میڈیم ہے اور جب ایک بار کوئی اداکار اسٹیج پر آکھڑا ہوتا ہے تو اب یہ اس کے ہاتھ میں ہے کہ وہ کس طرح اُس کردار کو ادا کرتا ہے. اسٹیج پر اداکار کے کاندھوں پر ہی سارا بوجھ ہوتا ہے اور وہ کسی وقفے اور ریٹیک کے بناء ہی اپنی غیر معمولی اور بے عیب کارکردگی سے عوام کو تفریح مہیا کرتا ہے اور اسکے پاس غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

کیا آپ نے کبھی کوئی مکمل کامیڈی فلم کی ہے؟

میں نے کئی فلموں میں مزاحیہ کردار کئے ہیں۔ میری دوسری فلم ''چھوٹے صاحب'' ایک مزاحیہ فلم تھی۔ دیگر مزاحیہ فلموں میں ''نادان'' اور ''اناڑی'' شامل ہیں۔ مجھے ہمیشہ مزاحیہ کردار نگاری میں سنجیدہ اداکاری سے زیادہ لطف آیا ہے۔

کیا آپ نے کبھی کوئی منفی کردار بھی ادا کیا؟

میں نے فلم ''سماج'' میں ایک منفی کردار ادا کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب میں اپنے پیشے کی چوٹی پر تھا اور سب نے مجھے خبردار کیا کے میں اِس وقت ایک منفی کردار کر رہا ہوں اور اُن کا خیال تھا کہ اس سے ہیرو کے طور پر میرا تاثر خراب ہو سکتا ہے اور مجھے کبھی بھی کسی اہم کردار میں کاسٹ نہ کیا جائے گا۔ لیکن اس کے برخلاف میں نے ایک رسک لیا اور ولن کا کردار ادا کیا۔ بعدازاں میں نے خود کو درست ثابت کر دیا کیونکہ اس منفی کردار میں میری کارکردگی کی بے انتہا تعریف ہوئی۔

آپ نے بالی وڈ میں بھی کام کیا ہے، ہمیں اس کے بارے میں کچھ بتائیں؟

میں نے ایک بھارتی فلم ''دور دیش'' میں کام کیا۔ یہ کہانی ایک ایسے نفسیاتی

شخص کے ارد گرد گھومتی ہے جو ایک لڑکی کو اغوا کرتا ہے لیکن بعد میں اسے اس سے محبت ہو جاتی ہے. یہ فلم شمالی امریکہ اور کینیڈا میں فلمائی گئی تھی. یہ ایک شاندار تجربہ تھا اور میں نے بھارتی فلم انڈسٹری کے لوگوں کو بہت پروفیشنل پایا۔

یا آپ نے کبھی بالی وڈ کے لئے ایک اور فلم کرنے کے سوچا؟

حال ہی میں چند آفرز موصول ہوئی تھیں، لیکن میں نے ان کو مسترد کر دیا کیونکہ مجھے ان میں کوئی کشش نظر نہ آئی. اگر کوئی اچھی تجویز میرے سامنے آئی تو میں نے اسے ضرور آزماؤں گا۔

اپنے ذاتی پروڈکشن ہاؤس کے بارے میں کچھ بتائیں؟

میرا ایک چھوٹا سا پروڈکشن ہاؤس ''لینس اینڈ لائٹ'' کے نام سے ہے. میں نے اس کے بینر تحت فلم ''آئینہ'' کا ایک ڈرامہ ورژن بنایا جسکی ہدایتکاری میرے صاحبزادے نے کی تھی. ایک اور ڈرامہ سیریل زیرِ تکمیل ہے جس کی ہدایت میرے بڑے صاحبزادے دے رہیں ہے. تاہم اس بینر کے تحت فی الحال کوئی فلم زیرِ غور نہیں۔

جب آپ اپنے کیریئر کے عروج پر تھے تو کیا آپ کے لئے اپنے گھر والوں کے لئے

وقت نکالنا مشکل تھا؟

اپنے گھر والوں کیلئے وقت نکالنا میرے لئے کبھی مسئلہ نہیں تھا کیونکہ میں نے ہمیشہ بہت منتخب کام کیا۔ میں اپنے فلمسازوں کو یہ بتادیا کرتا تھا کہ میں صرف ابتدائی شفٹوں ہی میں کام کروں گا، میرا دیگر وقت اپنے گھر والوں اور دوستوں کے لئے تھا۔ میں تمام فلمساز اور ہدایتکار میں اس بات کے لئے مشہور تھا کہ میں اپنی استعداد سے زیادہ کام نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ اپنے کیریئر کے عروج میں بھی ہفتے میں ایک روز اتوار یا جمعہ کو چھٹی کیا کرتا تھا تاکہ میں اپنے خاندان کے ساتھ زیادہ وقت گزار سکوں۔

آپ کے لئے ہیرو سے کیریکٹر ایکٹر تک کی منتقلی کس قدر مشکل تھی؟

میرے لئے یہ مشکل نہ تھا کیونکہ میں نے اسے بڑی ہی خوشی کے ساتھ قبول کیا ہے، یہ ہیرو سے کیریکٹر ایکٹر میں منتقل ہونے کا صحیح وقت ہے۔ میں نے اوائل عمری میں ہیرو کے کردار ادا کئے اور اب میں باغ میں گانے اور رقص کرتے کسی نوجوان لڑکی کے ہمراہ رومانس نہیں کر سکتا۔ میری عمر مجھے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔

پاکستانی فلم انڈسٹری نے آپ کو اتنا کچھ دیا ہے۔ کیاآپ نے اسے اچھی فلموں کی شکل میں کچھ واپس دینے کا سوچا؟

میں نے دو فلموں بنائیں ہیں. میری پہلی ''مٹی کے پتلے'' مزدور و سرمایہ دار کے سنگین مسئلہ پر روشنی ڈالتی ہے. یہ باکس آفس پر ایک کامیاب فلم نہیں تھی کیونکہ اس میں معاشرے کی مسخ شدہ تصویر پیش کی گئی تھی لیکن اسے روس نے ایوارڈ سے نوازا تھا. میں نے ایک پنجابی فلم ''مکھڑا''، بنائی تھی جو کہ ایک ہٹ فلم تھی۔اِس وقت ہماری فلمی صنعت کی حالت بہت خراب ہے اور میں سرمایہ کاری کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا، اسی وجہ سے میری مکمل توجہ ڈراموں کی پروڈکشن پر ہے۔

ایک طویل عرصے تک فلم انڈسٹری کا حصہ رہنے کے بعد ٹیلی ویژن پر کام کرنا کس قدر مشکل تھا؟

بلاشبہ دونوں میڈیم میں فرق کی وجہ سے تھوڑا مشکل تھا، لیکن میں جلد ہی اس کا عادی ہوگیا. فلموں اور ٹیلی ویژن میں رفتار کا فرق بھی ہے. فلموں میں پوری کہانی ڈھائی گھنٹے کے اندر اندر بیان کرتے ہیں جبکہ ایک ڈرامہ میں چونکہ بہت سا وقت ہوتا ہے وہ 13-14 اقساط تک چلتا ہے اور کہانی آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہے. میں نے خود کو ٹیلی ویژن کے لئے ایڈجسٹ تو کرلیا لیکن مجھے نہیں معلوم کہ میں کس حد تک کامیاب رہا ہوں۔

بالی وڈ کے لیجنڈ اداکار امیتابھ بچن کی فلموں میں ایک بڑی شاندار واپسی

ہوئی ہے، کیا ہمیں آپ سے بھی یہ ہی امید کرنی چاہئے؟

میں نے فلم انڈسٹری کو نہیں چھوڑا ہے، وہ میری پہلی ترجیح ہے اور اس میں زیادہ آرام دہ محسوس کرتا ہوں فلموں میں کام کرنے سے صرف اس لئے پیچھے ہٹا ہوں کیونکہ ہماری فلمی صنعت میں اچھی فلمیں نہیں بن رہیں۔ پھر سے اچھی فلمیں دوبارہ تیار کرنے کے قابل ہونے میں ابھی وقت درکار ہے. اس کے برعکس بھارتی فلم انڈسٹری عروج پر ہے اور اداکاروں کو اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے کے لئے زیادہ مواقع فراہم کر رہی ہے. جہاں تک امیتابھ کا تعلق ہے تو وہ ایک لیجنڈ اداکار ہے. میں نے کسی کو بھی ان سے زیادہ بھرپور لگن کے ساتھ سخت محنت کرتے نہیں دیکھا ہے اور وہ ایک عام کردار کو یادگار بنانے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں. انہیں ہدایتکاروں، فلمساروں، اور مصنفوں سے، جو ان کو ذہن میں رکھتے ہوئے کردار لکھتے ہیں سے بھرپور مدد ملتی ہے. اگر ہماری صنعت بہتر حالت میں ہوتی تو میں ٹیلی ویژن سے فلموں میں کام کرنا زیادہ پسند کرتا۔

کیا آپ کو لگتا ہے کہ اداکار عام زندگی گزارتے ہیں؟

یقینا ان کی زندگی ایک عام انسان کی طرح ہی ہے ماسواء یہ کہ وہ عوام کی ملکیت بن جاتے ہیں. اپنے کالج کے دنوں کے دوران میں نے بہت کرکٹ کھیلی. میں نے ناظم آباد اور پاپوش نگر کے تمام میدانوں میں کرکٹ کھیلی ہے. دوستوں کے

ساتھ باہر جانا اور باہر کھانا مجھے بے حد پسند تھا لیکن اب میں ایک عام آدمی کی طرح یہاں وہاں گھوم نہیں سکتا کیونکہ میں ایک جانا جاتا چہرہ ہوں اور جب بھی میں گھر سے باہر قدم رکھتا ہوں لوگ مجھے پہچان لیتے ہیں۔ مجھے اپنے الفاظ اور اعمال کے حوالے سے بہت محتاط رہنا پڑتا ہے کیونکہ میں نہیں چاہتا میرے پرستاروں کے جذبات کو ٹھیس پہنچے۔

آپ کی خیال میں کامیاب ہونے کے لئے کس شئے کی ضرورت ہوتی ہے-- صلاحیت یا تعلیم ؟

کوئی بھی تعلیم کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا ہے. ایک شخص جو چھوٹا سا پان شاپ یا ایک کثیر القومی کمپنی چلا رہا ہے دونوں ہی کے لئے یہ ضروری ہے . یہ تعلیم ہی ہے کہ جو ہماری زندگی ہماری سوچ میں مثبت تبدیلی لاتی ہے اور ہماری حدود کو وسعت بخشتی ہے. اگر ایک اداکار باصلاحیت ہے تو تعلیم اس کی شخصیت کو مزید نکھارنے میں مدومعاون ثابت ہوتی ہے۔

فلم اسٹار ندیم بطور ایک انسان کیسے ہیں؟

میں ایک عام انسان ہوں اور مجھ میں شخصیت کے مثبت اور منفی دونوں پہلو ہیں. میں ایک سادہ انسان ہوں اور میں خود کو کبھی ایک فلم سٹار نہیں سمجھتا، یہ صرف میرے لئے ایک کام ہے جسے میں نے مکمل مہارت کے ساتھ کرنے کی کوشش کی

ہے۔
کیاآپ نے کبھی اپنا شخصی تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے؟
میں ہر لمحہ اپنا تجزیہ کرتا ہوں. ایکٹ اداکار کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ وہ فلموں میں مختلف کردار ادا کرتا ہے اور اس کی اصل شخصیت کہیں کھو کر رہ جاتی ہے. یہ بہتر ہو گا اگر آپ ان کرداروں کی نفی کرکے اپنی ذاتی شخصیت کو برقرار رکھنے کے قابل رہیں.
میرے معاملے میں، وہ خصوصیات جو مجھے اپنے خاندان سے وراثت میں ملیں ہیں، میری شخصیت پر انکو غلبہ حاصل ہے۔
آپ کے پسندیدہ اداکار کون ہے؟
ویسے میرے پسندیدہ فنکاروں کی فہرست بہت طویل ہے اور ان میں سینئر اور چند جونیئرز فنکار بھی شامل ہے. دلیپ کمار ہمیشہ سے میرے پسندیدہ اداکار ہیں. لوگوں کا کہنا ہے کہ میں نے انہیں کاپی کیا، لیکن یہ سچ نہیں ہے. ان کی طرف سے میری بہت زیادہ حوصلہ افزائی ہوئی. شروع میں میں نے ان کی اداکاری کے اسٹائل کی کاپی کرنے کی کوشش کی لیکن بعدازاں میں نے اداکاری میں اپنا ذاتی انداز اختیار کیا۔
آپ نے چند ٹی وی شوز بھی کی میزبانی کی ہے لیکن آپ نے میزبانی کے سلسلے کو

برقرار نہیں رکھا. کیا آپ کسی پروگرام کی دوبارہ میزبانی کریں گے؟
جی ہاں میں نے پی ٹی وی پر ''میرے ندیم'' کی میزبانی کی لیکن میں اسے جاری نہ رکھ سکا کیونکہ مجھے بیرون ملک جانا تھا. میں نے ایک نجی چینل پر ایک پروگرام کی میزبانی بھی کی ہے. مستقبل میں اگر میں کوئی اچھی آفر موصول ہوئی تو میں ضرور کروں گا۔
اپنے ڈریم کردار کے بارے میں ہمیں بتائیں؟
کوئی بھی کردار ایسا نہیں ہے کہ میں اسے اپنے ڈریم کردار کہوں. میں صرف ایک ایسا کردار، جس میں کارکردگی کی گنجائش ہو کرنا چاہتا ہوں. میں ایسا چیلنجنگ کردار ادا کرنا چاہتا ہوں جو کوئی دوسرا اداکار نہ کرنا چاہے۔.
کیا آپ نے کبھی بھی اداکاری کے میدان میں نوجوانوں کی تربیت بارے میں سوچا ہے؟
نہیں، میں نے کبھی نہیں سوچا کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ اگر کوئی انفرادی طور ایسا کرتا ہے تو اسکا بنیادی مقصد آمدنی پیدا کرنا ہو سکتا ہے. مجھے نہیں لگتا کہ یہ ایک شخص کا کام ہے. لوگوں کے ایک تجربہ کار گروپ کی مشترکہ کوششوں کی ضرورت ہے جو طالب علموں مین اپنی دانش اور مہارت منتقل کر سکے. طلباء کی کوششوں کو تسلیم کرنے کے لئے کوئی پروفیشنل ڈگری بھی ہونی چاہیے۔.

کیا آپ کو زندگی میں کوئی پچھتاوا ہے ؟
نہیں ، مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہے. لوگ مجھے چاہتے ہیں اور ان کی دعائیں میرے ساتھ ہے اور مجھے کیا چاہیے ؟
ٹیلی وژن کے مقابلے میں ، ایک فلمی اداکار کبھی نہیں مرتا آپ اس بات کو کس طرح دیکھتے ہیں ؟
فلم زندگی/حقیت سے بالاتر (لارجر دھین لائف) شئے ہے اور فلم کے تاثر کو ٹیلی وژن پر محسوس نہیں کیا جا سکتا ہے. ایک شخص اپنے کمرے میں ٹی وی دیکھتے ہوئے دوسرا کام بھی کر سکتا ہے ، لیکن ایک فلم دیکھنے کے لئے وہ اپنے گھر سے باہر قدم رکھتا ہے اور فلم کے مزے کا تجربہ کرنے کے لئے سنیما جاتا ہے. کیونکہ اس فلم کو دیکھنے کے وہ رقم خرچ کرکے ٹکٹ خریدتا ہے، لہٰذا وہ پابند ہے کہ وہ مکمل توجہ کے ساتھ ہر منظر کو دیکھے. وہ اداکاروں کی کارکردگی کو جانچتا اور پھر اسی معیار سے انکی کارکردگی کا تعین کرتا ہے. لیکن ٹی وی پر ایک ڈرامہ سیریل میں کئی اقساط ہوتیں ہیں اور ہم بعض اوقات ایک اداکار کے سب سے زیادہ طاقتور منظر دیکھنے سے ہی محروم رہ جاتے ہیں.
اس لحاظ سے ایک فلم اداکار کا تاثر ہمیشہ ایک ٹی وی اداکار کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔

.

آپ ہماری فلم انڈسٹری کا ایک حصہ ہیں۔ کیا آپ ہمیں فلمی صنعت کے خاتمے کی وجوہات بتا سکتے ہیں؟

پہلی وجہ پاکستان کی تقسیم تھا۔ ہم نے ایک اہم سرکٹ ڈھاکہ کو کھو دیا، بہت سے اچھے فلم ساز یا تو وفات پا گئے یا صنعت کو چھوڑ گئے اور فلم انڈسٹری میں ناخواندہ لوگوں کا غلبہ ہوگیا۔ انہوں نے اپنے ذاتی مفادات کے لئے صنعت کو برباد کر دیا۔

ہماری فلمی صنعت کو پھر سے زندہ کرنے کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے؟

ہماری فلمی صعنت راکھ سے اسی وقت ابھر کر باہر آسکے گی جب تعلیم یافتہ اور نوجوان لوگوں اس میں داخل ہونگے۔ شعیب منصور کی ''خدا کے لئے'' اور ''بول'' کے ساتھ ہی اس عمل کا آغاز ہو چکا ہے۔ مہرین جبار نے بھی ایک اچھی فلم بنائی ہے۔ ہمیں مزید اچھے فلم میکروں اور اچھی فلموں کی ضرورت ہے جو لوگوں کو سینما گھروں میں واپس لاسکے۔ حکومت کی طرف سے حالات کو بہتر بنانے کے لئے چند اہم اقدامات ناگزیر ہیں۔ کراچی میں ضروری بنیادی ڈھانچہ میسر ہے اور اسے بہت اچھی فلمیں بنانے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

کیا آپ کو فلم انڈسٹری کی کمی محسوس ہوتی ہے؟

یقیناً میں اسے بہت یاد کرتا ہوں. میں جو کچھ بھی آج ہوں وہ اس فلمی صنعت ہی کے باعث ہے. میرا خیال تھا کہ ہماری فلموں کی آئندہ سالوں میں بہت زیادہ ترقی ہو گی اور ہمیں کام کرنے کے مزید مواقع ملے گے لیکن افسوس کی بات ہے کے یہ نہیں ہوا. ہم آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے کی طرف چلے گئے۔

بشکریہ جنگ دی ویکلی، کراچی، اشاعت: مورخہ 16 تا 22 جولائی، 2011ء

Nadeem – A Living Legend by WAJIHA JAWAID

سالا ایک مچھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!۔

ایک صاحب کریانہ فروش کی دکان پر گئے اور بولے:۔

’’بھائی زرا مچھر مارنے کی کوئی ایسی دوا دے دیں جو شرطیہ مچھر مار سکے، لیکن ہو زرا سستی!‘‘۔

دکاندار نے جھٹ سے ایک سر بمہر پڑیا نکال ان صاحب کے ہاتھ میں دھر دی اور مسکراتے ہوئے بولا:۔

۔’’بڑے صاحب بے فکر ہو کر لے جائیں، آزمائی ہوئی شے ہے اور مچھر کے ہلاک ہونے کی مکمل گارنٹی، ترکیبِ استعمال پڑیا کے اندر موجود ہے، قیمت صرف ایک روپیہ۔ ۔۔۔۔۔!!!‘‘۔

وہ صاحب سارے راستے دل ہی دل میں ’’کم خرچ بالا نشین‘‘ کا جاپ جپتے گھر پہنچے اور فوراً ہی وہ پڑیا کھول ڈالی۔پڑیا میں سے دو چھوٹے چھوٹے گول پتھر اور ایک پرچہ برآمد ہوا۔پرچے پر تحریر تھا.

مچھر مار کمپنی کی فخریہ پیشکش، ہر قسم کے مچھروں کو ہلاک کرنے کا شرطیہ طریقہ مطلوبہ نتائج کے حصول کے لئے ترکیبِ استعمال پر عمل کرنا لازمی شرط ہے۔

ترکیبِ استعمال:۔

پڑیا میں دیئے گئے دونوں گول پتھروں کو ہاتھوں میں لے کر متاثرہ مقام پر بیٹھ جائیں اور دائیں ہاتھ والے پتھر کو فضاء میں کچھ اسطرح سے بلند کریں کہ ہر لمحہ آپکی کڑی نظر اس پر رہے۔ اب جیسے ہی کوئی مچھر اس پتھر پر بیٹھے فوراً ہی بائیں ہاتھ والے پتھر کو دائیں پتھر پر زور سے ماریں، انشاء اللہ مچھر بناء کسی چوں چرا کئے فوراً ہی مر جائے گا۔

احتیاطی تدابیر:۔

اس ساری مشق کے دوران غلطی سے یہ شعر دھیرے سے بھی گنگنانے کی کوشش نہ کریں، اگر مچھر کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی تو وہ محتاط ہو جائیں گے اور ہر گز ہر گز پتھر پر براجمان نہ ہونگے:۔

انہی پتھروں پہ چل کے اگر آ سکو تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

یہ ہی حکم اس شعر پر بھی لاگو ہوتا ہے:۔

پتھروں آج میرے سر پھ .برستے کیوں ھو

میں نے تم کو بھی کبھی اپنا خدا رکھا ہے

اگر آپ کے ہاتھ رعشہ زدہ ہیں تو بھی خاص فکر کی کوئی بات نہیں، البتہ اس امر کو مچھروں سے پوشیدہ رکھنا اشد ضروری ہے، مچھروں پر یہ ظاہر کریں کہ آپکے ہاتھوں میں خدانخواستہ ہرگز رعشہ نہیں، وہ تو آپ بس شُغل شُغل میں ہی یا پھر بوریت ڈُور کرنے کے لیے اپنے ہاتھوں کو ہلا رہے ہیں۔

نوٹ: کسی بھی قسم کے گھریلو جھگڑے کی صورت میں پتھروں کو بیوی کی پہنچ سے دور رکھیں، کسی بھی ناخوشگوار واقعے کے پیش آنے کی صورت میں فوری ڈاکٹر سے رجوع کریں، حالت زیادہ خراب ہوجانے کی صورت میں کسی عطائی ڈاکٹر یا محلے کے کمپاؤنڈر کی خدمات سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ کمپنی کسی بھی قسم کے نقصان کے ازالہ کی ذمہ دار نہ ہوگی۔

منی بیک گارنٹی:۔

ترکیب کے درست استعمال کے باوجود اگر مچھر نہ مریں تو پہلے تو یہ اچھی طرح

سے سمجھ لیں کہ آپ کے گھر کے مچھر آپ ہی کی طرح سے ڈھیٹ ہو چکے ہیں، پھر بھی اگر آپ کی تسلی نہ ہو تو آپ یہ پتھر دکاندار کے منہ پر ماریں (اپنی صوابدید پر) اور اس سے اپنے بل بوتے پر اپنی رقم واپس طلب کریں۔ ترکیب کے درست استعمال کے ثبوت کے طور پر کم از کم دو مچھروں کی گواہی ساتھ لانا لازم ہے۔ اب اگر آپ مچھروں سے ساز باز کرلیں تو یہ اچھی طرح سے سمجھ لیں کہ آپکو مرنے کے بعد اللہ کو بھی منہ دکھانا ہے۔

ہاں تو صاحبان، بات اگر اس مچھر مار کمپنی کی حد تک رہتی تو ٹھیک تھا لیکن اب تو انتہا ہی ہو گئی۔

لندن کے ایمپریل کالج کی معروف ریسرچر ڈاکٹر فلیمینیا کیٹا روسیا کے مطابق نر مچھروں کو بانجھ بنا کر ملیریا پھیلانے والے مادہ مچھروں کی نسل کشی کی جا سکتی ہے۔

ٹھیک ہے جناب ان کی بات پر سر تسلیم خم لیکن اصل بات جس نے ہمارے ہوش اڑا دیئے وہ تو کچھ اور ہی ہے۔ موصوفہ فرماتیں ہیں:۔

۔''ہمیں یہ بات یقینی بنانا ہوگی کہ بانجھ نر مچھر، مادہ مچھروں سے ملتے

رہیں اور انہیں اس بات کا اندازہ نہ ہو کہ انکی تخم ریزی کی صلاحتوں میں کوئی بیرونی روکاٹ پیدا کی جارہی ہے"۔

(روزنامہ جنگ، کراچی، مورخہ 10 اگست 2011ء)

واہ صاحب واہ، یہ تو اس سے بھی مشکل معاملہ ہے، جسمیں پہلے تو آپکو ایک پتھر پر مچھر کو تشریف رکھنے پر مجبور کرنا ہے اور پھر تاک کے نشانے پر دوسرا پتھر مارنا ہے، اب اگر آپ کے نصیب اور نشانہ دونوں ہی اچھے ہوں تو ٹھیک اور کیا معلوم کہ یہ مچھر کی نسل بھی کوؤں کی طرح شاطرانہ ذہنیت کی ہی حامل ہو۔ کم بخت نشانہ باندھنے تک بھی کسی بے فکر عاشق کی طرح سے کوچہء جاناں سے اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے، لیکن جہاں آپ کا ہاتھ نشانہ چلانے کیلیئے حرکت میں آیا وہاں ظالم یہ جا اور وہ جا۔

لیکن اب ان ڈاکٹرنی صاحبہ کی تحقیق کے نتیجے میں تو معاملہ اور سنگین بلکہ رنگین ہوگیا ہے۔ پہلے آپ ایک مچھر پکڑیں اور پھر اسے خدا معلوم طریقے سے نہ صرف بانجھ بنائیں اور کچھ اس کاریگری سے بنائیں کہ اسے کانوں کان خبر تک نہ ہو کہ اسکے ساتھ کیا ہاتھ ہوگیا ہے اور پھر وہ مچھر موصوف اپنی (زائل شدہ) مردانگی کے زعم میں صنفِ نازک مچھروں کی) پر ڈورے بھی ڈالتا رہے اور اسے احساس تک نہ ہو کہ وہ اس مچھرنی کے) بچوں کے ابا بننے کی صلاحیتوں

سے یکسر محروم ہوچکا ہے۔

عرصہ دراز ہوئے ایک نامعقول سی بھارتی فلم میں ایک انتہائی چھچھورا سا ڈائیلاگ سنا تھا:۔

سالا ایک چھوٹا سا مچھر اتنے بڑے آدمی کو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بنا دیتا ہے"۔"

لیکن اس خبر کی اشاعت کے بعد (اگر اب تک مچھروں نے بھی یہ خبر پڑھ لی ہے تو) سارے مچھر یہ کہتے پھر رہے ہونگے:۔

سالا اتنا بڑا آدمی ایک چھوٹے سے مچھر کو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بناتا ہے"۔"

تمام پڑھنے والوں سے معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ ہم اپنی شرمیلی طبعیت کے سبب اس قطعاً غیر اخلاقی لفظ کا نام نہیں لے پارہے ہیں لیکن یہاں جگہ خالی چھوڑ رہے ہیں، تاکہ پڑھنے والے اپنے حوصلے واِستطاعَت کے مطابق خالی جگہ خود ہی پر کرلیں۔

لیکن اب سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ ڈاکٹرنی صاحبہ کس طرح سے دنیا

بھر کے نر مچھروں کو بانجھ بنانے کا عظیم الشان کارنامہ سرانجام دیں گیں اور وہ جو بھی طریقہ کار ہوگا اول تو ہمارے جیسے تیسری دنیا کے ممالک میں کیسے کامیاب ہو سکے گا کہ جہاں آج تک انسان تک پوری طرح سے خاندانی منصوبہ بندی کے طریقوں پر عمل درآمد کر نہ سکے یا اُن سے کرایا نہ جا سکا، بھلا اب کوئی ان سے جا کر یہ تو پُوچھے کہ انکے اس شاندار منصوبے پر ہماری تیسری دنیا کے مچھروں سے کیا خاک عمل کروایا جا سکے گا۔

چلیئے بالفرضِ محال اگر کسی خفیہ آسمانی و سلیمانی طریقہ کار کے تحت سارے نر مچھروں کو قابو کر کے انپر ضبطِ تولید کا کوئی تیز بہدف نسخہ آزما بھی لیا گیا تو جیسا کہ ڈاکٹرنی صاحبہ کا فرمانا ہے کہ:

"ہمیں یہ بات یقینی بنانا ہوگی کہ بانجھ نر مچھر، مادہ مچھروں سے ملتے رہیں اور انہیں اس بات کا اندازہ نہ ہو کہ انکی تخم ریزی کی صلاحتوں میں کوئی بیرونی روکاٹ پیدا کی جارہی ہے"۔

اب یہ بھی غریب عوام ہی کی سردردی ٹھری کہ پہلے تو ان نر مچھروں کو بانجھ بنایا جائے اور وہ بھی اسلیے کہ مقتول کو یہ تک کو یہ نہ پتہ چلے کہ وہ قتل ہو چکا ہے بقول شاعر:۔

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

اور پھر اس امر کو بھی یقینی بنانا ہوگا کہ مچھر موصوف کے مادہ مچھروں سے ملتے رہنے کے لیے ماحول بھی سازگار رہے۔

ویسے بائی دے وے یہ ڈاکٹرنی صاحبہ کو مچھروں کی ذہانت پر اتنا بھروسہ کیوں ہے کہ انہیں یہ شبہ ہو جائیگا کہ ان کے اور انکی آنے والی نسلوں کے خلاف کیا کھیل کھیلا گیا ہے، لو بھلا بتاؤ جیسے مچھر نہ ہوئے اپنے قریش پور صاحب والی کسوٹی کے عبید اللہ بیگ اور غازی صلاح الدین ہو گئے کہ ہر بات، ہر پہیلی کو بوجھ ہی لیں گے۔

ویسے ممکن ہے کہ چونکہ ڈاکٹرنی صاحبہ کا تعلق برطانیہ سے ہے اور کیا معلوم شاید برطانیہ کے مچھر اتنے ذہین ہی ہوں، البتہ ہم اپنی طرف یعنی پاکستانی مچھروں کے بارے تو قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ انہیں کسی طور بھی یہ پتہ نہ چل سکے گا کہ ان کے ساتھ آخر ہوا کیا ہے؟، ارے بھیاء جب ان مچھروں کے ہموطن، ہم جیسے سوج بوجھ رکھنے والے انسانوں تک کو تو آج تک یہ سمجھ نہ آسکا کہ انکی حکومت، ان ہی کے منتخب کردہ نمائندے، سرکاری اہلکار اور ان

کی قسمتوں کے سیاہ و سفید کے مالک ان کے ساتھ کیا کیا ہاتھ کر گئے ہیں اور ہر آنے والے دن ایک سے .بڑھ کر ایک نیاء ہاتھ کرتے رہتے ہیں تو اس حقیر سے کیڑے کی بھلا کیا مجال ہے کہ اس کی انتہائی باریک عقل میں یہ بات سما بھی سکے۔

ہاں .برطانیہ سے یاد آیا کہ ان دنوں تو اسکا حال بھی کچھ اپنے کراچی سے کم تو نہیں دکھائی دے رہا ہے اور اگر .برطانوی مچھر اتنے ہی زہین ہیں جتنا ڈاکٹرنی صاحبہ انہیں سمجھ رہی ہیں تو پھر کہیں ایسا نہ ہو کہ سارے کے سارے .برطانوی مچھر ''متحدہ مچھر محاز'' (ایم ۔ ایم ۔ ایم) قائم کرلیں اور پھر .برطانیہ بھر کے ماہرین مچھریات کی خیر نہ ہو اور جسطرح سے فسادیوں نے ساری دکانیں، سپر مارکیٹیں اور شاپنگ سینٹرز کو لوٹ کر انہیں آگ لگا دی، کہیں سارے .برطانوی مچھر مل کر مچھروں کے خلاف تحقیقات کرنے والے اداروں ہی کو آگ نہ لگا دیں اور ان میں کام کرنے والے ماہرین کو کاٹ کاٹ کر انہیں مستقل ملیریا کا مریض ہی نہ بنا دیں، بقول شاعر:۔

دیوانہ کہیں تم کو نہ دیوانہ بنا دے

میرے چھوٹے سے گھر کو یہ کس کی نظر، اے خُدا! لگ گئی

مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی اُس بس کے ایک کونے میں لگی سیٹ کی پُشت کے ساتھ نصب پائپ کو اپنے ہاتھوں میں تھامے کھڑا وہ ننھا سا چار یا پانچ سالہ بچہ جو کہ اسی سیٹ کے آخری سرے کے ساتھ نصب کھڑکی کے شیشے سے باہر جھانکتے ہوئے نہ جانے کن خیالوں میں کھویا ہوا تھا، یک بیک چونک اٹھا۔

خیالات کے لامتناہی تار کے ٹوٹتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ جیسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کسی ان دیکھی وانجانی دنیاؤں کی سیر کرتے اُس بچہ کا بس کی اندرونی فضاء سے منقطع رابطہ پھر سے استوار ہوگیا ہو۔

بس کا ہر کونا اور ہر حصہ سیٹوں پر بیٹھے، بس کے فرش اور چھت سے لگے پتلے پتلے آہنی ستونوں، لیڈیز کمپارٹمینٹ کو جدا کرتی آہنی جالیوں، سیٹوں کی پشتوں کے ساتھ نصب شدہ اور چھت کے ساتھ جڑے پائپوں کو اپنے ہاتھوں سے مضبوطی سے تھامے کھڑے لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔

بس کی فضاء میں لوگوں کی آپسی گفتگو کا شور، چلتی ہوئی بس کے انجن کی

غراہٹ کی آمیزش سے کچھ اسطرح سے آپس میں مدغم ہو کر ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک عجیب سی بھنبھناہٹ کی سی شکل اختیار کر گیا تھا جو قدرے دور کھڑے سامع کے لیے ایک باقاعدہ گفتگو سے زیادہ ایک شورِ مغلوبہ بنکر رہ گیا تھا۔ ہاں البتہ کبھی کبھار کوئی بھرپور قہقہہ یا کوئی ایک آدھ جملہ ایسا ضرور کان میں پڑھ جاتا، جسے قابلِ فہم گردانا جاسکتا تھا۔

بچے نے اپنی گردن چہار اطراف میں گھما کر بغور لوگوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ سیاہ، سانولی، گندمی، درمیانی و گوری رنگت والے، داڑھی مونچھوں سے مبرا، تو کوئی بڑی بڑی اور گھنی، تو کوئی تلوار مارکہ، تو کوئی ناک کے نیچے اور ہونٹوں کے عین اوپر ایک باریک سا خط بناتیں ہوئیں مونچھوں سے آراستہ، تو کوئی سینے تک دراز داڑھی میں اپنی انگلیوں سے خلال کرتے، تو کوئی تیل سے چپڑے چمکتے سیاہ، تو کوئی انتہائی سلیقے سے سنوارے گئے، تو کوئی جھاڑ جھنکار کی طرح بےترتیب بالوں، تو کوئی چکنے انڈے کی طرح سے چمکتی چندیا والے، تو کوئی شلوار قمیض زیبِ تن کیئے، تو کوئی سر پر عمامہ باندھے، تو کوئی کاندھے پر پٹکا ڈالے، تو کوئی کرتے پاجامے میں ملبوس، تو کوئی لمبی قمیض کے نیچے دھوتی پہنے اور کوئی قمیض پتلون زیبِ تن کیئے قطعاً اجنبی چہروں کی بھیڑ کو اپنے ارد گرد دیکھ کر ایک بار پھر اُس ننھے بچے نے اچھی طرح سے لوگوں کے چہروں کا کڑی نظر سے جائزہ لینا شروع کیا۔ لیکن باوجود

کوشش کے بھی ان سارے بھانت بھانت کے چہروں میں سے کوئی ایک چہرہ بھی اسے ایسا نظر نہ آیا جسے وہ "ابو" کہہ کر پکار سکتا!۔

دھیرے دھیرے بچے کے چہرے سے اضطراب و سراسیمگی کے آثار نمایاں ہونے لگے، اسے اُس ساری بھیڑ بھاڑ میں کہیں بھی اپنے ابو نظر نہیں آرہے تھے، حالانکہ وہ اپنے ابو ہی کے ہمراہ اس بس پر سوار ہوا تھا اور اسکے ابو اسکے ساتھ ہی تو کھڑے تھے۔

دو چار بار اِدھر اُدھر ابو کو صدائیں دینے کے باوجود بھی جب اسے نہ تو ابو کی طرف سے کوئی جواب موصول ہوا اور نہ ہی ابو کسی بھی کونے سے اپنی جانب آتے دکھائی دیئے تو مارے گھبراہٹ اور پریشانی کے اس کی ننھی ننھی آنکھیں موٹے موٹے آنسوؤں سے بھر آئیں اور پھر ہونٹوں سے نکلتیں سسکیوں نے باقاعدہ رونے کی صورت اختیار کر لی۔

بچے کے رونے کی آواز سن کر آس پاس کے لوگ متوجہ ہوئے اور حیرت سے اسے خوبصورت سے ننھے منھے بچے کو دیکھنے لگے۔

گوری رنگت، کانوں کو ڈھانپتے لمبے سیاہ بال، چہرے پر چھائی افسردگی

وسراسیمگی کے باوجود ٹپکتی ذہانت اس بات کی غماز تھی کہ وہ بچہ کسی اچھے گھر کا چشم و چراغ ہے۔

بچے کے اردگرد جمع ہوجانے والے مجمعے میں سے ایک مہربان صورت شخص نے آگے بڑھکر اس بچے کے کاندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور بولا:۔

بیٹے، کیوں رو رہے ہو!؟''۔

روتا ہوا وہ بچہ اپنی ہچکیوں اور بے قابو سانسوں پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بدقتِ تمام وقفوں وقفوں سے بولا:۔

۔''وہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہ۔۔۔۔۔۔۔جی وہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہ نا۔۔۔۔۔۔۔میرے ابو۔۔۔۔۔۔۔ہیں نا۔۔۔۔۔۔وہ۔۔۔۔۔۔وہ کھو گئے ہیں۔۔۔۔۔۔

۔!!!''۔

.

میں نانی اماں کے گھر جا کر ہمیشہ بہت ہی مسرور ہوا کرتا تھا۔اُس روز بھی اپنی امی کے ہمراہ صبح سے ہی انکے یہاں آکر بہت خوش تھا۔

امی ہمیشہ ہی کی طرح سے آتے ہی نانی اماں کے ساتھ دنیا جہاں کی باتوں میں

مشغول ہو گئیں تھیں اور یہ ان دونوں ماں بیٹی کا سدا کا ہی معمول تھا، جہاں کہیں ہفتے دو ہفتے کے بعد یہ دونوں خواتین یکجا ہوئیں، تو جیسے باتوں کا تو ایک پنڈورا بکس سا ہی کھل جاتا اور اب بھلا ایک 9 - 10 برس کے بچے کو ان باتوں سے کیا سروکار سکتا تھا؟ لہٰذا میں نانی اماں کے اُس بڑے سے سجے سجائے اپارٹمینٹ میں جو کہ کراچی شہر کے اُس دور کے متمول علاقے میں تھا اور جہاں وہ چھوٹے ماموں جنکی ابھی شادی بھی نہ ہوئی تھی، کے ہمراہ رہا کرتیں تھیں میں گھوم پھر کر گھر کے ہر اک کونے کھدرے کا معائنہ کرتا پھرتا۔

چھوٹے ماموں کی کراچی کی سب سے بڑی ہول سیل مارکیٹ جوڑیا بازار میں نمک کی دکان تھی اور اسی نسبت سے ہمارے ننہال کو خاندان بھر اور سب جاننے والوں میں نمک والے" کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ ماموں تو صبح صبح ہی اپنی دکان کو نکل جاتے تھے اور" پھر نانی اماں اور امی ملکر دوپہر میں کوئی لذیذ سا کھانا پکاتیں جو ہم تینوں مل جل کر آپس میں خوب باتیں کرتے ہوئے مزے لے لے کر تناول کرتے۔

اُس روز ہم لوگوں کو وہاں آئے بمشکل کچھ دو تین گھنٹے ہی بیتے ہونگے کہ گھر کے دروازے پر لگی اطلاعی گھنٹی بج اٹھی۔ امی دروازہ کھولنے کو اٹھیں تو میں بھی ان کے ساتھ ہی ہولیا۔ دروازہ کھلتے ہی سامنے ابو کھڑے نظر آئے۔

لیکن یہ کیا۔۔۔۔۔ !؟ان کے تو چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں !!!۔

وہ تیزی سے اندر داخل ہوئے اور پریشان اور گھبرائی ہوئی آواز میں امی سے مخاطب ہوئے:۔

۔''ارے غضب ہو گیا، سلیم گم ہو گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ !''۔

۔''لیکن وہ کیسے گم ہو سکتا ہے، وہ تو آپ کے ساتھ گیا تھا؟''۔

ابو کی بات سن کر امی کے تو جیسے اوسان ہی خطا ہو گئے۔امی کا سوال سنکر ابو سٹپٹا سے گئے اور بے حد فکر مندانہ لہجے میں بولے:۔

۔''ہاں وہ تھا تو میرے ہی ساتھ۔اپنا کام مکمل کرکے میں گھر کو جانے والی بس پر سوار ہوا تھا اور صبح کا وقت ہونے کے سبب بس سواریوں سے بھری ہوئی تھی اور وہ سارے وقت میرے ساتھ ہی کھڑا ہوا تھا، جب بس صدر پر ریگل کے بس اسٹاپ پر پہنچی تو مجھے ایک کام یاد آیا اور میں اسی خیال میں بس سے اتر گیا کہ وہ بھی میرے ساتھ ساتھ ہی چلتا ہوا اتر رہا ہے''۔

ابو بولتے ہوئے سانس لینے کے لئے رکے تو ایسا محسوس ہوا کہ وہ چند لمحوں کا

نہیں صدیوں پر محیط وقفہ ہے لیکن سانس لیتے ہی ابو پھر سے گویا ہوئے:۔

۔’’میں جیسے ہی بس سے اترا مجھے اندازہ ہوگیا کہ سلیم بس کے اندر ہی رہ گیا ہے لیکن ابھی میں دوبارہ بس پر سوار ہوتا کہ بس فوراً ہی چل پڑی اور میں اسکے پیچھے دوڑتا اور آوازیں ہی دیتا رہ گیا لیکن بس انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ نکل گئی‘‘۔

ابو کے خاموش ہوتے ہی امی نے تو جیسے سوالوں کی ایک بوچھاڑ ہی کر دی:۔

۔’’ارے آپ نے تھانے میں اطلاع کی یا نہیں؟

آپ یہاں کیوں چلے آئے؟

آپ اس بس کے آخری اسٹاپ والے اڈے کیوں نہ گئے؟

‘‘آپ تو اخبار میں کام کرتے ہیں، آپ نے اخبار میں خبر چھپوائی کہ نہیں؟

میرے خدا! اب میں اپنے بچے کو کہاں تلاش کرونگی!!!؟‘‘۔

اتنے سارے سوالات یکمشت سن کر تو ابو کے رہ سہے حواس بھی جاتے رہے اور وہ گڑبڑا کر بولے:۔

میں تو کچھ بھی نہ کرپایا، سلیم کے گم ہونے سے میرے تو ہاتھوں کے طوطے ہی اڑ گئے،’’ مجھے اور تو کچھ نہ سوجی، میں سیدھا یہاں ہی چلا آیا‘‘۔

امی نے مزید کچھ اور کہے سنے بغیر نانی اماں کو نہ معلوم کیا کہتے ہوئے اپنا ڈوپٹہ سنبھالا اور بولیں:۔

۔''ہمیں فوراً گھر پہنچنا چاہیے، ممکن ہے کہ کوئی خداترس انسان اسے گھر پہنچانے آئے اور ہم لوگوں کو نہ پا کر واپس لوٹ جائے''۔

گھر واپسی کے سارے راستے مجھے نانی اماں کی ہزاروں بار کی سنائی ہوئی وہ کہانی شدت سے یاد آتی رہی جسمیں ایک درخت پر بنے کسی چڑیا کے گھونسلے سے اسکا ایک ننھا سا بچہ نیچے کہیں گر کر گم ہو جاتا ہے اور وہ چڑیا دیوانہ وار اِدھر اُدھر اپنے گم شدہ ننھے سے بچے کو تلاش کرتی ہے لیکن جب اسے وہ کہیں نہیں ملتا تو اسکے ننھے سے دل میں کئی طرح کے وسوسے اور اندیشے جنم لینے لگتے ہیں کہ کہیں اسے کوئی چیل کوا ہی نہ اٹھا لے گیا ہو یا پھر وہ کسی جانور کے منہ کا نوالہ ہی نہ بن گیا ہو۔

میں دل ہی دل میں دعائیں مانگتا جا رہا تھا کہ جیسے اُس کہانی میں ایک رحم دل انسان کی نظر اس چڑیا کے ننھے سے بچے پر پڑتی ہے اور وہ اسے اٹھا کر اس گھونسلے میں واپس رکھ دیتا ہے، جہاں ایک چڑیا انتہائی مُضطرب و بےچین حال میں زور زور سے چُوں چُوں کرتی دکھائی دیتی ہے ہی کی طرح سے کوئی نیک دل انسان میرے چھوٹے بھائی کو بھی گھر پہنچا دے۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ کہانیوں کے کتابوں میں پڑھے.بردہ فروشوں اور بچوں کو پکڑ کر بھکاری بنا دینے والے درندہ صفت سنگدل انسانوں کے قصے بھی میری نگاہوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔

نانی اماں کے گھر سے ہمارے گھر کا گھنٹہ بھر طویل وہ راستہ اس روز تو جیسے کٹ کے ہی نہ دیتا تھا اور اندیشے اور وسوسے تھے کہ دل و دماغ میں یلغار کئے جاتے تھے۔

جیسے تیسے کر کے وہ راستہ کٹا اور ہم لوگ اپنے گھر کے بند دروازے پر کسی کو اپنا منتظر نہ پا کر شدید مایوسی کا شکار ہوئے۔

ابو ابھی اپنے جیب سے دروازے پر لگے قفل کو کھولنے کے لیئے کنجی نکل کر دروازے پر جھکے ہی تھے کہ پڑوس کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک خاتون سلیم کا ہاتھ پکڑے برآمد ہوئیں۔

سلیم کو انکے ساتھ دیکھ کر تو مجھ سمیت امی اور ابو کے چہرے یوں کھل پڑے کہ جانوں جیسے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا ہو۔

امی نے بڑھکر سلیم کو گلے سے لگا لیا۔ سلیم کے ننھے سے چہرے پر ابتک آنسوں کی نمی کو محسوس کیا جاسکتا تھا۔ وہ تو بس چپ چاپ اور گم سم سا کھڑا یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اسٹیپر اور سچ تو یہ ہے کہ خود ہم سب پر بھی شادیِ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو۔

اس پڑوسی خاتون نے امی کو بتایا کہ کچھ ہی دیر قبل ایک مہربان صورت وفرشتہ سیرت انسان اِس سے پتہ راستہ پوچھ کر اسے یہاں لے کر آیا تھا اور آپکے گھر پر لگے قفل کو دیکھ کر اسے ہمارے حوالے کرکے چلا گیا۔

یہ آج سے کوئی 32 - 35 سال پرانا سچا واقعہ ہے۔

کل (مورخہ 20 اگست) کو فیس بک پر قائم اردو لٹریری فورم، ''الف'' کے ہفتہ وار فی البدیہ طرحی مشاعرے میں جناب عقیل عباس جعفری صاحب کے ایک فی البدیہ شعر کو پڑھکر تو ہمیں فوراً ہی سے کراچی کی موجودہ صورتحال یاد آگئی اور پھر اسی حوالے سے شہرِ کراچی کی بے شمار ماؤں کے لختِ جگروں اور نورِ نظروں کے اغوا اور پھر بے گناہ لرزہ خیز اموات کی کہانیاں نگاہوں میں پھر سی گئیں:۔

کیا سنائیں شہر دل کا ماجرا
کونسا گھر ہے جہاں ماتم نہیں
(عقیل عباس جعفری)

ایک لحظہ دل نے سوال کیا کہ کیا یہ وہ وہی کراچی ہے جہاں ایک گمشدہ بچے کو کسی نہ معلوم اجنبی نے بناء کسی صلے و ستائش کی تمنا کے خاموشی سے گھر پہنچا کر اپنی راہ لی تھی؟ اور ایک آج کا کراچی ہے کہ بچہ ہو یا جوان یا پھر کوئی پیر صد سالہ، کسی کی بھی جان کا کوئی احترام و تقدس باقی نہیں رہ گیا۔

سونے پہ سہاگہ یہ کہ لوگ کیڑے مکوڑوں کی مانند مارے جارہے ہیں اور اِسی شہر میں بستے دوسرے انسان تو اس سے یوں لاتعلق و بے پرواہ ہیں جیسے انسان نہ مر رہے ہوں سچ مچ وہ کوئی حشرت الارض جیسی ہی کوئی بے وقعت مخلوق ہوں۔

لگتا ہے کہ ہم تو ان کوؤں سے بھی گئے گزرے ہوگئے ہیں کہ جو اپنے ایک ساتھی کی موت پر کائیں کائیں کرکے سارے شہر کے کوے جمع کر لیتے ہیں اور وہ سب ملکر شور مچا مچا کر سارا شہر سر پر اٹھا لیتے ہیں۔

یہاں شہر کراچی ہی ایک دخترِ پروین شاکر مرحومہ کی ایک حسبِ حال غزل پیشِ خدمت ہے:۔

میرے چھوٹے سے گھر کو یہ کس کی نظر، اے خُدا! لگ گئی
کیسی کیسی دُعاؤں کے ہوتے ہُوئے بد دُعا لگ گئی

ایک بازو بُریدہ شکستہ بدن قوم کے باب میں
زندگی کا یقیں کس کو تھا، بس یہ کہیے، دوا لگ گئی

جُھوٹ کے شہر میں آئینہ کیا لگا، سنگ اُٹھائے ہُوئے
آئینہ ساز کی کھوج میں جیسے خلقِ خُدا لگ گئی

جنگلوں کے سفر میں تو آسیب سے بچ گئی تھی، مگر
شہر والوں میں آتے ہی پیچھے یہ کیسی بلا لگ گئی

نیم تاریک تنہائی میں سُرخ پُھولوں کا بن کِھل اُٹھا
ہجر کی زرد دیوار پر تیری تصویر کیا لگ گئی

وہ جو پہلے گئے تھے، ہمیں اُن کی فرقت ہی کچھ کم نہ تھی

جان ! کیا تجھ کو بھی شہرِ نا مہرباں کی ہوا لگ گئی
دو قدم چل کے ہی چھاؤں کی آرزو سر اُٹھانے لگی
میرے دل کو بھی شاید ترے حوصلوں کی ادا لگ گئی
، میز سے جانے والوں کی تصویر کب ہٹ سکی تھی مگر
درد بھی جب تھما، آنکھ بھی جب ذرا لگ گئی
شاعرہ: پروین شاکر

اے پتر ہٹاں تے نیئں وکدے

"ان بچوں کی عمر کیا ہے؟"۔

کاونٹر پر بیٹھی خاتون نے مجھ سے دریافت کیا۔

"۔"جی یہ ہی کوئی چار ہفتے

میں نے قدرے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

۔"ہمیں افسوس ہے کہ ہم یہ بچے آپ سے نہیں لے سکتے ہیں، کیونکہ یہ ابھی ماں کے دودھ پر ہی ہیں"۔

یہ جواب سن کر میں نے اپنی بیٹی ایمان کی طرف مایوسی سے دیکھا لیکن پھر فوراً کچھ یاد آنے پر اس خاتون سے دوبارہ مخاطب ہوا:۔

۔"لیکن اب تو ان بچوں نے ٹین میں پیک تیار شدہ غذا بھی کھانا شروع کردی ہے؟"۔

۔لیکن پھر بھی جب تک یہ بچے آٹھ ہفتے کے اور انکا وزن دو پونڈ نا ہو جائے ہم انہیں نہیں لے سکتے ہیں۔

ایک بار پھر میری، ایمان اور علی کی نگاہیں چار ہوئیں اور پھر ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے یہ کہا:۔

لگتا ہے کہ یہاں تو اپنی دال گلنے والی نہیں !"۔ "

لیکن میں نے اپنے دونوں بچوں کی آنکھوں سے ابلتی خوشی کو ضرور بھانپ لیا تھا۔

بحر حال میں، ایمان اور علی واپس جانے کے لیے مڑے ہی تھے کہ پھر اس خاتون کی صدا پر ہم واپس پلٹنے پر مجبور ہوئے:۔

۔"دیکھیں اگر آپ ان بچوں کو اپنے پاس رکھنے سے قطعاً معذور ہیں تو اس ادارے سے رابطہ کریں۔ بس زرا آگے اگلی گلی ہی میں واقع ہے، ممکن ہے وہ اس سلسلے میں کچھ آپ کی مدد کر سکیں، اسمیں انکا نام پتہ اور فون نمبر درج ہے"۔

خاتون نے مجھے ایک کاغذ کی چٹ پکڑاتے ہوئے کہا:۔

۔"اور ہاں ان بچوں کے آٹھ ہفتے کی عمر کے ہو جانے کے بعد بھی انہیں ہمارے ادارے میں داخل کرنے کی لازمی شرط یہ ہے کہ ان کے ہمراہ انکی ماں کو بھی لایا جائے، ماں کا دودھ لازماً خشک ہوچکا ہو اور پھر ہمارے ادارے ہی میں اُسے حمل بندی کے عمل سے گزار کر آپ کے حوالے کرکے بچوں کو ادارہ رکھ لیگا اور اسکے لیئے آپکو پیشگی اپائنٹمینٹ لینا ہوگا اور ساٹھ ڈالر فیس بھی جمع کروانا ہوگی"۔

خاتون کا شکریہ ادا کرکے اُس دوسرے ادارے کی جانب روانہ ہوئے اور تھوڑی ہی تلاش کے بعد ہم سب ایک بار پھر کاونٹر کے پیچھے بیٹھی ہوئی ایک دوسری خاتون کے سامنے کھڑے ہوئے تھے اور اُس نے بھی ہمیں وہی بات کہی جو ہم پہلے ادارے میں سن کر آرہے تھے، البتہ اس کاونٹر کے پیچھے کمرے میں ایک میز پر رکھے کمپیوٹر پر کام کرتی ایک دوسری خاتون کے دریافت کرنے پر میں نے بچوں کو ادارے کو دینے کی وجہ بتاتے ہوئے کہا:۔

۔"دراصل یہ میری بیٹی ایمان کی بلی کے بچے ہیں ان بچوں کے سارے جسم میں بے تحاشہ جوئیں پڑ گئیں ہیں اور ہم نے بازار میں دستیاب جوئیں مار شیمپو بھی استمال کر کے دیکھا ہے لیکن کوئی افاقہ نہیں ہورہاہے، ان بچوں کی کل تعداد چھے ہے اور ایک تو میں اپنے بچوں کے اصرار پر انکے لیے گھر ہی چھوڑ آیا

ہوں اور ایک بچہ میرے بیٹی نے اپنی ایک ہم عمر سہیلی کے حوالے کردیا ہے اور اب یہ بقیہ چار بچے ہم کسی ایسے ادارے کے حوالے کرنا چاہتے ہیں جو نا صرف انکا مناسب خیال رکھیں اور کوئی مناسب خاندان ادارے کی توسط سے انہیں (ایڈآپ) گود لے لیں، اسی مقصد سے ہم پہلے ”ہیومین سوسائٹی“ کے دفتر بھی گیئے تھے"۔

میری بات سن کر وہ ہی خاتون پھر بولی:۔

۔"دیکھیں اگر معاملہ محض جوؤں ہی کا ہے اور جوئیں مار شمپو کام نہیں کررہا تو اسکے لیے توایک انتہائی موثر پل (گولی) دستیاب ہے جو ان بچوں کو کھلا کر جوؤں کا مکمل وتادیر خاتمہ کیا جاسکتا ہے اور ہمارے ادارے ہی میں انہیں یہ گولی کھلا دی جائے گی"۔۔"جی ضرور۔۔۔۔۔۔۔! اگر ایسا ممکن ہے تو بہت ہی اچھا ہے!!!"۔

اس خاتون نے فوراََ ہی ایک اور خاتون کو طلب کیا۔ یہ ایک دبلی پتلی سے ادھیڑ عمر کی گوری خاتون تھی اور اس نے کاونٹر آفس سے باہر آکر وہ چھوٹا سا ڈبہ (پیٹ کیریئر) میرے ہاتھ سے لے لیا جس میں وہ چار عدد بلی کے چھوٹے چھوٹے بچے رکھے تھے۔ اس نے وہ ڈبہ کھولا تو اسمیں وہ چاروں بچے ایک دوسرے سے لگے

ہانپ رہے تھے جسے دیکھ کر وہ افسوس زدہ و دکھی لہجے میں بولی:۔

۔"اوہ! ویری بیڈ۔۔۔۔۔!!!"، "یہ ڈبہ تو ان کے لیے بہت ہی چھوٹا ہے اور انہیں اسمیں گرمی لگ رہی ہے، زرا دیکھیں تو یہ سب کیسے ہانپ رہے ہیں"۔

اس نے ان بچوں کو ڈبے سے نکالا اور ایک اور خاتون مدگار کو طلب کیا اور پھر ان بچوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کر دیا اور پھر بولی:۔

ان سب میں تو کافی تعداد میں جوئیں پھیل گئیں ہیں، اس عمر کے بچوں میں جوئیں کافی" خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں اور چونکہ یہ انہی کے خُون پر پروان چڑھتی ہیں، یہ مر بھی سکتے ہیں لہذا پہلے تو ان کو ایک خاص جوؤں مار شیمپو سے غسل دینا ہوگا اور پھر انہیں وہ خاص گولی کھلائی جائیگی جو ان بچوں کے خون میں سرایت کرکے موجودہ اور بعد کو ہونے والیں جوؤں کا بھی خاتمہ کر دیگی"۔

اس خاتون کی باتیں سن کر ایمان میرے کان میں سرگوشیانہ انداز میں بولی:۔۔"ڈیڈی۔۔۔۔! کیوں نا ہم دیگر دو بچوں اور" کٹو" (ایمان کی بلی کا نام) کو لے آئیں، اسطرح سے انکو بھی اس خاص جوئیں مار شیمپو کے غسل کے

ہمراہ وہ جوئیں مار گولی میسر آسکے گی"۔
ایمان کی بات سن کر میں نے اسکی طرف تحسین آمیز نظروں سے دیکھا اور پھر اس خاتون سے کہا:۔
"اگر آپ کی اجازت ہو تو ہم دیگر دو بچوں اور انکی ماں کو بھی لے آئیں اور تب تک ان بچوں کو آپ اپنے پاس ہی رکھیں، ہمیں کوئی آدھ گھنٹہ کے لگ بھگ واپسی میں لگ جائے گا"۔
اسکی اجازت پا کر ہم ایک بار پھر اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے اور واپسی میں ہمیں کوئی گھنٹہ بھر سے بھی زائد وقت لگ گیا اور میں سارے راستے یہ ہی سوچتا رہا کہ شاید وہ لوگ ہمارے بارے میں یہ سوچ رہے ہونگے کہ یہ لوگ آدھے گھنٹے کا کہہ، بلی کے بچوں سے گلو خلاصی کروا کر باآسانی رفو چکر ہوگئے ہیں اور مذید برآں یہ کہ ان لوگوں نے بناء کوئی نام واتہ پتہ لئے بغیر ہی ہمیں آخر جانے ہی کیوں دیا؟ یہ بھی تو ممکن تھا کہ ہم واپس ہی نا آتے۔
بحرحال ہماری واپسی پر اس خاتون نے دیگر دو بلی کے بچوں اور انکی والدہ محترمہ کو انتہائی عقیدت واحترام کے ساتھ ہمارے سامنے ہی ایک کمرے میں نصب

بڑے سے سنک میں ایک خصوصی خوشبو دار جوئیں مار شیمپو سے غسل دیا اور پھر
بڑے پیار سے ان کے بالوں میں ایک سٹیل کی کنگھی سے تمام مردہ جوئیں جدا کیں، پھر
انہیں جوؤں سے بچاؤ کی گولیاں بھی کھلائیں اور پھر بہت ہی پیار اور احتیاط کے ساتھ
دونوں بچوں اور انکی اماں کو نرم و ملائم تولیوں سے اچھی طرح سے خشک کیا اور مجھ سے
مخاطب ہوئیں:۔
میں آپکو ان بچوں کی آسان آمدورفت کے لیئے ایک بڑے سائز کا "پیٹ کیریئر"، ان "
کی ماں کے لیئے ایک علیحیدہ سے بڑا والا "پیٹ کیریئر" اور ان کے رہنے کی خاطر لوہے
کی جالیوں سے بنا ایک بڑا فولڈنگ پنجرہ بھی دے رہی ہوں جسمیں یہ تمام کے تمام بچے
بمعہ اپنی ماں کے آرام سے رہ سکتے ہیں"۔
اور انکی قیمت کیا ہوگی؟"۔"
میں نے خاتون سے سوال کیا۔
جی نہیں۔۔۔۔۔انکی کوئی قیمت نہیں، یہ ادارے کی طرف سے آپکو بطور لون دیئے "
جارہے ہیں، جب ان اشیاء کی ضرورت نا رہے تو آپ انہیں ہمارے ادارے کو واپس
کردیجیئے گا تاکہ اسے مزید کسی اور ضرورت مند کو دیا جاسکے"۔

اور پھر وہ تینوں چیزیں جن کی بازار کی قیمت کم و بیش 100 / 150 ڈالروں سے بھی زائد بنتی تھی، ہمیں بناء کسی نام پتے یا ضمانت کے اللہ بھروسے دے دی گئیں۔۔۔۔۔۔۔۔!!!۔

یہ آج سے چند ماہ قبل کا واقعہ ہے اور اس واقعے کو پڑھ کر یقیناً آپکو سب کو امریکی معاشرے میں جانوروں سے محبت اور ان سے انکے مشفقانہ رویئے کا کچھ اندازہ تو ضرور ہوا ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی مدِ نظر رکھیں کہ ہمارے نام نہاد اسلامی معاشرے میں انہیں کافر اور نا جانے کیا کیا کچھ کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔ اس واقعے کو پیش کرنے کے بعد اب میں پڑھنے والوں کی خدمت میں ایک دکھی باپ کی دکھ بھری بپتا پیش کرتا ہوں کہ کس طرح سے مسیحا کے روپ میں ایک پتھر دل انسان نے والدین کی آنکھوں کے سرور اور دل کے چین کو ان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے دور کر دیا اور سب کے سامنے یہ سوال رکھتا ہوں کہ:۔

کیا ہمارے معاشرے میں ایک انسان کے بچے کی حیثیت ایک بلی کے بچے سے بھی کمتر ہے۔۔۔۔۔۔؟

/\/

اکتوبر کی ایک اتوار میرا ڈیڑھ سالہ لخت جگر زین احتشام پانی کی بالٹی میں ہاتھ مار کر چھینٹوں سے کھیل رہا تھا۔ اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ سر کے بل بالٹی میں جا گرا ۔اس کی ماں نے اسے فوراً نکالا لیکن پانی اس کے حلق میں چلا گیا اور وہ گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ اسے اٹھا کر فوراً قریبی چائلڈ سپیشلسٹ ڈاکٹر اصغر چوہدری کے کلینک لے جایا گیا۔ مگر اس بدبخت ڈاکٹر نے جب یہ سنا کہ بچہ پانی میں گر گیا ہے تو اس نے اسے فرسٹ ایڈ دینے سے انکار کر دیا۔ اور یہی کہتا رہا اسے سرکاری ہسپتال لے جائیں ہم 10 منٹ تک اس کی منت سماجت کرتے رہے کہ آپ پیڈز ڈپلومہ ہولڈر، چائلڈ سپیشلسٹ ہیں اس لیے سرکاری ہسپتال کے ایم او سے زیادہ قابل ہیں سو ہم اسی لئے آپ کے پاس لائے ہیں مگر اس دو منزلہ ہسپتال کے مالک ڈاکٹر اصغر نے کہا کہ نہیں میں اسے ٹریٹمنٹ نہیں دے سکتا۔ میرا دماغ نہ کھاؤ۔

ہم روتے پیٹتے، ہچکیاں لیتے اپنے بچے کو اٹھا کر سرکاری ہسپتال کی طرف بھاگے۔ ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی زین نے آخری قے کی اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ اس سفاک اور درندہ صفت ڈاکٹر کی وجہ سے ایک ہنستا کھیلتا معصوم بچہ اپنی جان سے گیا۔ ایک گو میں صف ماتم بچھ گیا۔ ایک ماں کی گود اجڑ گئی

۔ایک باپ کا کلیجہ پھٹ گیا۔
ایک دو روز بعد خود یونین آف جرنلسٹ نے اس ڈاکٹر کی سفاکی کے خلاف نیوز اخبارات میں لگوائیں ۔ لیکن بحیثیت ایک باپ اور انسان میں نے کوئی بھی ایکشن لینے سے پہلے ڈاکٹر کو فون کیا اور پوچھا کہ آپ نے زین کو فرسٹ ایڈ کیوں نہیں دی ۔ تو اس درندے ڈاکٹر نے برملا کہا کہ ڈاکٹری قانون میں بھیگے ہوئے بچے کو ہم فرسٹ ایڈ نہیں دے سکتے ۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب اگر آپ کا اپنا بچہ یوں بھیگ جاتا تو آپ بحیثیت ڈاکٹر اسے خود چیک کرتے یا ایم او کے پاس ہسپتال لے جاتے تو اس نے کہا ہسپتال لے جاتا۔ آپ ہی بتایئے یہ کون سا قانون ہے جو ایک ڈیڑھ سالہ معصول بچے کو چیک کرنے سے روکتا ہے۔ میری سینئرز ڈاکٹرز سے بات ہوئی تو سب نے کہا کہ ایسا کوئی قانون ہے ہی نہیں ۔ وہ صرف اپنی رپوٹ بچانے کے لئے ایسے مریض ہینڈل ہی نہیں کرتا کہ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو اس کی دوکانداری متاثر ہو گی ۔
یہ کیسی دوکانداری ہے یہ کیسی چور بازاری ہے ۔ خدا را اس ڈاکٹر کے خلاف جہاد میں میرا ساتھ دیں ۔ وہ پہلے بھی اسی طرح کئی معصوم پھولوں کی جان لے چکا ہے مجھے تو 100 فیصد یقین ہے کہ یہ ڈاکٹر ہے ہی نہیں ۔ اس کی ڈگریاں چیک کی جائیں ۔ اور اس سے پوچھا جائے کہ یہ انتہائی نگہداشت یا زخمی

مریضوں کو چیک کیوں نہیں کرتا۔کیا یہ صرف نزلہ اور گلہ ہی کی دوائی دے سکتا ہے۔ آفس میں جاب بھی کرتا ہے۔EDO ڈاکٹر اصغر گورنمنٹ ملازم ہے 18 ویں سکیل میں وہاں حاضری لگا کر آجاتا ہے۔اور سارا دن دوکانداری کرتا ہے۔

میری حکام بالا سے گزارش ہے کہ اس کی محکمانہ کاروائی کی جائے آج سے میں ملک گیر احتجاج کا اعلان کرتا ہوں ۔ میں تب تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک اسے قرار واقعی سزا نہ دی جائے ۔ انشاءاللہ آئندہ اور کوئی زین اس درندے کے ہاتھوں نہیں مرے گا۔

حق اور سچ کی جنگ میں ۔۔۔ میرا ساتھ دیجیئے ۔اگر ہم آج متحد ہو گئے تو معاشرے سے ایسی کالی بھیڑوں کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔

ایک سوگوار اور دکھی باپ

احتشام جمیل شامی

ڈسٹرکٹ چیئر مین : قومی امن کمیٹی و بین المذاہب ہم آہنگی

وزارت داخلہ ۔ حکومت پاکستان)۔

چیف ایڈیٹر: ہفت روزہ گرد و نواح اوکاڑہ

آوے ہی آوے تے جاوے ہی جاوے

"دعا کیجیئے گا کہ جو بھی آئے خدا کرے کہ وہ ہمارے ملک کے حق میں بہتر ثابت ہو"۔

اتنا کہہ کر اس نے گھڑی میرے ہاتھ میں تھما دی اور میں نے اسکی مقررہ اجرت یعنی کل 3 ڈالر اسکی طرف بڑھا دیئے جسے اس نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا۔اور میں سارے راستے یہ ہی سوچتا رہا کہ آخر اس نے مجھے کہ جسے امریکا آئے بمشکل چند روز ہی تو ہوئے ہیں یہ کیوں کہا کہ :۔۔

۔"دعا کیجیئے گا کہ جو بھی آئے خدا کرے کہ وہ ہمارے ملک کے حق میں بہتر ثابت ہو"۔

اسی سوچ میں غلطاں و پیچاں میں ماموں کے پاس پہنچا اور انکے ہاتھ میں گھڑی تھما دی اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوال کرتے میں نے بناء کسی توقف کے ان پر سوال داغ دیا۔۔

۔"ماموں، اس گورے دکاندار جسکے پاس آپ نے مجھے گھڑی میں بیٹری دلوانے کو

بھیجا تھا مجھ سے یہ کیوں کہا کہ :۔

۔"دعا کیجیئے گا کہ جو بھی آئے خدا کرے کہ وہ ہمارے ملک کے حق میں بہتر ثابت ہو"۔

میری بات کے جواب میں ماموں کے چہرے پر ایک بڑی ہی بھرپور مگر معنی خیز سی مسکراہٹ پھیل گئی اور پھر قدرے توقف کے ساتھ وہ میری جانب دیکھتے ہوئے بولے :۔۔

۔" ارے بھئی جیسے کہ تم خود بھی جانتے ہو کہ ابھی تمھارے امریکا آنے سے غالباً دو روز قبل ہی صدارتی انتخابات ہوئے ہیں اور امریکی ریاست فلوریڈا میں پڑھنے والے چند مشکوک ووٹوں کے سبب امریکی صدارت کے دونوں امیدواران جارج بش اور الگور کے درمیان حقیقی فاتح کا فیصلہ نہیں ہو پارہا ہے اور معاملہ امریکی سپریم کورٹ تک جا پہنچا ہے۔ تو اب یہ گورے صاحب جنھیں اپنے ملک سے بہت ہی زیادہ محبت ہے، ہر روز اس وجہ سے مسلسل روزے رکھ رہے ہیں کہ خواہ کوئی ہی کیوں نا صدر بنے لیکن جو بھی آئے وہ ملک کے حق میں بہتر ثابت ہو اور ہر ملنے جلنے والے کو بھرپور تاکید کرتے ہیں کہ وہ خدا سے یہ دعا کرے کہ اس تنازعہ کے طے ہو جانے کے بعد جو بھی بطور صدر آئے وہ ملک کے مفاد میں بہتر ثابت ہو"۔

ماموں کچھ دیر سانس لینے کو رکے ہی تھے کہ میں نے ایک عدد اور سوال ان پر داغ دیا:۔۔
۔"کیا عیسائی بھی روزہ رکھتے ہیں؟"۔۔"ہاں بھئی، کیوں نہیں، وہ محض کھانے سے گریز کرتے ہیں البتہ پانی اور جوس کی ممانعت نہیں ہوتی اور ہاں یہ جو گورا ہے نا، بھائی بڑا ہی ایماندار اور مخلص ہے، یہ ہی دیکھ لو نا کہ گھڑی میں نئی بیٹری ڈالنے کے محض 3 ڈالر "ہی لیتا ہے۔
ماموں نے بڑے ہی فخر و مسرت کے ساتھ انکشاف کیا۔
۔"ارے ماموں جان، کچھ تو خدا کا خوف کریں، " محض 3 ڈالر"۔
میں نے " محض 3 ڈالر" پر خاص الخاص روز ڈالتے ہوئے نہایت ہی تعجب آمیز لہجے میں کہا:
۔"آپکو کچھ معلوم بھی ہے کہ 3 ڈالروں کے 180 پاکستانی روپے بنتے ہیں اور اتنے میں تو پاکستان میں ایک نئی گھڑی خریدی جا سکتی ہے اور آپ کہہ رہے ہیں

محض تین ڈالر"۔ (2000 میں ایک امریکی ڈالر 60 روپوں ہی کا ہوا کرتا تھا)۔

۔" بھائی تم ابھی نئے نئے امریکا آئے ہو، تمھیں ابھی امریکی آٹے دال وغیرہ کا بھاؤ کچھ نہیں معلوم، دوسری جگھوں پر بیٹری بدلونے کے 10 اور کہیں کہیں تو 15 ڈالروں تک بھی وصول کیئے جاتے ہیں"۔

میرا ذہن ایک بار پھر گھڑی کی بیٹری بدلوانے کے بھاؤ تاؤ سے باہر آ کر اس امریکی گورے اور امریکی صدرارتی انتخابات کے تانے بانے میں جا الجھا۔

میں امریکی انتخابات سے صرف دو روز قبل ہی امریکا میں ماموں جان کے پاس وارد ہوا تھا اور آنے سے قبل ہر لمحہ اپنے تصورات میں امریکی صدرارتی انتخابات اور امریکا میں انکی گھما گھمی، امیدوارن کے انتخابی نعروں سے لبریز بینروں کو سڑکوں اور شاہراؤں پر آویزاں، گلی کوچوں اور چوراہوں پر قائم ان کے جماعتی پرچموں سے سجے سجائے کیمپوں میں حمایتی و کارکنان کو لاوڈ اسپیکروں پر اپنے اپنے من پسند لیڈران کے حق میں نعرے بلند کرتے:۔

۔" میرا لیڈر آوے ہی آوے تے تیرا لیڈر جاوے ہی جاوے"۔

اور پھر سر پھرے و جیالے سیاسی کارکنان لاؤڈ اسپیکروں پر اپنے مدِ مقابل قائم کیمپ میں موجود اپنے ہی جیسے دیگر سیاسی کارکنان کو برسرِ عام للکارتے اور انکی شان میں وہ کچھ کہتے سنائی دیتے کہ کچھ نا ہی پوچھیں تو ہی بہتر ہے۔ یادش بخیر، یہ میری نوجوانی کے دور کا واقعہ ہے، نئی نئی جوانی اور دماغ میں انقلابی خیالات، ایسے میں ایک سیاسی جماعت کے خیالات اپنے انقلابی خیالات سے بہت قریب نظر آئے، کوئی 25 ایک سال پہلے کا قصہ ہے، انتخابات کا دور تھا اور مزارِ قائد پر اس جماعت کا عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا تو بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ میں پیچھے رہ جاتا، اپنے دیرینہ دوست منیر علی کے ہمراہ اپنے سینے پر اس سیاسی جماعت کے پرچم کا بیج آویزاں کیئے جلسے میں جا شریک ہوا اور ہر زندہ باد و مرباد اور آئے ہی آئے تے جاوے ہی جاوے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور جلسے کے اختتام پر ہم دونوں پیدل ہی گھر کی جانب روانہ ہوئے۔ رستے میں ایک ایسے علاقے سے گزر ہوا کہ جو اس مخصوص سیاسی جماعت کے مخالفین کا گڑھ تھا۔ میرے اور منیر کے سینے پر آویزاں پرچمی بیج کو دیکھ کر چند شریر نوجوانوں نے اس سیاسی جماعت کے لیڈر سے وہ وہ رشتے جوڑے کہ اگر اسکا ذکر میں نے یہاں کر دیا تو بہت سے دوست مجھے اپنی فیس بک سے فوری طور پر خارج کردینگے لہٰذا اس ہر ہر دہ ہی پڑا رہنے دیں۔ ہاں البتہ اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ہم نے اس دن سے بعد سے میں نے اور دوست منیر علی نے عوام الناس کی اسقدر بھرپور سیاسی رواداری کا کھلم کھلا مظاہرہ دیکھ کر نا صرف

اس قسم کے سیاسی بیجوں سے اور پھر دھیرے دھیرے سیاسی جماعتوں سے بھی مکمل کنارہ کشی اختیار کرلی۔

بہرکیف، جب وہ نعرے لگاتے لگاتے تھک جاتے تو پھر اسی لاوڈ اسپیکر پر پاکستانی فلموں کی پیروڈی میں انکے لیڈران اور انکی جماعت کے حق میں بنائے گئے نغمات نشر کیئے جارے ہیں مثلاً:۔

مظلوموں کا ساتھی ہے میرا لیڈر

تیرا اور میرا ساتھی ہے میرا لیڈر

جیئے جیئے جیئے جیئے میرا لیڈر

ہارے ہارے ہارے ہارے تیرا لیڈر

ملک بھرکے در و دیوار سیاسی لیڈران اور انکی جماعت کے انتخابی نعروں سے سیاہ ہورہی ہونگی اور ہر بجلی کا کھمبہ، کھمبہ کم اور سیاسی جماعتوں کے پرچموں سے لدا پھندا کوئی آفیشل فلیگ پوسٹ نظر آرہا ہوگا۔

لیکن جب ہوائی اڈے سے باہر آنے کے بعد ہوسٹن جیسے عظیم الشان شہر اور پھر کم و بیش چار گھنٹے تک مسلسل گاڑی میں منزلِ مقصود کی جانب رواں دواں رہنے کے باوجود انتہائی شدید کوشش کے بھی اوپر بیان کردہ میرے تصوراتی مناظر میں سے کوئی ایک بھی منظر ڈھونڈے نا نظر آیا تو مجھے اپنے پاکستانی اخبارات کی ان تمامتر خبروں پر شک ہونے لگا کہ جسکے مطابق 6 نومبر کو امریکی صدارتی انتخابات منعقد کیئے جانے والے ہیں۔

بھلا بتائیں، جس ملک اور ملک بھی کونسا کہ جسکے انتخابات پر دنیا کا بچہ بچہ یوں نگاہیں جمائے بیٹھا ہوتا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ جیسے ان انتخابات میں امریکی مستقبل کا فیصلہ نہیں بلکے خود اسکے اپنے مستقبل کو فیصلہ ہونے کو ہو اور خود اس ملک کی اپنی فضاء کا عالم بقول شاعر کچھ یوں ہے:۔

جانے نا جانے گل ہی نا جانے باغ تو سارا جانے ہے

اور اس بھی بڑھ کر حیرت تو مجھے عین اس روز ہوئی کہ جب وہ معرکہ بپا ہوتا تھا یعنی 6 نومبر کو۔ میں صبح اس امید سے بیدار ہوا کہ آج تو امریکا بھر میں عام تعطیل ہوگی اور لوگ باگ آج میری اس حسرت کو پورا کرتے نظر آئیں گے کہ جسکا تصور دل و دماغ میں لیئے امریکا آیا تھا لیکن یہ جان کر شدید

مایوسی ہوئی کہ آج کوئی عام تو کیا خاص تعطیل تک نہیں، سب لوگ اپنے کام کاج پر آ جا رہے ہیں اور اسی دوران جس کو جیسے موقعہ مل رہا ہے وہ اپنا ووٹ بھگتا رہا ہے۔ نا کوئی سیاسی کارکنان اور نا ہی کوئی انتخابی کیمپ آفس اور تو اور اپنے حق میں ووٹ ڈلوانے کیلئے وٹروں کو گھیر گھار کر لے جانے کی نیت سے چلائیں جانے والی بسیں تک بھی کہیں دکھائیں نا دیں، نا سڑکوں پر گشت کرتی پولیس یا فوج ہی نظر آئی۔

میں دل ہی دل میں امریکی قوم پر افسوس کرتا رہ گیا کہ انہوں نے کس آسانی سے ہاتھ آیا عام تعطیل کا موقعہ کس کمال لاپروائی سے گنوا دیا اور انہیں اس چھٹی کے چھٹ جانے کا چنداں کوئی غم نہیں بقول حضرت علامہ اقبال:۔

وائے ناکامی ! متاع کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

آج اس بات کو کوئی 12 برس کا عرصہ بیت چکا ہے اور آج پھر 6 نومبر ہے اور صبح بسلسلہ روزگار اٹلانٹا شہر کی سڑکوں اور شاہراہوں سے گزرتے ہوئے میں نے ایک بار پھر اسی سابقہ بے پروائی اور لاتعلقی کے وہی دیرینہ مناظر کو دیکھا اور خلافِ معمول ایک سڑک کے کنارے قائم شدہ چرچ کی عمارت کی باونڈری کو

امریکی پرچموں سے آراستہ دیکھ کر مجھے وہ گورا امریکی یاد آگیا جس نے مجھ سے کہا تھا کہ:۔

۔"دعا کیجیئے گا کہ جو بھی آئے خدا کرے کہ وہ ہمارے ملک کے حق میں بہتر ثابت ہو"۔

پاکستان میں بھی انتخابات قریب ہیں اور مجھے نہیں معلوم کہ یہاں امریکا میں اس صدرارتی انتخاب کا فاتح کون ٹھرتا ہے (کیونکہ اس وقت شام کے کچھ چار بجے ہیں اور انتخابی معرکہ ہنوز جاری ہے)۔

لیکن میرا دل اپنے وطنِ اول اور وطنِ ثانی کے لیئے یہ ہی دعا مانگ رہا ہے:۔

۔"جو بھی آئے خدا کرے کہ وہ ہمارے ملک کے حق میں بہتر ثابت ہو"۔

آمین

اللہ ہر ماں کو تجھ سا بیٹا عطا کرے

۔"اللہ ہر ماں کو شہزاد جیسا بیٹا عطا کرے"۔
خالا عطیہ شہزاد بھائی کی بلائیں لیتے ہوئے بولیں۔
۔"اے بیٹا شہزاد، زرا اِس کلموہے شاہد کو بھی کبھی کچھ عقل کے دو بول ہی کہہ دیا کرو،
کم بخت سارا وقت محلے کے بیکار لڑکوں کے ساتھ آوارہ گردی میں مصروف رہتا ہے،
کالج ختم ہوئے عرصہ بیت گیا، مجال ہے کہ جو کام کاج کی طرف اسکا دھیان بھی گیا ہو
اور یاد نہیں ہے کہ بھولے سے بھی کبھی ماں کے ہاتھ ایک ڈھیلہ ہی لا کر رکھا ہو"۔
خالہ عطیہ حسبِ معمول بغیر رکے بس بولتیں ہی چلیں گئیں۔
شہزاد بھائی اپنی دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے :۔
۔"جی خالہ آپ بالکل فکرمند نہ ہوں اور اسے میرے پاس بھجوادیں، میں اسے

سمجھا دونگا"۔

۔"اے ہاں دلہن، جب شاہد تمھارے ہاں آئے تو اسے شہزاد میاں کا جھوٹا پانی ضرور پلا دینا، کیا پتہ خدا کے حکم سے اس میں بھی اس کے سے گن آجائیں اور میں بھی اس پر اسی طرح سے فخر کرسکوں جیسے شہزاد کے امی ابو اور سارا خاندان شہزاد پر کرتا ہے"۔

خالہ عطیہ نے شہزاد بھائی کے ساتھ ہی بیٹھیں ان کی بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

نعیم نے جو کہ اس شادی ہال میں جہاں وہ سب اپنے کسی عزیز کی شادی میں شرکت کی غرض سے آئے ہوئے تھے اور خالہ عطیہ کے آنے سے قبل کافی دیر سے بیٹھا، اپنے سب سے فیوریٹ کزن شہزاد بھائی سے گفت و شنید میں مصروف تھا، شہزاد بھائی کی بیگم رفعت بھابھی کی طرف دیکھا جو خالہ عطیہ کی بات سن کر گو کہ ہلکا سا مسکرا کر سر ہلا رہیں تھیں، لیکن ان کی آنکھوں اور چہرے پر اپنے شوہر نامدار کی اسقدر تعریف و تحسین سے نمایاں ہونے والے فخر و انسباط کے گہرے سایوں کو بخوبی نوٹ کیا جاسکتا تھا۔

خالہ عطیہ تو خیر اتنا کہہ کر وہاں سے چلتیں بنیں لیکن وہ جاتے جاتے نعیم کو سوچوں کے اتھاہ گہرے سمندر میں ڈوبو گئیں۔ محض خالہ عطیہ ہی تک کیا موقوف تھا، خاندان کا ہر چھوٹا بڑا شہزاد بھائی کے گن گاتا اور بطورِ خاص خاندان کی بڑی بوڑھیاں تو جیسے ان کی گرویدہ ہی تھیں، اب وہ خالہ عطیہ ہی ہو یا عشرت پھوپھو، منجھلی ہوں یا چھوٹی ممانی سب کی ایک ہی آس اور تمنا تھی کہ اللہ انکے بچوں کو بھی شہزاد بھائی جیسا ہی بنادے۔ اور تو اور خود نعیم نے بھی اپنے دل و دماغ میں شہزاد بھائی کو ایک آئیڈیل کو درجہ دے رکھا تھا، اٹھتے بیٹھتے بس وہ تو شہزاد بھائی ہی کا دم بھرتا نظر آتا اور کیوں نا ہو، آخر شہزاد بھائی کو پورے خاندان میں جسطرح سے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا اور جو عزت واحترام انہیں نصیب تھا بھلا وہ نعیم سمیت خاندان بھر کے کسی اور لڑکے کو میسر آسکتا تھا؟

حتیٰ کہ خاندان بھر کے بزرگ مرد حضرات تک گھریلو، کاروباری اور روپے پیسے کے معاملات میں بھی شہزاد بھائی سے مشورہ کرنا ضروری خیال کرتے تھے۔ اگر جو خاندان کے کسی لڑکے یا لڑکی کے رشتے کا سلسلہ چل رہا ہو تو یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ان کے والدین مشورے کے لیئے دو چار بار شہزاد بھائی کو موبائل فون پر زحمت نا دے ڈالیں۔

اور صاحب اگر خاندان کا کوئی لڑکا خالہ عطیہ کے لڑکے کی طرح سے کام کا نا کاج کا اور دشمن دس من اناج کا ہو رہا ہو اور اماں کے ہاتھ پر ڈھیلہ پیسہ نا رکھتا ہو تو پھر اسے بھی اپنی پند و نصیحت سے راہ راست پر لانے کی پوری پوری زمہ داری شہزاد بھائی ہی کو تو سونپی جاتی اور وہ اس زمہ داری سے ہر ممکن طور سبقدوش ہونے کی کماحقہ کوشش کرتے۔

نعیم کو شہزاد بھائی جو کہ انکے بڑے ماموں کے سب سے بڑے فرزندِ ارجمند تھے اور عمر میں اس سے کوئی پانچ چھے برس بڑے تھے، پر بڑا ہی رشک آتا تھا۔

دلشاد ماموں ویسے تو سارے خاندان ہی میں بڑے ہونے کے سبب خصوصی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے اور پھر شروع ہی سے انکا روز و شور سے چلتا ہوا کاروبار، اور جس احسن طریقے سے انہوں نے اپنے گھر کو سنوارا اور تمام بچوں کی تربیت کی تھی، انہی سب باتوں کے سبب وہ ویسے ہی خاندان بھر کی نظر میں انتہائی سمجھدار شخصیت گردانے جاتے تھے اور پھر سونے پہ سہاگہ انکے بڑے فرزندِ ارجمند شہزاد جو کہ شروع ہی سے شہر کے بہترین اسکول اور کالج میں زیرِ تعلیم رہے، ہمیشہ ہی سے نمایاں تعلیمی استعداد کا مظاہرہ کیا اور پھر تعلیم سے فارغ ہو کر اپنے ابو کے پہلے سے ہی دن دونی اور رات چوگنی

ترقی کرتے کاروبار کو تو جیسے چار چاند ہی لگا دیئے۔

خاندان کی بھلا وہ کون سی لڑکی تھی جو شہزاد بھائی کے ساتھ منسوب ہونے میں اپنے لیئے فخر نا محسوس کرتی لیکن وہ تو شہزاد بھائی اپنی یونیورسٹی کے زمانے کی ایک کلاس فیلو رفعت کو دل دے بیٹھے اوراب وہ شہزاد بھائی کی شریکِ حیات ہونے کے ساتھ ہی ساتھ ان کے ایک عدد پیارے سے بیٹے کی ماں ہونے کا اعزاز بھی رکھتیں تھیں۔

قصہِ المختصر شہزاد بھائی نعیم کے لیئے ہر پہلو سے ایک آئیڈیل انسان تھے اور اسکی خواہش تھی کہ اے کاش اسکی زندگی بھی شہزاد بھائی ہی طرح سے آئیڈیل ہو جائے اور وہ بھی انہی کی طرح سے خاندان بھر کی آنکھوں کا تارا بنکر رہے اور جیسے لوگ باگ ان کی عزت اور اسقدر احترام کرتے ہیں اور اسکے مشوروں اور نصیحتوں کو معتبر جانتے ہوئے انہیں نہاہت ہی خندہ پیشانی سے سر آنکھوں پر رکھتے ہیں، اسکے ساتھ ایسے ہی پیش آئیں۔

اس کے برعکس نعیم جسکا تعلق ایک اوسط سے قدرے نیچلے طبقہ کے خاندان سے تھا اور اسکے ابو کی ملازمت سے حاصل ہونے والی محدود آمدنی جس میں اسکی اماں گھر بھر کی سفید پوشی کا بھرم بمشکل تمام رکھ پاتیں تھیں۔ کیا کیا نا جتن

کرکے انہوں نے نعیم کو میٹرک تک تعلیم دلوائی اور پھر نعیم نے ایک نجی کمپنی کے دفتر میں ملازمت اختیار کرلی اور اب ان دنوں وہ اسی شام کے کالج میں گریجویشن کے سالِ آخر کا طالبِ علم تھا۔

اس روز شادی کی تقریب سے واپس آکر بھی نعیم مسلسل شہزاد بھائی ہی کے بارے میں سوچتا رہا۔

بطورِ خاص وہ بات تو بار بار اسے یاد آتی کہ جب عطیہ خالہ انہیں شادی ہال کے اس کونے میں کرسیوں پر بیٹھا دیکھ کر ان کی طرف بڑھیں تو انہیں سب سے پہلے میں نے ہی تو سلام کیا تھا جسکا سرسری سا جواب دیکر خالہ عطیہ تو بس ایسے شہزاد بھائی سے متکلم ہوئیں کہ جیسے وہاں صرف شہزاد بھائی ہی تو موجود ہوں۔ حالانکہ وہ میری سگی خالہ ہیں، لیکن بات جہاں شہزاد بھائی کی آجائے تو پھر مجھ جیسے ایرے غیرے نتھو خیرے کی بھلا کیا دال گلنی ہے۔

-.-.-.-.-.-.-.-.-.-.-.-.-.-.-

یونہی دن گزرے رہے اور پھر ایک روز نعیم نے اعلیٰ نمبروں سے گریجویشن بھی مکمل کرڈالی۔ گو کہ آج کے دور کے لحاظ سے یہ کوئی خاص تعلیمی قابلیت نہیں گردانی جاتی، البتہ گذشتہ چار سالوں کے دوران حاصل شدہ کام کے تجربے نے بھی

اسکی بہت مدد کی اور اسے ایک اور فرم میں قدرے اچھی پوسٹ پر نئی ملازمت مل گئی۔
نعیم کی اس ملازمت کے بعد گھر کے حالات قدرے بہتر ہوئے تو اماں کو نعیم کی شادی کی فکر ہوئی۔

یہ خاندان سفید پوش سہی لیکن ان کی شرافت، سچائی، نیک چال چلن، اور اچھے مزاج کی گواہی تو سارا محلّہ دیتا تھا۔ انہی محلے والوں میں ایک خاتون جو کہ نعیم کی امی کی سال ہا سال کی رازدار سہیلی تھیں کے بھائی جو کہ ایک بڑے بنک کے منیجر تھے، کی بیٹی کا رشتہ لے آئیں۔

نعیم، اسکے سارے گھر والے اور خود اسکی اماں حیران تھے کہ یہ کہاں سے خدا نے چھپّر پھاڑ کر رشتہ بھیج دیا تھا، کیونکہ حیثت کے حساب سے تو وہ لوگ ان سے کافی بہتر تھے، لیکن اماں کی رازدار سہیلی نے انہیں یقین دلایا کہ ان کے بھائی کو اپنی بیٹی کے لیئے ان جیسا ہی شریف اور نیک چال چلن والا خاندان درکار ہے۔

بحر حال سادگی کے ساتھ یہ تعلق قائم ہوا اور جب نعیم کی دلہن رخصت ہو کر نعیم کے گھر آئی تو اسے اپنی نئی نویلی دلہن سحر اپنی اماں کی سال ہا سال کی ریاضتوں کا انعام اور اپنی زندگی میں ایک نئی صبح کا استعارہ محسوس

ہوئی۔ سحر نے آتے ہی سارے گھر والوں کا دل جیت لیا تھا اور نعیم کی اماں تو جیسے انہیں دو جہاں کی دولت ہی مل گئی ہو۔

شادی کو ایک سال ہی گزرا تھا کہ خدا نے نعیم کو ایک عدد پیاری سی بیٹی سے نوازا۔

ایک روز رات کے کھانے کے بعد جب نعیم سونے کے لیئے کمرے میں داخل ہوا تو اس وقت سحر ننھی ستارہ کو تھپک تھپک کر سلانے میں مصروف تھی۔ نعیم کو دیکھتے ہی وہ مسکرائی اور بولی:۔۔

۔"مجھے آج آپ سے بہت ضروری بات کرنا ہے"۔

۔"ہاں کہو، کیا بات ہے"۔

نعیم پلنگ پر اسکے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

۔"دیکھو نعیم اب ہم ایک بچی کے والدین بن چکے ہیں، اب ہمیں اپنے بہتر مستقبل کے لیئے کچھ سوچنا چاہیئے"۔

۔"کیا مطلب ہے تمھارا، کہنا کیا چاہتی ہو تم؟"۔

۔"میرے ابو نے کتنی بار آپ سے کہاں ہے کہ وہ آپ کو اپنے بنک سے کاروبار شروع کرنے کے لیئے قرضہ دلوا سکتے ہیں، لیکن آپ ہیں کہ سنتے ہی نہیں"۔

سحر نعیم کو سمجھاتے ہوئے ہوئے بولی۔

۔"ارے بھئی، دنیا کیا کہے گی کہ اپنے سسر کی سفارش سے قرضہ حاصل کرلیا"۔

نعیم نے سحر کو سمجانے کی کوشیش کرتے ہوئے کہا۔۔

۔"آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں، آپکو قرضہ آپکی قابلیت کے سبب ملے گا اور وہ قرضہ تو ہم واپس ادا کردینگے اور ویسے بھی کہنے والوں کا کام تو کچھ نا کچھ کہنا ہی ہوتا ہے، اگر سب ان کی باتیں سننے لگیں تو دنیا کے سارے کام ہی رک جائیں"۔

سحر نے مزید کہا:۔

۔ "دیکھیں، ابو نے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپکو کل ہی ان کے پاس بنک بھجوادوں اور ہاں انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ آپ وہ فیزیبلیٹی رپورٹ بھی ساتھ لے کر آئیں جو آپ نے چند ماہ قبل بنائی تھی اور پھر اسے لے لیکر کئی بنکوں کی خاک چھانی لیکن کسی بھی بنک نے آپکو قرضے دینے کی حامی نا بھری، حالانکہ اس وقت بھی ابو نے کہا تھا کہ آپ ان کے بنک میں اس بزنس لون کے لیئے اپلائی کریں، لیکن آپ نے ایک نا سنی"۔
خیر وہ بات اس وقت کی تھی جب نعیم باپ نا بنا تھا لیکن اب جبکہ وہ باپ بن چکا تھا، وہ بھی سنجیدہ کر سوچنے پر مجبور ہوگیا اور پھر اگلی ہی صبح وہ بنک میں اپنے سسر کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔
پھر وہ دن بھی آن پہنچا کہ جب اس نے باقاعدہ اپنے بزنس کا آغاز کردیا، لیکن اب اس نے یہ تہیہ کرلیا تھا کہ دن رات ایک کردیگا لیکن سب سے پہلے بنک کا قرضہ اتاریگا۔
وہ دن اور پھر اس کے بعد مسلسل پانچ سال تک کچھ ایسے دل لگا کر کام کیا کہ دن کو دن اور نا رات کو رات سمجھا، بنک کا قرضہ تو اسنے پہلے تین سالوں ہی

میں ادا کر دیا اور اگلے دو سالوں میں اس نے کاروبار کو مذید ترقی دیکر نا صرف کاروبار کو توسیع دی بالکل ملک کے دو بڑے شہروں میں اپنے کاروبار کی نئی شاخوں کا بھی آغاز کر دیا، اب حال تو یہ تھا کہ ننھیال ہو کہ ددھیال، دونوں اطراف میں نعیم سے زیادہ بڑا کاروبار کسی کا بھی تو نہیں تھا۔ شہر کی مضافاتی بستی سے وہ لوگ ڈیفینس کی بڑی شاندار سی کوٹھی میں اٹھ آئے تھے اور کل تک سکوٹروں پر دھکے کھانے والا نعیم اب ایک نہیں نئے نئے ماڈلوں والی کئی کئی گاڑیاں رکھتا ہے۔ان گذشتہ پانچ سالوں کے دوران نعیم صرف اور صرف کاروبار کا ہی ہو کر رہ گیا تھا، کسی شادی بیاہ اور خوشی غمی میں شرکت کرنا اسے یاد نہیں رہا تھا، ہاں اگر کچھ یاد تھا تو اپنا کاروبار۔

لیکن اب اس نے سحر ہی کے کہنے پر زندگی کی تیز دوڑتی ہوئی گاڑی کو بریک لگا کر قدرے آہستہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور آج وہ کئی سالوں کے بعد اسکے ساتھ خاندان کی ایک شادی میں شرکت کرنے جا رہا تھا۔

شادی ہال پر پہنچ کر کئی سالوں بعد آج اسکی ملاقات شہزاد بھائی سے ہوئی، ایک دوسرے سے دعا سلام ہوئی اور پھر کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر ابھی وہ دونوں گپ لگانے ایک جانب کرسیوں پر آ کر بیٹھے ہی تھے کہ اچانک سامنے سے خالہ عطیہ اپنے مخصوص لہجے میں پکارتی چلیں آئیں:۔

۔"اللہ ہر ماں کو تجھ سا بیٹا عطا کرے"۔
نعیم کو ایک بار پھر سے بے اختیار شہزاد بھائی پر رشک آنے لگا۔
لیکن یہ کیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔! خالہ عطیہ تو اسکی بلائیں لیئے جارہی تھیں.........!!!
۔
۔"اللہ ہر ماں کو نعیم جیسا بیٹا عطا کرے"۔
خالا عطیہ نعیم کی بلائیں لیتے ہوئے بولیں۔
۔"اے بیٹا نعیم ، زرا اِس کلمو ہے شاہد کو بھی کبھی کچھ عقل کے دو بول ہی کہہ دیا کرو، کم بخت سارا وقت اپنی بیوی کا دم چھلا ہی بنا پھرتا ہے، جو کماتا ہے بیوی کی ہتھیلی پر دھر دیتا ہے، یاد نہیں کہ کبھی بھولے سے بھی ماں کے ہاتھ ایک ڈھیلہ ہی لا کر رکھا ہو"۔
ایک لمحہ کے لیئے تو نعیم کو کچھ سمجھ ہی نہیں آیا کہ آخر یہ ہو کیا رہا

ہے۔

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ خالہ عطیہ کو کیا جواب دے کہ خالہ عطیہ پھر بول پڑیں۔

۔"اے ہاں دلہن، جب شاہد تمھارے ہاں آئے تو اسے نعیم میاں کا جوٹھا پانی ضرور پلا دینا، کیا پتہ خدا کے حکم سے اس میں بھی اس کے سے گن آجائے اور میں بھی اسپر اسی طرح سے فخر کرسکوں جیسے نعیم کے امی ابو اور سارا خاندان کرتا ہے"۔

ابن صفی: شخصیت اور فن" کے موضوع پر سہ روزہ قومی سیمینار

بھارتی دار لحکومت نئی دہلی جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اردو اکادمی دہلی کے اشتراک سے "
ابن صفی: شخصیت اور فن" کے موضوع پر سہ روزہ قومی سیمینار
۔14 تا 16 دسمبر منعقدہ سہ روزہ اجلاس کی کاروائی اور پیش کردہ مقالات کی مختصر
رپورٹ: امین صدرالدین بھایانی، اٹلانٹا، امریکا

بھارت کے دارالحکومت نئی دہلی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اردو اکادمی کی مشترکہ کاوشوں سے اردو جاسوسی ادب کے نابغۂ روزگار مصنف جناب ابنِ صفی مرحوم پر 14 سے لیکر 16 دسمبر 2012ء تک ایک سہ روزہ قومی سیمناز کا بعنوان "ابن صفی" شخصیت اور فن" کا اہتمام کیا گیا۔

اس سیمینار کا افتتاحی اجلاس پہلے روز یعنی 14 دسمبر بروز جمعتہ المبارک، صبح 11 بجے سی-آئی-ٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں منعقد کیا گیا۔ اس اجلاس کے مہمانِ خصوصی ہندوستانی حکومت کی وزارت برائے فروغِ انسانی وسائل کے وزیرِ مملکت جناب جتن پرساد تھے جبکہ شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ،

نئی دہلی پروفیسر نجیب جنگ کرسیِ صدارت پر فائز ہوئے۔ مذید براں ہندوستان کے وزیر برائے خوراک و رسد ہارون یوسف اور ممتاز و معروف افسانہ نگار جناب سید محمد اشرف نے مہمانانِ اعزازی کے طور پر شریک تھے۔

اس افتتاحی اجلاس کا کلیدی خطبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہی کے شعبہء اردو کے پروفیسر شمیم حنفی نے مرحمت فرمایا جبکہ اردو اکادمی کے وائس چیرمین پروفیسر اختر الواسع نے خیر مقدمی کلمات اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر شعبہء اردو پروفیسر خالد محمود جو کہ سیمنار کے کنوئیر بھی تھے، تعارفی کلمات پیش کیئے۔

راقم نے مذکورہ سیمینار کی تین روزہ کاروائی کی بھارت ہی کے متعدد اخبارات اور انٹرنیٹ پر موجود پورٹس کو یکجا کرکے ایک ایسی رپورٹ کی شکل دینے کی کوشش کی ہے جسے پڑھ کر اس سہ روزہ سیمینار کی کاروائی اور اسمیں پڑھے جانے والے مقالات سے کسی حد تک آگاہی حاصل کی جاسکتی ہے۔

پروفیسر ایمریٹس، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، شمیم حنفی کا افتتاحی اجلاس میں پیش کردہ کلیدی خطبہ:۔

آرٹ اور ادب میں عوامی روایت شامل نہ ہو تو اظہار کے نئے پیرایے وجود میں نہیں آسکیں گے۔ کوئی بھی زبان صرف کلاسیکی ادب کے ذریعے قائم نہیں رہ سکتی جب تک کہ اس میں عوامی ادب نہ شامل ہو۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر ایمریٹس شمیم حنفی نے سہ روزہ قومی سمینار کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ابن صفی کی شخصیت اور فن پر سمینار منعقد کرنا ایک جرات مندانہ اقدام ہے۔ اس طرح ابن صفی کے تخلیقی ادب کا احیا ہو رہا ہے۔ ابن صفی نے تفریحی ادب کا جو معیار پیش کیا وہ بہت غیر معمولی ہے۔ اس سمینار سے ایک بیریر ٹوٹے گا اور اب مقبول ادب پر بحث کرنے کا وقت آگیا ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے ابن صفی کی تحریروں پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ جب ۱۹۵۲ میں ان کا پہلا ناول ''دلیر مجرم'' شائع ہو کر مقبول ہوا تو ان کے ناولوں کو پڑھنے کے لیے لوگوں نے اردو سیکھنا شروع کر دیا۔

شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، پروفیسر نجیب جنگ کا خطبۂ صدارت:۔

جناب نجیب جنگ نے افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ ابن صفی کی تحریروں سے میں نے اردو زبان سیکھی اور ابن صفی کی تحریریں ہمارے لیے زاد سفر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ تقسیم کی وجہ سے اردو کو مسلمانوں کے ساتھ جوڑ دیا گیا لیکن اب وہ حالات نہیں رہے بلکہ اردو زبان

کے فروغ کے لیے سرکاری سطح پر بھی کئی اقدامات کیے جارہے ہیں۔ وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل، حکومت ہند جناب جتن پرساد افتتاحی اجلاس میں بحیثیت مہمان خصوصی شریک ہوئے اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جامعہ کے بارے میں بچپن سے سنتا چلا آرہا ہوں اور آج یہاں کی تہذیب وثقافت اور تعلیمی ماحول کو دیکھ کر بڑی خوشی محسوس ہورہی ہے۔ انھوں مزید کہا کہ میری کوشش ہوتی ہے کہ میں ان جگہوں پر جاؤں جہاں نئی فکر کے چشمے پھوٹتے ہیں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ ان میں سے ایک ہے۔ ہندوستان کی تہذیب کی صحیح عکاسی مجھے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تہذیب میں صاف نظر آتی ہے جہاں جمہوری نظریے کو اولیت حاصل ہے۔ پروفیسر عبدالحق نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہم ایک ایسے ادیب کو خراج عقیدت پیش کرنے اور اس کی تحریروں کو زندہ کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں جس کے تخلیقی سرمائے کو عوامی اور مقبول ادب کہہ کر فراموش کردیا گیا تھا۔

صدر شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، پروفیسر خالد محمود کا خطبۂ استقبالیہ:۔

صدر شعبہ اردو پروفیسر خالد محمود نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اردو کا رشتہ ہمیشہ سے چولی دامن کا رہا ہے۔ ۱۹۷۴

میں شعبہ اردو کے قیام سے قبل بھی یہاں اردو تہذیب نمایاں تھی اور شعبہ اردو کے قیام کے بعد بھی فروغ اردو کی سرگرمیوں میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ یونیورسٹی کے موجودہ شیخ الجامعہ جناب نجیب جنگ کا عہد اردو کے حق میں ایک تاریخ ساز عہد ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ شعبہ اردو کے لیے ٹیگور پروجیکٹ کی حصولیابی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ افتتاحی اجلاس میں نظامت کے فرائض پروفیسر شہپر رسول نے انجام دیے اور کلمات تشکر اردو اکادمی کے سکریٹری انیس اعظمی نے ادا کیے جبکہ ریسرچ اسکالر شاہ نواز فیاض نے تلاوت کلام پاک سے پروگرام کا آغاز کیا۔ اس موقع پر نائب شیخ الجامعہ، رجسٹرار، اساتذہ، ریسرچ اسکالرز، طلبا و طالبات کے علاوہ جامعہ کے معزز عہدیداران بھی شریک ہوئے۔

سیمینار کے دوسرے دن کے اولین اجلاس کی کاروائی:۔

مذکورہ سیمینار کے دوسرے دن کا پہلا اجلاس صبح 10:30 شروع ہوا جسکی مجلس صدارت میں پروفیسر منظر حنفی، پروفیسر زاہد حسین خاں اور جناب اے رحمٰن تشریف فرما تھے۔

اجلاس میں پیش کردہ مقالات کی تفصیلات:۔

۔1۔ محترمہ رویدا ضمیر، ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے "ابنِ صفی کا تخلیقی افق: چمکیلا عبار کے حوالے سے" پیش کیا جسمیں تحقیق کے آداب کے مطابق ایک نئے ابن صفی کو دریافت کرنے کی کوشش کر گئی۔

۔2۔ ڈاکٹر سیفی سرونجی نے ابنِ صفی اور عام قاری کے رشتے کو تلاش کرتے ہوئے ابن صفی کو برتری اور عوام الناس سے ہم رشتگی جو اپنے مخصوص انداز و عالمانہ بصیرت کی روشنی میں پیش کیا۔

۔ ڈاکٹر شان فخری نے ابنِ صفی کی انفرادی عظمت، دوررسی اور دوربینی کے اثرات 3 اپنے مقالے مین پیش کیئے۔

۔4۔ جناب عارف اقبال نے ابنِ صفی کا نصب العین اور کارنامے کا احاطہ کرتے ہوئے اردو کی ترویج اشاعت میں ابنِ صفی کی خدمات کو پیش کیا جسمیں عوام میں اردو کو مقبول عام بنانے میں خاص کردار ادا کرنے اور اسی نوع کی تحریک جگانے کا راز کھولا گیا۔

۔5۔ پروفیسر عاشق ہرگانوی نے ابنِ صفی کے جاسوسی ناولوں میں لردو کے زکر کو

اپنی عالمانہ صلاحیتوں کو پروئے کار لاتے ہوئے پیش کیا۔ انہوں نے ابنِ صفی کے یہاں طنز ومزاح کے عناصر کے چٹخارے ان کے ناولوں کے موضوع سے انصاف کرتے ہوئے اردو زبان، اسکے املا اور اصوات کے تعلق سے ابنِ صفی کے اشاروں و کنایون کے برتنے کے سلیقے اور مہارت پر خاطر خواہ بحث کی۔

5۔ فرزندِ اوپندر ناتھ اشک، جناب نیلابھ جو کہ حکومتِ ہند سے وابستہ ہیں نے ابنِ صفی کے ناولوں کے اسلوب، استفادے اور ماخذات سے بحث کرتے ہوئے بتایا کی انگریزی میں جاسوسی ناولوں کی مستحکم اور قدیم روایت پائی جاتی ہے البتہ اردو میں اس نوع کی کتب اکثر میلوں ٹھیلوں پر فروخت ہوتی رہی ہیں اور شاید اس کے لیئے آج ہم اس ادب کا محاسبہ کرنے کی شروعات اسی نوع کے ادب کے تخلیق کار ابنِ صفی جنھیں بنیاد گزار بھی کہا جاسکتا ہے کی خدمات کے اعتراف سے کر رہے ہیں۔ بیشک یہ اردو اکادمی اور شعبہ اردو جامعہ ملیہ کا لائق ستائش قدم ہے حالانکہ ہندوستان میں جاسوسی کی روایت بہت دیرپا ثابت نہ ہوسکی کیونکہ ہمارے خانگی حالات اس روایت کیلیئے سازگار ثابت نہیں ہوئے۔ سارے ادیب و قلمکار اپنے تخلیقی واقعات و سانحات کے لیے ماحول تیار کرتے ہیں۔ ابنِ صفی ماحول کی تخلیق میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

۔7۔جناب فاروق ارگلی نے ابنِ صفی کے سماجی سروکار تلاش کرتے ہوئے بتایا کہ اردو زبان وادب کی تاریخ میں نظیر اکبرآبادی کے بعد عوامی مقبولیت حاصل کرنے والا پہلا شخص ابنِ صفی ہے اور اسنے اردو کر ترویج وترقی میں اپنی تحریروں کے زرلیعہ انقلاب پیدا کیا۔ ابنِ صفی کی تقلید میں اردو اور ہندی میں کئی سیریز شروع ہوئیں لیکن ابنِ صفی کی فکری بلندی اور قدرتِ تحریر کی منزل کوئی نہ پاسکا البتہ ان نقلی ناولوں میں ابنِ صفی کا دم خم نہ سہی مگر کھپت ان ناولوں کی بھی کچھ کم نہیں تھی۔ ابنِ صفی کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے تقسیمِ ہند کے سانحے کو کسی طور پر زیرِ قلم نہیں آنے دی۔ ابنِ صفی کے سماجی سروکار چار ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔

جناب اے رحمٰن کی صدارتی تقریر:۔

پہلے اجلاس کے صدور میں سب سے پہلے جناب اے رحمٰن نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ فاروق ارگلی ایک چلتا پھرتا گنجینہ الفاظ و واقعات ہیں اور انہیں ابنِ صفی کے انداز مین کام کرنے کا موقع بھی ملا ہے۔ اردو مین جاسوسی صنفی اصطلاح کے طور پر رائج ہے جبکہ انگریزی مین ایسا نہیں ہے۔ جو چیزیں اردو امین ادب عالیہ میںن شامل نہیں ہیں وہ انگریزی اور ترقی یافتہ ممالک مین بھی اس نوع کا ادب ابھی تک ادب عالیہ میں شامل نہیں ہیں ہے۔ تاریخ کی روشنی

میں یہ بات غلط ہے کہ ابنِ صفی نے اپنے کردار کسی اور ادب سے یا دوسری زبانوں کے کرداروں سے تحریک پا کر لکھے تھے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ انگریزی اور فرانسیسی وغیرہ میں لکھے گئے ناول تحقیق کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے وجود میں آئے اور اردو میں ابنِ صفی اور انکے قبیل کے فنکاروں کی تخیلی پرواز کا نتیجہ ہے۔

اجلاس کے دوسرے صدر پروفیسر زاہد حسین خاں کی تقریر:۔

اجلاس کے دوسرے صدر پروفیسر زاہد حسین خاں نے بتایا کہ بچپن مین انہوں نے ابنِ صفی کے ناولوں سے استفعادہ کیا۔ آج کے اجلاس میں جو مقالات پڑھے گئے وہ سب نہ صرف اپنے موضوع سے انصاف کرتے ہوئے بیش بہا معلومات موجود طالب علموں کو بہم پہنچائی۔

صدرالصدور پروفیسر منظر حنفی کی صدارتی تقریر:۔

صدرالصدور پروفیسر منظر حنفی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ آج صحت کے اجازت یہ دینے کے باوجود مین یہاں اپنی ذاتی دلچسپی اور ابنِ صفی کے ساتھ انکی تحریرون سے استفادہ کا خراج پیش کرنے کی خاطر موجود رہا۔ ابنِ صفی کے

کرداروں میں عمران، فریدی، حمید، جولیانہ، ثریا، قاسم، گلہری خانم وغیرہ معلوم ہوتا ہے گوشت پوست کے کردار ہیں، وہ یہ صرف اپنی انفرادیت ہی منواتے بلکہ بے ساختہ مکالمے اور منظر نگاری کی ایسی مثال بھی پیش کرتے ہیں جسے ابنِ صفی کی نہایت خلاقانہ قدرت کا ثبوت کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے قدم کو نہ صرف اپنے ہمعصروں میں بلند کیا بلکہ ایک مینارہ بنکر ابھرے۔ ابنِ صفی کے ناولوں میں وہ عناصر موجود ہیں وہ ہمیں انکو ادب عالیہ مین شامل کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس کے حصہ جات ہماری دانش گاہوں میں نصابوں میں ضرور شامل کیئے جانے چاہیے۔

دوسرے روز کے دوسرے اجلاس کی کاروائی:۔

اجلاس 2:30 دوپہر شروع ہوا جسکی مجلس صدارت میں پروفیسر وہاج الدین علوی، جناب ایس ایم ساجد، پروفیسر شہناز انجم شامل تھے۔ جبکہ نظامت کا فریضہ ڈاکٹر کوثر مظہری نے انجام دیا۔

پروفیسر سید محمد ساجد کی صدارتی تقریر:۔

مجلس صدارت کے درمیانی رکن پروفیسر سید محمد ساجد نے اپنی مصروفیات کے پیش

نظر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ابنِ صفی کے دو تہائی ناول پڑھنے کا انہیں جو موقعہ ملا اسی کی بدولت وہ اردو زبان و ادب سے فیضیاب ہوتے چلے آرہے ہیں اور انہوں نے ابنِ صفی کے تعلق سے اب تک کے مقالات میں تشنہ رہے گوشے ابنِ صفی کی شاعری پر اپنی گفتگو کے مرکزی محور کو مرکوز رکھا اور اسرار ناروی یعنی ابنِ صفی کی شاعری کے بر محل پہلوؤں سے آگاہی بخشنے والے کلمات ادا کرتے ہوئے شاعری کی مثالیں بھی پیش کیں۔

اجلاس میں پیش کردہ مقالات کی تفصیلات:۔

۔1۔ محترمہ نوشین رحمٰن، اسکالر شعبہ انگریزی جامعہ ملیہ نے انگریزی میں اپنا مقالہ پیش کیا جسمیں انہوں نے ابنِ صفی کے کرداروں کے نفسیاتِ بشری کی خوصیات کو مختلیف زمروں کی صورت مین پیش کیا اور موثر طریقہ اظہار اپناتے ہوئے سامعین کو طلسم کی حدتک متوجہ کر لینے کا ہنر دکھایا۔

۔2۔ جناب قائد حسین کوثر نے ابنِ صفی اور شخصیت پر گفتگو کرتے ہوئے کانپور، الہٰ آباد اور لاہور کی آبادیوں پر ابنِ صفی کی تحریروں کا جائزہ پیش کیا۔

۔3۔ ڈاکٹر فرحت احساس نے اسرار ناروی یعنی ابنِ صفی اصلاً شاعر تھے لیکن

بسیار نویسی کے جھونکے انھیں ناول نویسی کی طرف لے آئے۔

۔ ڈاکٹر خالد جاوید نے اپنے مقالے میں ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ابنِ صفی 4
موزونی طبع سے شروع ضرور ہوئے لیکن انکی زہنی فکر اور انکے تخلیقی وجدان کے عکس
آخر ان کے ناولوں ہی کی بدولت ہماری یادوں اور عملی زندگی میں آج تک محفوظ ہے۔

۔5۔ جناب مختار ٹونکی نے اپنے مخصوص اسلوبِ انشائیہ نگاری کے انداز میں اپنا مقالہ
پیش کرتے ہوئے ابنِ صفی کے ناولوں اور مکالموں کی طنزیہ ومزاحیہ پرتیں کھولنے اور
ان کے بہاوکے ساتھ سامعین کا رشتہ جوڑنے کی کامیاب کوشش کی۔

سہ روزقومی سیمینار ''ابن صفی: فن و شخصیت ''اکے تیسرے روز کی کاروائی:۔

شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ بہ اشتراک اردو اکادمی، دہلی کے زیراہتمام سہ روزہ سیمینار
ابن صفی: فن و شخصیت'' کے تیسرے دن کے تیسرے اجلاس کی ابتدا صبح ساڑھے ''
دس بجے ہوئی

جس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر عبدالحق اور ڈاکٹر ایم۔ اے۔ ابراہیمی نے کی جب کہ نظامت کا فریضہ ڈاکٹر احمد محفوظ نے انجام دیا۔

اجلاس میں پیش کردہ مقالات کی تفصیلات:۔

۔1۔ ڈاکٹر عمران عندلیب نے پہلا مقالہ پیش کیا جس میں انھوں نے ابن صفی کی شاعری اور نثری تحریروں میں تلذذ آمیزی کے اثرات کی نشاندہی اس انداز سے کی کہ قاری اور قلم کار کے فہم اور ان کے ادراک کے وہ گوشے سامنے آجائیں جو مطالعہ کرتے ہوئے اکثر لوگوں کے سامنے نہیں آتے۔

۔2 اور 3۔ اقرا سبحان اور محمد عثمان، شعبۂ اردو کے ریسرچ اسکالروں نے اپنے پرچوں میں ابن صفی کے ان کرداروں کی تلاش کی جو طالب علموں کے لیے ان کی زندگی اور حالات کے موافق ہوں اور ان کے علم میں اضافہ کا باعث بھی بنتے ہیں۔

۔4۔ کانپور سے تشریف لائے خان احمد فاروق نے اپنے مقالے ''ابن صفی ماورائے اسرار'' میں ابن صفی کی تحریروں کے رموز پر اور ان کی نفسیاتی پرتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان رازہائے پنہاں کی عقدہ کشائی فرمائی جو عموماً مطالعہ

کرتے ہوئے سیدھے طور پر قاری کے اوپر روشن نہیں ہوتیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر ابن صفی کی تحریروں کو ادبِ عالیہ میں کوئی جگہ حاصل نہیں ہو سکی ہے تو کیوں نہ ہم ان کو ہائی پاپولر لٹریچر سے تعبیر کریں۔

۔5۔ جناب مختار ٹونکی نے اپنے مقالے میں بتایا کہ ابن صفی کی حیثیت تھری اِن ون کی ہے۔ شعریات و مضحکات اور جاسوسیات میں ابن صفی نے انفرادی اور نمایاں سنگِ میل نصب کیے ہیں۔ ابن صفی اسرار احمد کی ناول نگاری کے طوفان کی ابتدا الہ آباد سے ہوئی اور اختتام کراچی پاکستان میں ہوا۔ مقالے کا زیادہ تر حصہ مقفی اور شعری آہنگ لیے ہوئے تھا جس میں ضرب الامثال کی کثرت نے چار چاند لگائے اور سامعین کو بہت محظوظ کیا۔ انھوں نے ابن صفی کے ایک مضمون ''قواعدِ اردو'' کو خاص طور پر اپنا موضوع بنایا جو شوخی و ظرافت کا بہترین خوشہ ثابت ہوا۔

۔6۔ معروف صحافی سہیل انجم نے ''تزکِ دوپیازی'' کے تعلق سے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے وضاحت کی کہ ابن صفی راسخ العقیدہ ہوتے ہوئے بھی اسلام کے نام پر سامنے آنے والے فریب دیکھ کر تڑپ اٹھتے تھے۔ انھوں نے شوہر و بیوی اور آدمی اور عورت کے سماجی اور غیر سماجی رشتوں کو ابن صفی کے زاویۂ نظر اور سماجی دور بینوں کے ذریعہ تلاش کرتے ہوئے سبق آموز نتائج برآمد کیے۔

۔6۔ صحافی لئیق رضوی نے اپنے مقالے بہ عنوان ''ابن صفی کے منفی کردار'' میں پرزور انداز میں کہا کہ منفی کرداروں کی تخلیق کی تحریک اور وجوہات کو تلاش کرنا بہت ضروری ہے۔ ان کرداروں کے ارتقائی مراحل پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے عبرت ناک و نصیحت آمیز نتائج سے آگاہی کا اظہار موثر انداز میں کیا۔

۔7۔ پونہ سے تشریف لائے قاضی مشتاق احمد نے اردو فکشن میں ابن صفی کی معنویت تلاش کرتے ہوئے بتایا کہ بقول ابن صفی فرار ہی انسانی اور سماجی ترقی کی ضمانت ہے۔ حالات میں تبدیلی لانے کے لیے قانون کا احترام لازم ہے یہی ابن صفی کا مقصد تھا۔ ابن صفی نے کہا ہے کہ میری کتابیں چاہے الماریوں کی زینت نہ بنیں لیکن تکیے کے نیچے ضرور پائی جاتی رہیں گی کیوں کہ میں نے جو میڈیم اختیار کیا ہے وہ عوام الناس کی فہم اور ضرورت کے مطابق ہے۔ انھوں نے کہا کہ ابن صفی کے تعلق سے شاعری میں بات کریں تو ایک شعر کافی ہے:۔

جو ہوسکے تو ہمیں پائمال کرتا جا''
نہ ہوسکے تو ہمارا جواب پیدا کر''۔

۔8۔ بھوپال سے آئے ہوئے پروفیسر آفاق احمد نے اپنے مقالے کا ماحصل پیش کرتے ہوئے کہا کہ سائنٹفک ایجادات اور سماجی سروکار سبھی ابن صفی کا موضوع بنے

اور انھوں نے تقریباً تمام مسائلِ زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس میں خیر وشر کی جنگ میں خیر کی فتح اور سرخ روئی کو ترجیح دی ہے جو ہمیں حق شناسی اور حق پرستی کی ترغیب دیتی ہے۔

اجلاس کے صدر ڈاکٹر ایم۔ اے ابراہیمی کا صدرارتی خطبہ:۔

اس اجلاس کے صدر ڈاکٹر ایم۔ اے ابراہیمی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو اکادمی، دہلی اور شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ابن صفی کے اعتراف کی ایک تاریخی بنیاد ڈالی۔ میں بھی سنہ 65ء سے 75ء تک ابن صفی کو پڑھتا رہا ہوں۔ آج کے مقالہ جات میں میری سب یادیں تازہ ہو گئیں۔ ابن صفی کے ہر کردار میں نیا پن ہے اور وہ خاص ڈائرکشن کے تحت سامنے آتا ہے۔ ابن صفی نے جرائم سے پاک سماج پیدا کرنے کا مشن اختیار کیا تھا۔

پروفیسر عبدالحق کے صدارتی کلمات:۔

پروفیسر عبدالحق نے اپنے صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ آج کے مقالہ نگاروں نے مختلف النوع عنوانات پر فکر انگیز مقالے لکھے جن میں مجھے تازگی

کا احساس ہوا کیوں کہ ان میں متن شناسی کے گوہر سامنے آئے۔

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کا صدارتی خطاب:۔

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ اس سمینار کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی زندگی کی اردو کی تاریخ کی ایک یادگار اور روشن تقریب کے طور پر یاد کیا جاتا رہے گا۔ ہم اس طرح سمجھ لیں کہ جس طرح انگارے پر بہت سی پابندیوں کے باوجود پروفیسر محمد مجیب نے رسالہ ''جامعہ'' میں تنقیدی تبصرہ لکھا جس میں کہا گیا تھا کہ یہ ادب شاید مستقبل میں ہمارے لیے راہ نما ثابت ہوگی، اسی طرح یہ سمینار ہے جو جامعہ کی اردو ادب میں نئی روایت قائم کرنے کی ایک اور مثال ہے۔ ادب کو ادبِ عالیہ اور پاپولر ادب کے ذیل میں جاننا اور پرکھنا فریبِ نظر ہے، اصل شے تخلیق ہوتی ہے۔

سمینار کے چوتھے اجلاس کی کاروائی:۔

اس سمینار کا چوتھا اجلاس دوپہر بعد پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر صادق، پروفیسر محمد شاہد حسین اور پروفیسر شہزاد انجم کی صدارت میں منعقد ہوا جس کی نظامت ڈاکٹر سرورالہدیٰ نے کی۔

اجلاس میں پیش کردہ مقالات کی تفصیلات :۔

۔1۔ ریسرچ اسکالر زمرد خاں نے اپنے پرچہ میں کہا کہ مشرقی تہذیبوں کو آئندہ سفر کی منزلیں چین کی سربراہی میں طے کرنی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا ابن صفی کے چار ناولوں کا ترجمہ کرنا ایک بڑے آدمی کا دوسرے بڑے آدمی کے تئیں احساسِ اعتراف و افتخار کا اظہار ہے۔

۔2۔ جناب شعیب نظام نے اپنا مقالہ بہ عنوان ''ابن صفی انور رشیدہ سیریز کے 2 حوالے سے'' پیش کیا جس میں انھوں نے ان دونوں سیریز کے مرکزی محوروں پر روشنی ڈالی اور کرداروں کی برتری اور ابتری کا خوبصورت جائزہ پیش کیا۔

۔3۔ پروفیسر شافع قدوائی نے بہ عنوان ''قرات مسلسل کا استعارہ ابن صفی'' اپنا مقالہ پیش کیا جس میں انھوں نے ابن صفی کی ہر دلعزیزی اور عوامی مقبولیت کے اسباب تلاش کرنے کے ساتھ اس کی قرات کے طلسم یعنی ان تحریروں کے سرِ نظر بنانے کے جادو پر روشنی ڈالی۔

۔4۔ آخری مقالہ پروفیسر علی احمد نے پیش کیا جس کا عنوان ''عوامی ادب کی

شعریات ابن صفی کے حوالے سے'' تھا جو بہترین ثابت ہوا اور اس مقالہ کے بین السطور میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ ابن صفی کو ادبِ عالیہ میں شامل کرنے کے لیے ابھی تک خود کو تیار نہیں کرپائے ہیں۔

مجلسِ صدارت کے چاروں اراکان پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر صادق، پروفیسر محمد شاہد حسین اور پروفیسر شہزاد انجم کے صدارتی خطابات:۔

مجلسِ صدارت کے چاروں ارکان پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر صادق، پروفیسر محمد شاہد حسین اور پروفیسر شہزاد انجم کے صدارتی خطابات کا مجموعی پیغام یہ ہے کہ ابن صفی ایک ایسے بلند خیال اور ممتاز تحریری ملکہ رکھنے والی شخصیت کا نام ہے جس سے نصف صدی کی نسلیں نہ صرف مستفید ہوتی رہی ہیں بلکہ اردو کی ترویج اور ترقی میں بھی ابن صفی کی تحریریں ایک نمایاں کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ انھوں نے الفاظ کے رموز و کنایات سے اپنے قاری کو نفسیات اور سماجی رشتوں اور گزرتی زندگی کے حالات سے سبق آموزی کے ہم آغوش کرکے واقف کرانے کے بہت سارے ہنر آزمائے اور ان میں کامیاب ہوئے۔

سہ روزہ قومی سمینار کا اختتامی اجلاس:۔

سہ روزہ قومی سمینار کا اختتامی اجلاس پانچ بجے ایڈورڈ سعید ہال، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں منعقد ہوا جس میں بحیثیت مہمانِ خصوصی جناب سید شاہد مہدی، وائس چیرمین آئی سی سی آر تشریف فرما تھے۔ اس اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر ایس۔ ایم۔ راشد، پرووائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کی۔ اس جلسہ کی نظامت کے فرائض سکریٹری اردو اکادمی جناب انیس اعظمی نے انجام دیے جب کہ پروفیسر خالد محمود، صدر شعبۂ اردو نے سمینار کے تمام اجلاس کا احاطہ کرتے ہوئے ان کی کامیابی پر روشنی ڈالی اور آئے ہوئے مشوروں کو اپناتے ہوئے مستقبل میں حکمتِ عملی اختیار کرنے کا اعادہ ظاہر کیا اور پروفیسر عبدالحق، کنوینر سمینار کمیٹی اردو اکادمی نے کہا کہ سمینار کے شرکا کے اس اصرار کو اردو اکادمی زیرِ غور رکھے گی کہ جلد از جلد ابن صفی کی اہم تحریروں کو سامنے لایا جائے۔

حرفِ آخر:۔

بتایا جارہا ہے کہ مذکورہ سمینار جناب ابنِ صفی مرحوم کے فن و شخصیت پر ہونے والا سب سے بڑا اور اہم ترین سمینار قرار دیا جارہا ہے جسمیں بھارت کی حکومتی سطح کی شخصیات کے ابنِ صفی مرحوم کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا اور ساتھ ہی ساتھ دہلی کے تعلیم، تدریس اور ادب کے میدان کی اہم ترین و نامور

شخصیات نے مرحوم کی عظیم شخصیت اور لازوال فن پر مقالات پیش کیے۔

اس بات کا قویٰ امکان ہے کہ اس سہ روزہ سیمینار کی مکمل کاروائی کو کتابی صورت میں پیش کیا جائیگا جو کہ بلاشبہ اردو ادب کے لیئے بلعموم اور ابنِ صفی کے مداحین کے لیئے بلخصوص ایک اہم ترین دستاویز ثابت ہوگی۔

ابنِ صفی مرحوم کے پاکستان اور دینا بھر میں بسنے والے مداحین نے جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اردو اکارمی کی جانب سے جناب ابنِ صفی کے شایانِ شان اس عظیم سیمنار کے انعقاد پر دونوں اداروں کو زبردست خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے حکومتِ پاکستان اور پاکستان بھر مین قائم آرٹس کونسلوں سے بھرپور اپیل کی ہے کہ پاکستان کے اس عظیم و نامور فرزند کے شایانِ شان ایسا ہی ایک کانفرنس انکے یومِ پیدائش پر باقاعدگی کے ساتھ اہتمام کیا جانا چاہیے اور حکومت کی جابب سے ابن صفی مرحوم کے لیئے بعد از مرگ تمغہِ حسنِ کارکرگی کا بھی فوری طور ہر اعلان اب ایک ناگزیر امر بن چکا ہے۔

واضح ہو کہ راقم نے اس رپورٹ کو ہندوستانی اخبار روزنامہ ہندوستان ایکسپریس اور ادبی ویب سائٹ "ادبی سرگرمیاں" میں شایع شدہ رپورٹوں کی مدد سے مرتب کیا ہے، جسکے لیئے راقم انکا شکریہ ادا کرتا ہے۔

گُڑ کی ڈلی

۔"ساب ام اپنا وطن جاتی اے، امارا بخشیش لاؤ"۔

خان لالہ نے اپنے ہاتھ کو ایک پیالے کی سی شکل دی اور پیشانی کے عین وسط پر رکھ کر اشارتاً سلام کرتے ہوئے کہا:۔

ہر بار کی طرح سے خان لالہ اپنی سالانہ چھٹیوں پر جانے سے قبل بخشیش وصولی مہم کے تحت محلے بھر کے گھروں پر حاضری دیتا پھر رہا تھا۔

ابو کی صدا پر امی فوراً باورچی خانے سے برآمد ہوئیں اور ابو کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔

۔"ارے بھئی یہ چوکیدار امیر خان اپنے گاوں جارہا ہے، اسکے بچوں کی مٹھائی کے لیئے اسے دس روپے دے دو"۔

خان لالہ نے تصحیح کی:۔

۔"امیر حکیم خان، ساب امارا نام امیر خان نئیں، امیر حکیم خان اے، اُودر وطن میں ام کو سب امیر حکیم خان ہی بولاتا اے"۔

۔"ہاں ہاں، بھئی امیر حکیم خان کو دس روپے دے دو"۔

ابو نے مسکراتے ہوئے امی کو اشارہ کیا۔

میں نے امی کو آنکھوں میں ناگواری کے تاثرات کو صاف محسوس کیا لیکن ابو کے سامنے وہ بھلا کاہے کو دم مار سکتیں تھیں، خاموشی سے اپنے دوپٹے کے پلو کو کھول کر اسمیں بندھا واحد دس روپے کا ایک مڑا تڑا سا ہرا نوٹ نکل کر چوکیدار امیر خان جسے ہم محلے بھر کے بچے بالے خان لالہ کہہ کر پکارا کرتے تھے کے ہاتھ پر دھر دیا۔

دس روپے کا نوٹ پا کر خان لالہ کی آنکھوں میں ایک بھرپور چمک لہرائی اور اسنے اپنے پیلے پیلے دانت جسمیں سے اب چند ایک اُسے عرصہ ہوا داغِ مفارقت دے گئے تھے، نکال کر ایک بار پھر اپنا ہاتھ پیشانی کے عین وسط پر ڈھیلے ڈھالے انداز میں رکھ کر امی اور ابو دونوں کا باآوازِ بلند شکریہ ادا کیا

اور گھوم کر تیزی سے چل دیا۔

اسکے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی امی نے فورا گھر کا دروازہ بند کیا اور پھر ابو کی جانب شکایتی نظروں سے دیکھتیں ہوئیں قدرے آہستہ مگر واضح خفگی سے بھرے لہجے میں بولیں:۔

۔"پپوکے ابا، آپ بھی نا کمال کرتے ہیں، بھلا اب چوکیدار کو اکھٹے دس روپے دلوانے کی کیا تک تھی؟ کیا اسے محلے کے ہر گھر سے ہر ماہ اسکی تنخواہ کے دس روپے نہیں ملتے جو اب اسے مذید دس روپے دلوادیئے۔ ویسے بھی میں نے وہ دس روپے پپو کے اسکول کی کتابوں کے لیئے رکھے تھے"۔

ابو جیسے پہلے ہی سے امی کے چوکیدار مخالف مظاہرے کے لیئے تیار ہی بیٹھے تھے، مسکراتے ہوئے بولے:۔

۔"ارے بیچارہ غریب آدمی ہے، پورے سال ہماری خدمت کرتا ہے، تب کہیں جا کر ہم اسے ایک بار یہ دس روپے وہ بھی اسکے بچوں کی مٹھائی کے نام پر دیتے ہیں، اب اتنا تو اس غریب کا حق بنتا ہی ہے اور یہ بھی تو دیکھو نا وہ بے چارہ جب اپنے گاوں سے آتا ہے تو کتنے پیار سے پپو کے لیئے اپنے گھر کی بنیں خشک

میوے ملے دیسی گُڑ کی ڈھیر ساری ڈلیاں لا کر دیتا ہے جیسے اپنا پپو کتنے شوق سے کھاتا ہے۔ باقی رہی بات کتابوں کی تو کل پہلی تاریخ ہے، تنخواہ ملے گی تو کتابیں بھی آ ہی جائیں گیں"۔

امی ابو کی بات اور مسکراہٹ دونوں ہی کو سنی ان سنی اور دیکھی ان دیکھی کر کے منہ ہی منہ میں نا جانے کیا کچھ بڑبڑاتیں اندر باورچی خانے میں چل دیں۔

ابو کی یہ ہی بات تو مجھے بہت اچھی لگتی تھی کے وہ کسی کا بھی حق ادا کرنے میں زرہ برابر بھی تامل نہیں کیا کرتے تھے اور ویسے بھی مجھے اسکول کی کتابوں سے زیادہ گُڑ کی ان ڈلیوں کی چاہ تھی جو خان لالہ ہر سال اپنے گاوں سے واپسی پر لایا کرتا اور پھر ہر اس گھر جا جا کر جہاں مجھ جیسے چھوٹے بچے ہوتے، اس تاکید کے ساتھ بانٹا کرتا کے یہ سوغات تو وہ خاص بچوں ہی کے لیئے لایا ہے اور ساتھ ہی بڑے ہی فخریہ انداز میں یہ بتنا بھی ہرگز نا بھولتا کے دیسی گُڑ کی وہ ڈلیاں اسکی بیوی نے خود اپنے ہاتھ سے بنائیں ہیں۔ وہ گھر کے پچھواڑے کی زمین کے گڑھے میں نصب کڑھاو جس کے نیچے ڈھیر ساری لکڑیوں کی آگ جل رہی ہوتی، میں گنے کے رس کو مسلسل کئ گھنٹوں ابال کر اور کفگیر سے چلا چلا کر جب وہ رس ایک سبزی مائل بھوری گاڑی راب کی سی شکل اختیار کر لیتا تو وہ اسمیں اپنے ہاتھ کی ہی ادھ کُٹی کالی مرچیں ڈالتی اور اسے دوبارہ کفگیر

سے مسلسل گھوٹ کر یک جان کرکے اس میں خشک میوہ جات مثلًا بادام، پستہ اخروٹ، چلغوزہ، مونگ پھلی اور کشمش شامل کرکے اسے اتنا ٹھنڈا ہونے دیتی کے وہ اپنے ہاتھ سے بھینچ بھینچ کراس گاڑے مغلوبے کی ڈلیاں بنالے اور پھر اسے خشک ہونے کے لیئے گھر کے صحن میں دھلے ہوئے صاف کپڑے پر پھیلا کر دکھ دیتی۔

تواب شروع ہوتا ہے میرا انتظار، جی ہاں خان لالہ کی واپسی کا۔

خان لالہ کی واپسی کا مطلب ہے کے محلے بھر کے سب بچوں کی عید۔ کیونکہ ہم سب کے لیئے لالہ کی جانب سے سوغات میں ملنے والیں خشک میووں سے لبریز دیسی گڑ کی ڈلیاں بھلا کسی عید کی عیدی سے کچھ کم تھوڑا ہی تھیں اور عید تو سال میں دو بار آتی ہے لیکن لالہ کے گاوں سے گڑ کی ڈلیاں صرف ایک بار۔

گڑ کی ڈلیوں کے علاوہ ایک اور بات جو میں سوچ سوچ کر ہلکان ہوا کرتا وہ یہ کے لالہ ہر سال جاتا تو گاوں تھا لیکن وہ یہ کیوں کہتا کے میں اپنے وطن جاتا ہوں؟

بھلا وہ یہ کیوں نہیں کہتا کے میں اپنے گاوں جارہا ہوں۔

ہمارے سرکاری اسکول جہاں میں جماعتِ چہارم کا طالب علم تھا کے استاد تو کہا کرتے ہیں کے پاکستان ہم سب کا وطن ہے تو کیا لالہ پاکستان سے کہیں باہر رہتا ہے جو وہ ہمارے شہر اور ہمارے وطن پاکستان کو اپنا وطن ہی نہیں گردانتا۔
اسی اُدھیڑ بن سے تنگ آ کر آخر میں خود ہی اپنے آپ کو سمجھا لیا کرتا کے مجھے اس سے کیا کے وہ پاکستان میں ہی رہتا ہے کے کہیں اور، بھلے ہی وہ جس وطن سے بھی تعلق رکھتا ہو لیکن واپس تو پھر یہاں ہی آتا ہے اور آ کر وہ ہم سب بچوں کو گڑ کی ڈلیوں کی اسقدر شاندار سوغات تو خوشی خوشی دیتا ہے نا۔ تو بس یہ ہی میرے لیئے سب سے بڑی اور اہم بات تھی۔
خان لالہ کا نام تو امیر حکیم خان تھا لیکن محلے بھر کے بچے جہاں اسے خان لالہ کہا کرتے تو وہیں سارے بڑے اسے امیر خان کہہ کر بلایا کرتے لیکن شاید اسے صرف امیر خان کہلوانا پسند نا تھا، امیر خان پکارے جانے پر وہ فوراً تصحیح کر دیتا۔ "امیر حکیم خان"۔
خان لالہ کا حلیہ بھی اس کی طرح سے ہی انوکھا تھا۔ تنگ دامن کی قمیض اور گھیر دار شلوار میں ملبوس بھاری تن و توش، درمیانہ قد، صاف گورا رنگ، مہندی

میں رنگے گھنے سرخی مائل نارنجی بال، عمر لگ بھگ پچپن سے ساٹھ کے درمیان، ہاتھ میں ہر وقت ایک بانس کا لمبا اور مضبوط سا ڈنڈا جسے وہ راتوں میں چوروں اور اٹھائی گیروں کو خبردار کرنے کے لیئے زور سے سڑک پر مار مار کر آوازیں پیدا کیا کرتا۔

ہم سب بچوں سے تو اسے کچھ خاص ہی لگاو تھا۔ ساری رات جاگنے کے بعد وہ دن بھر اپنی چارپائی پر لیٹ کر آرام کیا کرتا جو کے ہمارے محلے کی بلڈنگ کے نیچے والی منزل کی ایک کوٹھری کے اندر لگی رہتی تھی اور کوٹھری کے دروازے پر اسنے ایک چادر تان رکھی تھی۔ دن بھر جب وہ کوٹھری میں سویا رہتا تو دروازہ کھلا ہی رہنے دیتا، صرف چادر تنی رہتی۔ ہاں البتہ رات کو جب وہ محلے کی بلڈنگ کے چاروں اطراف گھوم پھر کر چوکیدارا کرتا تو اپنی کوٹھری کے دروازے پر تالہ لگا دیا کرتا۔

محلے بھر کے سارے بچے جب شام کو اکھٹے ہو کر کھیلا کودا کرتے اور خوب ہلا گلہ ہوتا لیکن مجال ہے کے جو کبھی خان لالہ نے اپنی کوٹھری سے باہر نکل کر انہیں روکا ہو یا ڈانٹا تک ہی ہو۔

دن گزرے رہے اور ایک ماہ گزر گیا لیکن اب کی بار خان لالہ کی واپسی نہیں

ہوئی۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کے وہ ایک ماہ سے زیادہ اپنے گاوں میں ٹہرا ہو۔ مذید دن گزرتے رہے لیکن خان لالہ واپس نا آیا۔ ہم سب بچوں میں ایک تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ ہم سب شام کو کھلینے کے لیئے جمع ہوتے تو سب کی نظریں خان لالہ کی بند کوٹھری پر لگے تالے پر گڑھ جاتیں اور ہمارا موضوعِ سخن خان لالہ کی واپسی ہی ہوتا۔ پھر کچھ تین چار ماہ کا عرصہ بیت گیا، ایک رات امی حسبِ معمول باورچی خانے میں الجھی ہوئی تھیں، ابو کسی کتاب کے مطالعہ میں مشغول تھے اور میں اپنا سبق یاد کر رہا تھا کے اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ ابو نے کتاب کے بیچ میں اپنی ایک انگلی دیکرا سے بند کرکے اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور دروازہ کھولنے کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ ابو نے دروازہ کھولا تو سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر مارے خوشی کے میری تو چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی کیونکہ وہ کوئی اور نہیں خان لالہ تھا۔

ابو نے اسے دیکھتے ہی فورا کہا:۔

۔"ارے امیر حکیم خان تم، بھئی تم کہاں رہ گئے تھے اتنے دنوں تک؟"۔

۔"ساب، کیا ام اندر آ سکتی اے، امارے کو تم سے کچھ بات کرنی اے"۔

خان لالہ کی آواز بہت بدلی ہوئی اور کمزور سی محسوس ہو رہی تھی۔

۔"ہاں بھئی ضرور آو"۔

ابو نے اسے راستہ دیتے ہوئے کہا۔

اندر آ کر وہ ایک طرف کھڑا ہوگیا۔

۔"بیٹھو امیر خان کھڑے کیوں ہو"۔

ابو نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

خان لالہ کچھ کہے بغیر کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔ کمرے میں روشن زرد بلب کی روشنی میں پہلی بار میں نے خان لالہ کا چہرہ بغور دیکھا۔ خان لالہ کا سرخ و سفید چہرہ زرد سا ہو رہا تھا۔ پہلے جب وہ اپنے گاوں سے لوٹا کرتا تھا تو اسکا چہرہ پہلے سے بھی کہیں ذیادہ سرخ ہو رہا ہوتا اور اسکی صحت پہلے سے مذید

اچھی محسوس ہوا کرتی تھی لیکن ایکی بار تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کے جیسے اسکا وزن بھی کافی گر چکا تھا۔

۔"وہ ساب۔۔۔۔۔! ام یاں سے امیشہ کے لیئے جاتی اے، اپنا سامان لینے آئی تو سوچا کے تم سے بھی ملتی جائے"۔

۔"کیا بات امیر خان کسی باتیں کر رہے ہو، ایسا کیا ہوگیا کے تم آج بیس بائیس سال پرانی نوکری کو ٹھوکر مار کر جانے کی بات کر رہے ہو، کچھ بتاو تو سہی آخر ہوا کیا ہے"۔

ابو اپنی نشت سے اٹھ کر خان لالہ کے قریب آ گئے اور اسکے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

ابو کے ہاتھوں کو اپنے کاندھوں پر پا کر نا جانے کیا ہوا کے خان لالہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر اسکے رخساروں سے ہوتے ہوئے اسکی قمیض کے سینے کو بھگونے لگے۔ ابو نے خان لالہ کا یہ حال دیکھ کر مجھے پانی لانے کا اشارہ کیا۔ میں فورا باورچی خانے کی طرف دوڑا اور پانی کا گلاس بھر کر پھر واپس بھاگا۔ امی جو کے باورچی خانے میں نا جانے کیا کر رہی تھی مجھے اسطرح سے

حواس باختہ ہو کر بھاگتے دیکھا تو میرے پیچھے ہولیں اور جب انہوں نے ابو کے پاس خان لالہ کو بیٹھے اور اسکی آنسووں سے بھری آنکھیں دیکھیں تو وہ بھی ہکا بکا سی رہ گئیں اور بناء کچھ کہے ایک طرف بس گم سم سی کھڑی ہو گئیں۔

ابو نے پانی کا گلاس میرے ہاتھ سے لے کر خان لالہ کو پکڑایا جسے وہ ایک ہی سانس میں پی گیا۔ ابو اسکے ہاتھ سے خالی گلاس واپس لیتے ہوئے بولے:۔

۔"اب مجھے ساری بات بتاو"۔

۔"وہ ساب۔۔۔۔۔۔۔۔! جب ام پچھلا سال اپنا وطن گئی تی تب امارا عورت ام کو بولا کے امارہ بڑا لڑکا شیر کان ایک لڑکی سے شادی کا کواہش رکتی اے۔ ام اسکا رشتہ لیکر گئی۔ امارہ طرف یہ رسم اے کے جو لڑکا کسی لڑکی سے شادی کرنا چاتی اے تو اسے لڑکی کے باپ کو اس کا مطوبہ رقم دینا پڑتی اے تب جا کر لڑکی کا باپ اپنی بیٹی کی شادی اس لڑکے سے کرتی اے۔ لڑکی کے باپ کا مطالبہ امارا حیثیت سے بوت زیادہ تا۔ ام نے اپنا لڑکا کو کوب سمجائی اور اسکا شادی اپنا چوٹا بائی کا لڑکی سے تے کی۔ امارا ارادہ تی کے ام اس سال اس کا شادی کانہ آبادی کریگی، مگر جب ام گاوں پونچی تو وہاں سب کچھ برباد ہوچکی تی۔ شیر کان امارا عمر بر کا کمائی جو ام نے یاں شیر میں چوکیدارا کرکے کمائی اور گاوں

میں توڑا توڑا کر کرکے زمین کے ٹکڑے لی تی جس پر وہ اپنا دوسرا چوٹا بائی لوگ کے ساتھ ملکر ہر موسم کا پسل کاشت کرتی تی۔ بیچ دی اور سارا رقم لڑکی کے باپ کو دیکر شادی کانہ آبادی کرلی اور اپنا بی بی کو لیکر پیشور چلی گئ"۔

۔" تمھاری بیوی نے اسے روکا نہیں؟"۔

خان لالہ جیسے ہی سانس لینے کو رکا تو ابو نے فوراً ہی سوالا کرڈالا۔

۔" خوساب۔۔۔۔۔۔۔۔! وہ جوان گرم کُون اے، ام بڈا لوگ کا بات کدھر سنتی اے، اس کانہ کراب نے امارا عمر بھر کا جمع پونجی برباد کردی"۔

۔"تو اب تم نوکری کیوں چھوڑ کر جانا چاہتے ہو؟"۔

ابو نے خان لالہ سے سوال کیا۔

خوساب۔۔۔۔۔۔۔! اب شیر کان کے بعد امارہ دوسرا لڑکا گلاب کان بھی جوان ہو گئ اے اور ام کو ڈراے کے وہ اب اپنا شادی کے چکر میں امارا آخری سہارا،اس بڑھاپے میں امارے سر کا چت بھی نا چین لے"۔

۔"کیا مطلب ہے تمھارا؟"۔

ابو نے حیرت بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

۔"اس بیس بائیس سال میں ام نے شیر میں چوکیدارا کرکے اور اپنا پیٹ کاٹ کر سارا سارا رات کو جاگ کر جو توڑا بوت زمین کریدی تی وہ تو شیر کان کی کافر جوانی کی نذر ہو گئی اب ام امارا اِی بی اور دوسرے چھے بچوں کے سر پر جو چھت ہے کہیں گلاب کان اپنا شادی کے چکر میں اسے بی نا بیچ دے، اس لیئے اب امارا ار وقت گاوں میں رینا بہت ضروری اے"۔

۔"بحر حال جو ہوا بہت برا ہوا"۔

ابو نے خان لالہ کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

۔"اچا ساب۔۔۔۔۔۔۔! اب ام جائیگی"۔

خان لالہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اسنے اپنا ہاتھ کا پیالہ سا بنا کر

عین اپنی پیشانی پر رکھ کر ابو کو سلام کرتے ہوئے کہا۔ وہ جانے کے لیئے مڑا ہی تھا کے امی نے اپنے دوپٹے کے پلو کو کھول کر اسمیں رکھا واحد مڑا تڑا سا دس روپے کا ہرا نوٹ آگے بڑھ کر خان لالہ کے ہاتھ پر دھر دیا۔

خان لالہ کے چہرے پر ایک غم زدہ سی مسکراہٹ پھیل گئی اور پھر اچانک اسکی نظر مجھ پر پڑی۔ میں ایک کونے میں خاموش کھڑا یہ ساری کہانی سن رہا تھا۔ خان لالہ میرا پاس آیا اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا:۔

۔" او پچو یارا۔۔۔۔۔۔۔۔۔! ام کو ماپ کرو، ام اس بار تمارا واسطے کُوشک میوے والا دیسی گڑ کا مٹائی نا لا سکی اور لاتی بھی کیسے، اس کمبخت شیر کان نے وہ کیت بھی پروکت کیا جسپر اگنے والے گنے کا رس سے امارا بی بی تم بچا لوگ کے لیئے مٹائی بناتا تا"۔

اتنا کہہ کر خان لالہ اپنی قمیص کی آستین سے اپنے آنسوؤں کو پونچھتا ہوا باہر کی طرف چل دیا۔

اور اس دن کے بعد نا تو میں نے پھر کبھی امیر خان، میرا مطلب ہے کے امیر حکیم خان کو دیکھا اور نا ہی کبھی ویسی خشک میوے سے لبریز ادھ کُٹی کالی

مرچ والی دیسی گڑ کی ڈلی ہی کھائی۔

۔"جانتے ہوں ناصر۔۔۔۔۔۔!، غریب آدمی کیسے خوشیوں کی تلاش کرتا ہے؟۔۔۔ ۔۔۔۔!، ایسے ہی جیسے کسی بھرے میلے میں کُھو جانے والا چھوٹا سا بچہ اپنی ماں کو تلاش کررہا ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ !!!"۔

۔"آزر۔۔۔۔۔۔!آزر۔۔۔۔۔!آزر۔۔۔۔۔۔۔!!!، بالکل مزا نہیں آرہا، تم اپنی ڈائیلاگ ڈیلیوری میں کچھ اور جان ڈالو، فلمبینوں کو تمھاری آواز میں محرومی سنائی دینی چاہیئے، انہیں تمھاری آواز میں وہ شکوہ سنائی دینا چاہیئے جو وہ خود اُس دنیا، اُس زمانے سے کرنا چاہتے ہیں لیکن چاہتے ہوئے بھی کر نہیں پاتے۔آزر تمھارا یہ ڈائیلاگ اسطرح سے سنیما ہال میں گونجنا چاہیئے کے اسکی گونج انہیں اپنے بے آواز شکوے کا مداوا محسوس ہونے لگے"۔

میں نے آزر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انتہائی جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

آزر نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا:۔

۔"ادیب الحسن صاحب، ویسے بھی پانچ بج چکے ہیں، اگر اجازت ہو تو اب چلوں گا، ریہرسل کا سلسلہ کل یہی سے دوبارہ شروع کرینگے"۔

یہ ستر کی دھائی کے اواخر کے اُن دنوں کی بات ہے جب پاکستانی فلمی صعنت اپنے دورِ زریں کی طرح تو نا سہی البتہ اب بھی گاہے بہ گاہے اپنے زندہ ہونے کے ثبوت فراہم کرتی رہتی تھی۔

ایسے میں ایک روز فلمی صعنت کے ایک بہت ہی بلند پایہ اور نامور ہدایتکار پرویزالسلام فاضل نے مجھ سے کراچی میں فون پر رابطہ کرکے اپنی نئی فلم کا اسکرپٹ لکھنے کی استدعا کی۔

پہلے تو میں نے دوٹوک لہجے میں یہ کہہ کر صاف انکار ہی کردیا کہ:۔

۔"میں ٹھہرا خالص ادبی نوعیت کا ادیب۔ یہ سچ ہے کے میرے لکھے افسانے اور ناول اس وقت شہرت کی بلندیوں کو چُھو رہے ہیں لیکن میں نے آج تک فلم تو کیا کبھی ٹی وی ڈرامے کا اسکرپٹ بھی نہیں لکھا اور نا ہی لکھنے کی کوئی خواہش ہی ہے"۔

اتنا کہہ کر میں نے فون پٹخ دیا۔

اُس وقت تک مجھے ادبی دنیا میں وارد ہوئے کچھ دس بارہ برس کا عرصہ ہی گزرا تھا اور خوش نصیبی سے میرے متعدد افسانوں کے مجموعے اور ناول شائع ہو کر فروخت کے ریکارڈ قائم کر چکے تھے۔ اب اسکا کچھ نا کچھ تو اثر ہونا ہی تھا لہذا میں کسی کو بھی خاطر میں نا لاتا تھا۔

لیکن صاحب، پرویز السلام فاضل بھی اپنی دھن کا پکا آدمی نکلا۔ مسلسل فون پر فون کرتا رہا اور جب میں نے ہار نا مانی تو ایک روز لاہور سے پہلی فلائٹ پکڑ کر کراچی پہنچا اور سیدھا میرے گھر آن دھمکا۔

اب گھر آئے دشمن کی بھی عزت و تکریم لازم ہے اور وہ تو پرویز السلام فاضل تھا۔ اُس وقت کی پاکستانی فلمی صنعت کا سب سے کامیاب اور سنئیر ترین ہدایتکار۔ جہاں اسکے کریڈٹ پر بے شمار کامیاب ترین فلمیں تھیں وہیں لوگ اسے اپنے فن میں یکتا و پختہ مانتے تھے۔ اسکا شمار فلمی صنعت کے ان معدودے چند ہدایتکاروں میں ہوتا تھا جو کے تعیلم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ تکنیکی شعبے کی بھی کماحقہ سُوج بُوجھ رکھتے تھے۔

بعد میں مجھے اسکی ہی زبانی پتہ چلا کے وہ قیامِ پاکستان سے دو تین سال قبل ہی کلکتہ کی فلمی صنعت کے ایک کہنہ مشق فلم ایڈیٹر سے فلم ایڈٹنگ، بعدازاں ایک پرانے اور نامور سنیماٹوگرافر سے فلمی فوٹوگرافی کے اسرار و رموز سیکھ کر بنگالی فلموں کے ایک بڑے ہدایتکار روبن پارتو کو اسسٹ بھی کرنے لگا تھا لیکن اپنے خاندان کے بڑوں کے اصرار پر وہ پاکستان آ گیا اور 1960ء میں اسنے اپنی پہلی فلم "پیاس" کی خود مختارانہ طور پر ہدایت دیں۔ اُس دن کے بعد سے کامیانی مسلسل اسکے قدم چُوم رہی تھی۔

اب وہی پروفیسر الاسلام فاضل میرے سامنے بیٹھا تھا۔

چھوٹے چھوٹے نیلے خانوں والی انتہائی نفیس سی سفید بوشرٹ جسکا دامن اعلیٰ تراش کی گہری نیلی پتلون سے باہر، گلے میں گہرا سرخ مفلر او پیروں میں سیاہ چمکدار جوتے۔ دبلے پتلے سے جسم پر اُسی متانت کا سر اور ہلکے سے تیل لگے بالوں میں بائیں ہاتھ کی جانب سے نکالی گئی مانگ، نفاست سے قدرے چھوٹے کٹے انتہائی سلیقے سے سنوارے گئے سیاہ بال جن میں کہیں کہیں سے جھلکتے ہوئے سفید تار۔ تنگ پیشانی، صاف رنگت والے کلین شیو چہرے پر سنجیدگی اور متانت اور آنکھوں پر لگے چوکور چشموں سے جھانکتی ہوئی بڑی بڑی مگر گہریں اور ذہین

آنکھیں، ستواں ناک۔ ان کے عین نیچے پتلے پتلے ہونٹ جو شاید کثرتِ سگریٹ نوشی کے سبب گہرے سانولے ہو رہے تھے اور چھوٹی سی گول ٹھوری جسمیں باتیں کرتے ہوئے ہلکا سا گڑھا پڑتا تھا۔

۔"دیکھیں ادیب الحسن صاحب۔۔۔۔۔۔!، آپ جیسے دانشور لوگ ہی پھر شور مچاتے ہیں کے پاکستانی فلموں میں شامل کہانیوں کا کوئی ادبی معیار نہیں ہوتا۔ میں نے اِس بار عزمِ مصمم کیا ہے کے میں اپنی اگلی فلم کے لیئے ایک ایسی اچھوتی کہانی لکھواوں گا جو نا صرف ادب کے معیار پر بھی پوری اترے اور اسے دیکھ کر فلمبینوں کی شعوری و لاشعوری دونوں طرح سے اصلاح بھی ہو"۔

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگیا اور اپنی انگلیوں میں دبے ہوئے سگریٹ کو اسنے انگوٹھے اور شہادت کے عین بعد والی انگلیوں سے پکڑ لیا اور اس کے جلتے ہوئے سِرے پر جمع ہوئی ہلکی باریک سی راکھ کو انگلی سے دھیرے دھیرے کریدنے لگا۔ شاید یہ اسکی مستقل عادت تھی کیونکہ اُس انگلی کے سرے کی رنگت بقیہ حصے کی نسبت قدرے سیاہ ہو رہی تھی۔

پہلے تو میں کافی دیر تک اپنے سرد و تلخ لہجے سے کوشش کرتا رہا کے کسی طرح سے اسے ٹال دوں۔ اسے آئے ہوئے اب کچھ آدھا گھنٹہ ہو چلا تھا لیکن میں نے

مروتاً بھی اُسے چائے یا پانی کو نہیں پُوچھا تھا۔

۔"اچھا ایسا کرتے ہیں کے میرے کئی ادیب دوست ایسے بھی ہیں جو بڑے اچھے قلمکار ہیں اور میرے کہنے پر وہ خوشی خوشی آپکی فلم کا اسکرپٹ لکھنے پر راضی ہو جائیں گے"۔

میں نے تنگ آ کر بلا اپنے سر سے اتارنا چاہی۔

میری بات سن کر پرویزالسلام فاضل بولا تو کچھ بھی نہیں البتہ ایک بڑی ہی معنی خیز سی مسکراہٹ اسکے ہونٹوں پر مچلی اور ساتھ ساتھ اسکی انکھیں بھی چمک اٹھیں۔

گو کہ میں اچھی طرح سے سمجھ رہا تھا کے اُس گہری مسکراہٹ کا مطلب کیا ہے، پھر بھی میں نے انجان بنتے ہوئے اندھیرے میں تیر چلایا:۔

۔"تو اسکا مطلب ہے کے آپکو میری تجویز پسند آئی ہے"۔

پرویزالسلام فاضل نے بڑے ہی اطمینان کے ساتھ دھیرے مگر انتہائی پختہ لہجے

میں وہی جواب دیا جسکی میں توقع کر رہا تھا۔

۔"ادیب الحسن صاحب، اگر کسی اور سے ہی کہانی لکھوانا ہوتی تو میں لاہور سے چلکر یہاں کراچی آتا ہی کیوں؟، وہیں لاہور ہی میں یہ کام کر سکتا تھا، انگنت ادبی پائے کے مصنفین ایک اشارہِ ابرو کے منتظر ہیں کے میں ان سے کب کہوں اور وہ کب میرے لیئے اسکرپٹ لکھیں"۔

اتنا کہہ کر اسنے اپنی انگلیوں میں دبا سگریٹ ایش ٹرے میں مسلسل دیا اور پھر بڑی ہی آہستگی اور نفاست کے ساتھ دونوں ہاتھوں کو دھیرے دھیرے جھاڑتا ہوا میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا:۔

۔"اگر میری فلم کی کہانی کسی نے لکھنی ہے تو وہ آپ ہی لکھیں گے ورنہ میں فلم ہی نہیں بناوں گا۔۔۔۔۔۔۔!!!"۔

۔"لیکن کیا آپ جانتے بھی ہیں کے میرے تمامتر افسانوں، کہانیوں اور ناولوں کے مضوعات عموماً انسانی نفسیات، شعور و لاشعور کی الجھی گھتیوں کو سلجھاتے اور ماضی میں پیوستہ انکی جڑوں کی تلاش کے ارد گرد گھومتے ہیں۔آپ کے لیئے انہیں فلمانا کچھ نا ممکن سا ہی ہوگا"۔

میں نے اپنے چہرے پر ایک گہری طنزیہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔

۔"جی ہاں مجھے بخوبی اندازہ ہے، میں نے ان گذشتہ دس سالوں کے دوران شائع ہونے والے آپکے سارے ناول اور افسانوں کے مجموعے پڑھ رکھے ہیں"۔

پرویز الاسلام فاضل کا یہ جواب میرے لیئے ایک اور نیاء دھچکا تھا۔

۔"اور پھر میں آپکی انڈسٹری میں بنے والیں دیگر فلموں کی طرح سے رواتی پیار و محبت اور مار دھاڑ و گنڈاسوں والی کہانیاں نہیں لکھ سکتا"۔

میں نے مذید جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

۔"آپ بے فکر رہیں میرا آپ سے اس قسم کی کہانی لکھوانے کا قطعاً کوئی ارادہ بھی نہیں"۔

میں نے ایک نیاء پینترا بدلا:۔

۔"دیکھیں، میں از خود اور فری لانس کام کرنے کا عادی ہوں، میں نے کبھی کسی کے لیئے اور کسی کے کہنے پر آج تک کوئی تحریر نہیں لکھی۔ اپنی اسٹڈی میں دنوں اور مہینوں بند ہو کر جو کچھ لکھتا ہوں اسکا مسودہ پبلیشر خود میرے گھر سے پیشگی معاوضہ دیکر لے جاتا ہے اور ہر چھے ماہ میں میری سابقہ کتب کی رائیلٹی کا چیک مجھے بذریعہ ڈاک مل جاتا ہے، اللہ اللہ خیر صلہ اور تو اور میں شہر میں منعقدہ سو کالڈ ادبی محافل اور نشستوں میں بھی شرکت نہیں کرتا۔ ویسے بھی میرے بارے میں ادبی حلقوں میں کچھ اچھی رائے نہیں پائی جاتی، ادبی لوگ مجھے جھکی، بدمزاج اور شارٹ ٹیمپرڈ کہہ کر پکارتے ہیں۔ مجھے چھوٹی چھوٹی باتوں پر شدید غصہ آ جاتا ہے اور میں اپنے آپے سے باہر ہو جاتا ہوں، معمولی معمولی سی باتوں پر بھتے سے اکھڑ جاتا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کے آپ میرے ساتھ کام کر سکیں گے۔ اب میں مذید اور کچھ نہیں کہنا چاہتا، بہتر ہو گا کے اب آپ تشریف لے جائیں"۔

میں نے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ثبت کر کے اپنے ہاتھ جھٹک کر اُسے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

۔"اور آپ میرے بارے میں نہیں جانتے۔۔۔۔۔۔!!!"۔

پرویز السلام فاضل ایک مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ بڑے ہی پُرسکون لہجے میں بولا:۔
۔"میرے بارے میں ساری فلمی صنعت میں یہ مشہور ہے کے مجھے اپنے تیس سالہ کیریئر میں کبھی ایک بار بھی غصہ نہیں آیا اور میرے خیال میں فلمی صنعت کا وہ واحد ہدایتکار ہوں جسکے ساتھ آپ باآسانی کام کر سکتے ہیں"۔
میری جھنجھلاہٹ بڑھتی جارہی تھی، میں تھاکے اُس سے جان چھُڑانے کی کوششیں کررہا تھا اور وہ تھاکے ہار مان کے نہیں دے رہا تھا۔
ویسے میں نے اپنے بارے میں کچھ ایسا غلط بھی تو نہیں کہا تھا۔
میرا گذشتہ دس بارہ سالوں پر محیط ادبی سفر کوئی بہت زیادہ پُرپیچ نہیں تھا۔ دورانِ تعلیم ہی میں نے ملک کے بہت ہی بڑے اور نامور ادبی جریدے میں افسانہ نگاری کا آغاز کردیا تھا اور میرے اولین افسانے کے ساتھ ہی مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا جانے لگا اور جریدے کے ہر ماہ شائع ہونے والے شمارے میں میرے افسانے کی شمولیت ایک لازمی امر ٹھری۔ یہ سلسلہ یونہی دو تین سالوں تک چلتا رہا۔

پھر ایک روز جریدے کے مدیر ریاض جیپوری صاحب نے مجھ سے گذشتہ دو تین برسوں کے دوران شائع شدہ افسانوں میں سے منتخب افسانوں کا مجموعہ اپنے ادارے کے تحت شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا اور جب کتاب کی اشاعت کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ نا سہی کچھ تھوڑا بہت معاوضہ بھی ہاتھ آ رہا ہو تو پھر انکار کی گنجائش ہی کہاں رہتی تھی۔

میری خوش نصیبی رہی کے جہاں میرا پہلا ہی مجموعہ اچھی تعداد میں فروخت ہوا وہیں اسے ناقدین کی جانب سے بھی کافی سراہا گیا۔ اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جیپوری صاحب نے میرے بقیہ افسانوں کو بھی ایک اور مجموعے کی صُورت میں شائع کرنے کا فیصلہ کرلیا اور یہ مجموعہ توانکے ادارے سے شائع شدہ دیگر تمام کتب کی فروخت کے سابقہ ریکارڈ توڑ گیا۔

ان دو کامیاب مجموعوں نے ادبی دنیا میں میرے قدم جما دیئے اور ملک کے نامور ترین اشاعتی ادارے مجھ سے رابطہ کرنے لگے اور پھر اگلے چھ ماہ میں ہی میرا اولین ناول پیاس کا سمندر" کامیابی کی نئی داستان رقم کر رہا تھا اور پھر یکے بعد دیگرے ایسی متعدد" داستانیں رقم ہوتیں چلی گئیں۔

میری شہرت میں دن بہ دن اضافہ ہی ہوتا جارہا تھا۔ میرے افسانوں اور ناولوں کی خاص بات اس کے مرکزی کردار ہوا کرتے تھے جو کے عموماً بے حد زندہ دل، زندگی کی جانب مثبت سوچ و عمل کے حامل اور سب سے بڑھکر گفتار و کردار کے غازی۔ ان کرداروں نے میرے قارئین پر میری تصانیف کے ساتھ ساتھ میرے اپنے زاتی کردار کے حوالے سے بھی ایک مثبت تاثر قائم کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔
خُود سر تو میں پہلے ہی سے تھا۔ ان کامیابیوں نے مجھے خُود پسند بھی بنا دیا۔
میرا اپنے بارے میں یہ خیال پختہ ہوچلا تھا کے بھلا مجھ سے بہتر انسانی نفسیات و فطرت، کشمکشِ قلب و خرد، شعور و لاشعور کی پیچیدہ گتھیوں، اسرار و رموزِ حیات و موت اور کون جان اور سمجھ سکتا ہے۔ میرے زہن نے اپنے سواء دیگر تمام لوگوں کو حقیر، سوچ و سمجھ اور عقل و خرد سے عاری ایک مخلوق قرار دے دیا تھا۔
ویسے بھی شروع ہی سے میں کچھ گوشہ نشین طبیعت کا حامل تو تھا ہی، اب اُن پے در پے کامیابیوں کے بعد حاصل ہونے والے گرانقدر ادبی منصوبوں کی تکمیل کی

کے لیئے کل وقتی ادیب کی حیثت سے اپنی اسٹڈی میں قلم اور کاغذ سے اپنا ایک اٹوٹ رشتہ استوار کرلیا۔ باالفاظِ دیگر یوں کہ لیں کے میری اسٹڈی میرے لیئے ایک " کمفرٹ زون" یا "گوشہِ عافیت" بن گئ تھی۔

تو یہ تھی اُس دور میں میری شخصیت کی کچھ جھلکیاں۔۔۔۔۔۔۔۔ !۔اُس وقت تک میں نے جو کچھ بھی کیا تھا اپنی زات کی قید میں مقید ہو کر ہی کیا تھا۔ ٹیم ورک کیا ہوتا ہے میں اس سے قطعاً نا آشنا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!!۔

۔" اچھا چلیں آپ ایسا کریں کے میرے کسی بھی افسانے یا ناول کو فلما لیں"۔

میں نے یہ سوچ کر کہا کے اس ہٹ دھرم سے بھی جان چھوٹے گی اور اسکے لیئے بطورِ خاص کچھ لکھنا بھی نا پڑیگا۔

۔"نہیں بالکل نہیں، ادیب الحسن صاحب، میں آپ سے اپنے ایک برسوں پرانے آئیڈیا پر کہانی لکھوانا چاہتا ہوں، جیسے میں نے اُس وقت سوچا تھا جب میں کلکتے میں ہدایتکار روبن پارتو کو اسسٹ کر رہا تھا۔ لیکن مجھے فلمی صعنت میں کوئی ایک بھی ایسا ادیب نظر نہیں آتا جو اس کہانی کے ساتھ آپ سے بڑھکر انصاف کر سکے گا"۔

پرویزالاسلام فاضل کی آنکھوں کی چمک پہلے سے کہیں زیادہ گہری ہوتی چلی گئی اور اسکی اندرونی قلبی کیفیات و جذبات اسکے چہرے پر موجزن تھے۔

۔"ادیب صاحب، آپکے افسانوں اور ناولوں میں پائے جانے والا مخصوص رومانچک ماحول، اسکے کرداراور انکی خاص نفسیات جو کے زندگی سے انتہائی قریب تر ہوتے ہوئے بھی پراسراریت کی ایک دبیز چادر میں لپٹے رہتے ہیں اور انکی دلوں کو چھو لینے والی کہانیاں جو کے پڑھنے والوں کے دل سے لیکر احساس تک کو گرمااور آنکھوں سے لیکر روح تک کو بھگو دیا کرتیں ہیں۔ مجھے بھی اپنی فلم کے لیئے ایک ایسی ہی حساس کہانی اور ایسے ہی زندہ و جاوید کرداروں کی تلاش ہے"۔

پرویزالاسلام فاضل ایسے بول رہا تھا جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہوں، اسکی نظریں میرے چہرے پر نہیں دوُر خلاوں میں کہیں گھور رہیں تھیں۔

اب میں نے اپنا سب سے مہلک وکاری ہتھیار آزمانے کا فیصلہ کرلیا:۔

۔"اسلام صاحب، لگتا ہے آپ ہار ماننے والوں میں سے ہرگز نہیں، چلیئے میں

آپکی کہانی لکھ دونگا لیکن میرا معاوضہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ روپے ہوگا۔۔۔۔۔

۔!!!!"۔

میں نے ابتک کی اپنی آخری شائع شدہ کتاب جو کے مارکیٹ میں بیسٹ سیلر ثابت ہوئی تھی سے بھی کوئی چار گنا زیادہ معاوضہ بتا دیا اور پھر طنزیہ انداز میں اسکی طرف دیکھنے لگا۔

لیکن پرویز السلام فاضل کا چہرہ ویسا ہی کسی خاموش سی جھیل کی طرح پُرسکون اور اس پر وہی دھیمی سی مسکراہٹ موجود تھی جو اس ساری گفتگو کے دروان موجود رہی۔ محض چند ہی لمحات کے توقف کے بعد میری بات کے جواب میں اسکے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا:۔

۔"مجھے منظور ہے"۔

اتنا کہہ کر اسنے اپنے بریف کیس میں سے چیک بک نکالی اور اپنی بوشرٹ کی جیب میں لگا پین نکل کر جلدی جلدی ایک چیک لکھا، اسپر اپنے دستخط کیئے اور میری

طرف بڑھتے ہوئے بولا:۔

۔" یہ آپکا نصف معاوضہ ہے اور بقیہ کا چیک میں آپکی خدمت میں اس وقت پیش کرونگا جب آپ مجھے اسکرپٹ مکمل کرکے دینگے"۔

شاید اسے ہی تو کہتے ہیں کے خود آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا۔

چیک میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے وہ مذید بولا:۔

۔"اس ساری گفتگو کے دوران قسم لے لیں جو اگر آپ ایک بار بھی مسکرائیں ہوں، چلیں اب میری درخواست پر ایک بار مسکرا دیں، آپکا مسکرانا ہماری فلم کے لیئے مبارک ثابت ہوگا"۔

پہلے تو میرا جی چاہا کے اُسے خوب کھری کھری سناوں لیکن پھر یہ سوچ کر رہ گیا وہ میرے گھر میں بیٹھا ہوا تھا، میں نے بادل نخواستہ مسکراتے ہوئے اس سے چیک وصول کرلیا۔

مجھے آج تک یاد ہے کے اُس روز میں نے اسے چائے حتیٰ کے پانی تک پوچھے بغیر

ہی اپنے گھر سے چلتا کردیا تھا حالانکہ دورانِ گفتگو دو ایک بار بیگم نے چھوٹے صاحبزادے کو چائے پانی کا دریافت کرنے بھیجا بھی تھا لیکن میں نے بد تہذیبی کی انتہا کرتے ہوئے اسے پرویز اسلام فاضل کے سامنے ہی ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا۔

اسکے بعد شروع ہوا دوسرا مرحلہ اور وہ تھا اسکرپٹ مکمل کرنے کا۔

پرویز السلام فاضل نے مجھے اُسی روز فلم کی کہانی کا مرکزی خیال جسے فلمی زبان مین ون لائن اسٹوری کہا جاتا ہے سنایا۔

یہ ایک ایسے نوجوان شاعر و ادیب کی کہانی تھی جو اپنی تحریروں میں معاشرتی ناہمواری اور ناانصافی کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتا اور معاشرے کے رستے ناسوروں اور تلخ حقائق کو منظرِ عام پر لانے کی تگ ودو میں لگا رہتا۔ لیکن اس کوشش کی پاداش میں اس سے اسکا روزگار اس کی محبت اور حتیٰ کے اس سے جینے کا حق بھی چھین لیا جاتا ہے۔

پرویز السلام فاضل جہاں ایک زہین ہدایتکار تھا وہیں اُسے کہانی اور اُس سے مربوط واقعات کی بُنت کا بھی بڑی حد تک اندازہ تھا۔ گو کے اس نے مجھے کہانی

کا مرکزی خیال تو بڑا مختصر سا ہی سنایا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ اُس کہانی کے حوالے سے متعدد واقعات اور مناظر ڈسکس کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کے اُنہیں کس طرح سے پردۂ سیمیں پر پیش کیا جائیگا۔ دراصل اس کہانی کا تانا بانا وہ اپنے زہن میں گذشتہ تیس سالوں سے بن رہا تھا اور اب مجھے اس مرکزی خیال، واقعات اور مناظر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک مکمل کہانی کو پروان چڑھانا تھا۔

چونکہ میں کہانی لکھنے کی حامی تو بھر ہی چکا تھا اور پھر اسے لکھنے کے سلسلے میں پرویزالسلام فاضل کے ساتھ ہونے والی نشستیں کافی بارآور ثابت ہوئیں اور نا چاہتے ہوئے بھی میری اسمیں ایک خاص دلچپی پیدا ہوتی چلی گئ جسکے نتیجہ میں ایک بڑا ہی بھرپور اور مربوط اسکرپٹ معرضِ وجود میں آیا۔

چونکے یہ ایک نیم کمرشل، رومانوی اور سماجی نوعیت کی فلم تھی للہذا اسمیں گانوں کی بھرپور گنجائش تھی اور مجھے پرویزالسلام فاضل کی یہ بات بھی بہت ہی بھائی کے اپنے دیگر فلموں کی طرح محض فلم کی لمبائی بڑھانے اور فلموں کی روایت کو قائم رکھنے کی خاطر بھرتی کے گیتوں کی شمولیت کی بجائے مجھ سے فلم میں گیتوں کے لیئے ایک سے بڑھکر ایک سچویشنز لکھوائیں جس سے تمامتر نغمات فلم میں اسطرح سے فٹ ہوتے چلے گئے جیسے انگوٹھی میں متعدد نگینے فنکارانہ

مہارت سے جڑ دیئے گئے ہوں اور مزے کی بات تو یہ تھی کے یہ سارے کے سارے نغمات فلم کی کہانی کو آگے بڑھاتے چلے جاتے تھے۔

ایک روز وہ میرے پاس پھر آن دھمکا وہ اپنے ساتھ ایک کیسٹ لایا تھا۔اس نے وہ کیسٹ ڈرائینگ روم میں رکھے کسیٹ پلیئر میں اسے لگا کر چلا دیا۔ اسپیکرز سے ابھرنے والی آواز کو سُن کر میں حیرت میں پڑ گیا۔ فریدہ خانم اپنی ہی گائی ہوئی اطہر نفیس کی غزل گا رہی تھیں:

وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا اب اُسکا حال سنائیں کیا
کوئی مہر نہیں کوئی قہر نہیں اب سچا شعر سنائیں کیا

دراصل مجھے حیرت اس بات پر تھی کے فریدہ خانم وہ غزل گا تو اُسی روایتی دھن میں رہیں تھیں لیکن اسے ایک مکمل اور بھرپور آرکسٹرا کے ساتھ ریریکارڈ کر کے اسکی خُوبصورتی کو دوچند کر دیا گیا تھا۔

غزل مکمل ہوتے ہی پرویزالسلام فاضل میری طرف داد طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں نے اُس کی اُن داد طلب نظروں کی قطعاً پروانہ نا کرتے ہوئے بڑے ہی درشت لہجے میں سوال داغ دیا:۔

-"یہ کیا ہے؟"۔
یہ ہماری فلم کا تھیم سانگ یا یوں کہہ لیں کے تھیم غزل ہے، جو وقتاً وفوتاً فلم کے متعدد مناظر کے تاثر کو دوچند کرنے کے لیئے پسِ منظر میں چلائی جائیگی کیونکہ ہماری فلم کا مرکزی کردار ایک ناکام ادیب و شاعر ہے اس لحاظ سے اطہر نفیس کی یہ غزل ہماری فلم کے مزاج کو بہت سوٹ کریگی۔ اسکی دھن وہی رکھی گئی ہے جسمیں یہ پہلے ہی سے شہرت پا چکی ہے البتہ اس بار اسے چالیس سازندوں پر مشتمل آرکسٹرا کے ساتھ ریکارڈ کرکے مذید سنوار کر پیش کیا گیا ہے جسے نے اس شاہکار غزل کے امپیکٹ کو دوآتشہ کردیا ہے"۔
ایک مرحلہ پر آکر میرا پروڈیوسر السلام فاضل سے کسی حد تک اختلاف ہوگیا۔
کہانی کا مرکزی خیال تو یقیناً اُسی کا تھا لیکن اسے بحرحال صفحۂ قرطاس پر میرے قلم ہی نے حقیقت کا روپ دیا تھا اور اُس اسکرپٹ کو لکھتے لکھتے یہ مرکزی کردار میرے دل و دماغ میں رچ بس سا گیا اور میں نے اپنے دل ہی دل میں اس کردار کے لیئے موزوں ترین اداکار کی تلاش شروع کردی اور میرے زہن میں اس کردار، اسکی نفسیات، اسکی نشست و برخاست اور اسکی شخصیت کو مدِ نظر رکھتے

ہوئے پاکستانی فلمی صنعت کے ایک ہی اداکار کا نام بار بار ابھر کر آرہا تھا۔

جب میں نے پروڈیوسر انیس الاسلام فاضل کو اس کردار کے لیئے اپنے تجویز کردہ اداکار کا انتخاب کرنے کا مشورہ دیا تو حسبِ سابق اسکے چہرے پر اسکی ٹریڈ مارکہ دھیمی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ اپنے مخصوص پُرسکون لہجے میں گویا ہوا:۔

۔" یہ درست ہے کہ ندیم ہمارے ملک کا بہت بڑا اور باصلاحیت اداکار ہے اور میری بیشتر سابقہ فلموں میں اُسی نے مرکزی کردار ادا کئے ہیں اور مجھے اس امر سے بھی انکار نہیں کے وہ اس کردار کو اپنی بھرپور کردار نگاری سے زندہ و جاوید بنا سکتا ہے لیکن میں اپنی اس فلم کے زریعہ پاکستانی فلمی صنعت کو ایک نیاء اداکار دینا چاہتا ہوں اور میرے زہن میں اس کردار کے لیئے ایک بالکل نیاء چہرہ ہے۔ نیاء چہرہ فلم کے لحاظ سے لیکن وہ پاکستان ٹیلی وژن کے متعدد ڈراموں میں بے پناہ عمدہ اداکاری کا مظاہرہ کرچکا ہے۔ میں نے گذشتہ دنوں اس کردار کے مکمل گیٹ اپ میں اسکا اسکرین ٹیسٹ اور فوٹو شوٹ بھی کروایا ہے، جسکا میری توقع کے عین مطابق بے حد متاثرکن رزلٹ آیا ہے"۔

اتنا کہہ کر اسنے اپنا بریف کیس کھول کر ایک لفافہ نکلا اور اسمیں سے ڈھیر ساری تصاویر نکال کر میری طرف بڑھادیں۔

وہ نیا چہرہ آزر تھا۔ آزر ٹی وی ڈراموں کا ایک ابھرتا ہوا اداکار تھا اور مذکورہ فوٹو شوٹ میں فلم کے کردار سے مطابقت رکھتے ہوئے گیٹ اپ میں بلاشبہ ہو بہو میری کہانی کا کردار ہی معلوم ہو رہا تھا۔

اس وقت مجھے وہ کہاوت یاد آئی: جسکا کام اسی کو ساجھے۔

اسکرپٹ کے تمامتر پہلوؤں سے مکمل ہو جانے کے بعد پرویز السلام فاضل نے فلم کے دیگر پری پروڈکشن شعبوں پر اپنی گرفت مضبوط کرنا شروع کر دی۔ اعلیٰ ادبی پائے کے شعراء سے فلم کے گیت لکھوائے گئے اور پھر فلمی صعنت کے ایک بڑے ہی کامیاب اور زبانِ ذد عام نغمات کے تخلیقکار ماسٹر اسد اللہ کو موسیقی کا شعبہ تفویض کر دیا گیا۔

فلم کی شوٹنگ کے لیئے پرویز السلام فاضل نے کراچی کا انتخاب کیا اور اپنے دو معاون ہدایتکاران کے ہمراہ وہ مسلسل لوکیشنز مارک کرنے کے لیئے ریکی کرنے لگا اور مجھ سے اس نے بطورِ خاص فلم کے مکالموں کے درست تلفظ کے ادائیگی کے لیئے فلم کے مرکزی اداکار آزر کو ریہرسل کروانے کی درخواست کی اور اس کام کے لیئے علحیدہ سے معاوضے کی پیشکش کی جسے میں نے کسی قدر پس وپیش کے بعد

اس شرط کے ساتھ منظور کرلیا کے تمامتر ریہر سلز کے لیئے آزر روز میرے گھر آیا کرے گا۔

اور پھر ایک روز وہی ہوا جسکا مجھے ڈر تھا۔ اُس روز پروڈیوسر السلام فاضل اسکرپٹ لے کر میرے پاس آیا اور فلم کے چند ڈائیلاگز تبدیل کرنے کو کہا اور بس صاحب میں یہ سنتے ہی اپنے آپے سے باہر ہوگیا:۔

۔"چند کامیاب فلمیں بنا کر کیا تم نے یہ سمجھ لیا کے تم مجھ جیسے کامیاب اور سمجھ بوجھ رکھنے والے ادیب کے لکھے ہوئے مکالموں میں کیڑے نکالنا شروع کردو۔ اسی لیئے میں فلم والوں کے لیئے لکھنے کے خلاف تھا، میرا لکھا پتھر پر لکیر ہے اور میں اسے تبدیل نہیں کرونگا"۔

اتنا کچھ سننے کے بعد بھی اسکا چہرے ویسا ہی پر سکون تھا جیسا کے عموماً ہوا کرتا تھا۔ وہ بناء کچھ کہے بس خاموش بیٹھا رہا۔ غصے کے سبب میرا بلڈ پریشر ہائی ہوجانے کے باعث میں بھی کچھ دیر کے لیئے خاموش اپنی کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔ کچھ پندرہ بیس منٹ ماحول یونہی خاموش اور ٹھہرا سا ہی رہا۔

ماحول کو قدرے ٹھنڈا پا کر پروڈیوسر السلام فاضل بولا:۔

"ادیب صاحب، میں اس وقت یہاں اپنی فلم جو کے محض میری ہی نہیں ہم سب ہی کی فلم ہے کی بہتری کے لیئے حاضر ہوا ہوں۔ میرے خیال میں اگر اس کے چند مناظر میں شامل مکالموں کو زرا سا تبدیل کرلیا جائے تو اس سے نا صرف ان مناظر کا تاثر ابھر کر سامنے آئیگا بلکے بحیثیتِ مجموعی فلم پر بھی بہت ہی اچھا اثر پڑیگا"
لیکن میں بھی اپنی بات پر اڑا رہا۔ کافی دیر مجھے سمجھنے کی سعیِ لاحاصل کے بعد وہ اُس دن تو چلا گیا۔
اگلے روز جب میرا غصہ قدرے ٹھنڈا ہوا تو میں نے اسکرپٹ کو پرویز السلام فاضل کے آئیڈیا اور ان مناظر جن کے مکالمے وہ تبدیل کرنا چاہتا تھا کو زہن میں رکھ کر دوبارہ پڑھنا شروع کیا تو مجھے اُس کی بات ٹھیک لگی اور اُسی مناسبت سے مکالموں کی میرے زہن میں آمد ہوتی چلی گئی جو خود مجھے بھی پہلے سے کہیں بہتر محسوس ہوئے۔
اُسی شام پرویز السلام فاضل پھر میرے گھر آن دھمکا۔ حالانکہ میں سمجھ رہا تھا کے میرے گذشتہ روز کے برتاو کے بعد وہ مجھ سے ناراض ہوگا۔

وہ ڈرائنگ روم میں میرا انتظار کر رہا تھا، جیسے ہی میں کمرے میں داخل ہوا اسکا وہی پُرسکون چہرہ اور مدھم سی مسکراہٹ دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔ میں نے کچھ اور کہے بناء اسکرپٹ اسکے ہاتھ پر دھر دیا۔

کچھ دیر سر جھکائے اسکرپٹ دیکھتا رہا اور پھر جب اسنے سر اٹھایا تو اسکی مدھم سی مسکراہٹ ایک گہرے معنی خیز تبسم میں ڈھل چکی تھی۔

۔"میں جانتا تھا، ایسے پُراثر اور جکڑ لینے والے مکالمے صرف آپ ہی تخلیق کر سکتے ہیں"۔

پروڈیوسر السلام السلام تو اسکرپٹ لے کر چل دیا لیکن جاتے جاتے وہ مجھے سوچ کے ایک گہرے بھنور میں دھکیل گیا۔

اُس روز میں نے سوچا کے ایک تخلیق کار میں ہوں جو اسٹڈی کے دروازے کے پیچھے اپنے "کمفرٹ زون" میں بند اپنی ذات کے ویرانوں میں گم ہو کر ایک فن پارہ تخلیق کرتا ہے۔ اُس زیرِ تخلیق افسانے یا ناول کی کہانی، پلاٹ، واقعات، کردار، ان کے رویے، نفسیات، انکی گفتگو، انکی نشست و برخاست، انکی سوچ اور

جذبات سب ہی کچھ تو میرے قلم کے تابع ہوتے ہیں۔ میں جب اور جیسے چاہوں انکو استعمال کروں اور ان میں سے کوئی بھی میرے سامنے چوں وچراں کرنے کی ہمت تک نہیں کر سکتا۔

اور پرویز السلام فاضل بھی تو ایک تخلیقکار ہی ہے لیکن اُسے اپنی تخلیق کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیئے تخلیقکاروں کی ایک مکمل ٹیم مرتب کرنا پڑتی ہے اور اس ٹیم کا ہر رکن جو کے میرے افسانوں اور ناولوں کے کرداروں کے برعکس گوشت پوشت سے بنا، جذبات واحساسات رکھتا جیتا جاگتا انسان اور اپنی ذات میں خود ایک مکمل تخلیقکار ہوتا ہے سے اپنی تخلیق کے ایک مخصوص گوشے کو سنوارنے کا کام اپنی مرضی کے عین مطابق ایسے لینا ہوتا ہے کے ان تمام تخلیقکاروں کے کام میں ایک مکمل ہم آہنگی پیدا ہوجائے اور وجود میں آنے والی تخلیق ایک ایسی کثیر جہتی پینٹنگ کی شکل اختیار کرلے جسکا ہر زوایہ نا صرف ایک دوسرے کی شان بڑھائے بلکے بحیثیتِ مجموعی ایک مکمل و اعلیٰ فن پارے کا بھرپور تاثر بھی فراہم کرے۔

پرویز السلام فاضل کے ساتھ اپنے رویہ کی بدصُورتی کا درست اندازہ مجھے فلم "آئینۂ زندگی" کے پریمئیر شو والے دن ہوا۔ جی ہاں یہ ہی نام تھا اُس فلم کا۔

کسی حد تک فلم کے معیاری ہونے کی امید تو میں نے شروع دن سے ہی لگا رکھی تھی لیکن اُس روز سنیما کے اندھیرے ہال میں مسلسل تین گھنٹے میں نے پرویز السلام فاضل کے فن کا مظاہرہ دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کے جیسے میں کوئی فلم نہیں بلکے پردہِ سیمیں پر اپنا ہی کوئی بھولا بسرا سُہانا سپنا دیکھ رہا ہوں جو میں کبھی پہلے دیکھ کر بُھول گیا تھا لیکن اُسکے چند دھندلے دھندلے حسین مناظر اب بھی اکثر میرے زہن کے نہاں خانوں سے ابھر ابھر کر مجھے دنیا و مافیہا سے بے خبر کرتے ہوں اور پرویز السلام فاضل نے کمال فنکارانہ مہارت کے ساتھ اس حسین و دلربا سپنے کو سیلولائیڈ کے فیتے پر منتقل کر دیا تھا۔

ٹیم ورک کے معجزے پر میرا ایمان اس روز کامل ہوا جب فلم "آئینہِ زندگی" کو کل سات نیشنل فلم ایوارڈز جمیں بہترین فلم، بہترین ہدایتکار، بہترین اداکار، بہترین موسیقار، بہترین سنیماٹوگرافر کے علاوہ مجھے بہترین مصنف اور مکالمہ نگار کے دو ایوارڈز سے نوازا گیا۔

اس فلم کی فقید المثال کامیابی کے بعد میں اور پرویز السلام فاضل ایک ٹیم کی شکل اختیار کر گئےاور پھر یہ رفاقت انتہائی گہرے دوستانے پر منتج ہوئی اور

انکی اگلی تمام فلموں جنکی کُل تعداد چار بنتیں ہیں کی کہانیاں اور مکالمے میں نے ہی لکھے۔

بلاآخر یہ ٹیم اور دوستی ٹھیک گیارہ سال بعد ہدایتکار پرویز السلام فاضل کے اچانک ہارٹ اٹیک کے باعث انتقال کر جانے سے ٹوٹ گئی۔

آج پرویز السلام فاضل کو ہمارا ساتھ چھوڑے ہوئے بائیس سال کا عرصہ گزچکا ہے لیکن مجھے یہ کہنے میں قطعاً کوئی عار نہیں ہے کے اسلام صاحب کے جانے کے بعد اُس جیسا کوئی اور خوابوں کا صُورت گر ہماری فلمی صعنت کو میسر ہی نا آسکا۔

انکے اور میرے گیارہ برس کے ساتھ اور اس حقیقت کے باوجود کے وہ مجھ سے عمر میں بڑے بھی تھے انہوں نے کبھی میرے طرزِ عمل کے بارے میں مجھ سے کوئی بات تک نا کی اور محض اپنے عمل اور کردار سے میرے رول ماڈل بنے۔

میری دعا ہے کے اللہ پرویز السلام فاضل مرحوم کی معغفرت کرے اور انکے درجات بلند کرے آمین۔

یہ آخری کلمات ادا کرکے میں نے ڈائس پر بکھرے کاغذات سمیٹے اور اسٹیج سے اتر کر سست قدم اٹھاتا ہوا اپنی نشست کی جانب چل دیا۔ آرٹس کونسل کے کھچا کھچ بھرے ہوئے آڈیٹوریم میں محض چند ساعتوں کی مکمل خاموشی کے بعد اچانک چھت شگاف تالیوں کا ایک نا رکنے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو تمام حاضرین اپنی اپنی نشستوں سے کھڑے ہوکر والہانہ انداز میں تالیاں پیٹ رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ تالیاں پروینز السلام فاضل کی برسی پر لکھے گئے میرے مقالے کی پسندیدگی کے لیئے تھیں یا خود پروینز السلام فاضل مرحوم کے لیئے۔۔۔۔۔۔۔!!!۔

خواب مرتے نہیں

خواب مرتے نہیں
خواب دل ہیں نہ آنکھیں نہ سانسیں کہ جو
ریزہ ریزہ ہوئے تو بکھر جائیں گے
جسم کی موت سے بھی یہ نہ مر جائیں گے
خواب مرتے نہیں
خواب تو روشنی ہیں نوا ہیں ہوا ہیں
جو کالے پہاڑوں سے رُکتے نہیں
ظلم کے دوزخوں سے پُھکتے نہیں
روشنی اور نوا اور ہوا کے عَلَم
مقتلوں میں پہنچ کر بھی جھکتے نہیں
خواب تو حرف ہیں
خواب تو نُور ہیں
خواب سُقراط ہیں
خواب منصور ہیں
خواب مرتے نہیں

مجھے آج بھی یاد ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ !، احمد فراز کی یہ نظم تمھیں بہت پسند تھی۔۔۔۔

۔۔۔۔!!!۔

تم اُس کو اکثر دہرایا کرتے تھے۔ پہلی بار تم نے مجھے یہ نظم ہماری شادی کی پہلی رات خود احمد فراز کی کتاب "جاناں جاناں" سے تحتِ الفظ پڑھ کر سنائی تھی۔ گو کہ مجھے اُس وقت شعر و شاعری سے کچھ خاص لگاؤ تو نہ تھا اِس کے باوجود فراز صاحب کی یہ نظم مجھے بہت پسند آئی تھی اور جس دلفریب انداز میں تم نے اِسے پڑھا تھا، آج تیس سالوں بعد بھی میں بھول نہیں سکی ہوں۔

یہ تو پھر کچھ دیر بعد مجھے پتہ چلا کہ تم کو یہ نظم صرف اس لیئے ہی پسند نہ تھی کہ یہ تمھارے پسندیدہ شاعر فراز صاحب کی ایک بہت اچھی نظم ہے۔ بلکہ اِس کی وجہ یہ تھی کہ تم خود بھی ایک خواب دیکھنے والے اور اُن پر یقین رکھنے والے انسان تھے۔

ہماری شادی جو ہمارے والدین کی پسند اور کوششوں سے ہوئی تھی کے وہ ابتدائی سال مجھے آج بھی یاد ہیں جو ہم نے کم و بیش کسمپرسی کی حالت میں گزارے۔ اُن حالات میں بھی تمھارا حوصلہ، تمھارے چہرے کی وہ دلفریب مسکراہٹ اور تمھارا آنے والے اچھے دنوں کے ایک خوابِ مسلسل میں کھوئے رہنا، مجھے بھلائے نہیں

بھولتا۔

مجھے آج بھی یاد ہے کہ اُس مشکل دور میں بھی تمھیں جس روز تنخواہ ملتی. اُس دن تم میرے ہزار منع کرنے کے باوجود بھی دو چیزیں خریدنا ہرگز نہ بھولتے۔ میرے لئے کوئی نہ کوئی تحفہ اور دوسرا اپنے لئے کوئی کتاب۔ میں تم سے ہمیشہ بحث کرتی: "آخر مہنگائی کے دور میں جبکہ ہمارا ہاتھ بھی ہمیشہ پیسوں سے تنگ ہی رہتا ہے تو پھر اِس فضول خرچی کی بھلا کیا تک ہے؟"۔ تم پہلے مسکرا دیتے اور پھر کہتے: "میری جان۔۔۔۔۔!، تم کیوں ہر وقت پیسوں کی فکر میں دبلی ہوئی جاتی ہو، ارے یہ پیسے تو پھر آ جائیں گے لیکن یہ زمانے جو بیتے تو پھر واپس نہ آئیں گے"۔ "اور وہ آخری تاریخوں میں جو پریشانی اٹھانی پڑتی ہے، اُس کا کیا؟"۔ میں تمھاری بات سُنی ان سُنی کرتے ہوئے کہتی۔

ارے گولی مارو آخری تاریخ کو، جب آئے گی تب دیکھ لیں گے"۔ تم شوخی بھری" مسکراہٹ کے ساتھ کہتے: "بس یہ کچھ دنوں ہی کی بات ہے، تم دیکھنا ثریا، انشاء اللہ ہم بہت اچھی زندگی گزاریں گے اور ہم ہر وہ خوشی ضرور حاصل کریں گے جن کے ہم نے سپنے دیکھ رکھے ہیں"۔ "لیکن کیسے؟، میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کرائے کے گھر میں تو ہم رہتے ہیں، روپیہ پیسہ ہمارے پلے نہیں، کوئی ملکیت جائیداد ہمارے پاس نہیں۔ تو پھر یہ سب بھلا ہوگا کیسے؟"۔ "ہاں تم کہتی ٹھیک ہی ہو، یہ سب کچھ تو ہمارے پاس ہرگز نہیں۔ لیکن ہمارے پاس حوصلہ ہے، ہمت ہے، ہماری

محنت ہے اور سب سے بڑھکر ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں اور پھر ہمارے خواب ہیں اور تم جانتی ہو نہ کہ خواب مرتے نہیں"۔ یہ ساری باتیں کہتے ہوئے تمھارے چہرے اور آنکھوں میں لہراتی وہ چمک مجھے آج بھی یاد ہے۔

تمھاری اُن باتوں سے زِچ ہو کر میں ہمیشہ یہ شعر پڑھ دیتی:۔

؎ خواب پھر خواب ہیں خوابوں سے نہ کر پیار صنم
کون جانے اِنہیں تعبیر ملے یا نہ ملے

جسے سن کر تم پہلے تو بڑے زور کا قہقہہ لگاتے اور پھر مذاق اڑانے والے انداز میں کہتے: ہاں بس تمھیں تو لے دے کہ ایک یہ ہی شعر یاد ہے اور وہ بھی ایک فلمی گیت سے "چُرایا ہوا"۔

سچ ہی تو کہتے تھے تم۔ ویسے بھی اُس زمانے میں مجھے شعروادب سے یوں بھی کچھ خاص لگاؤ نہ تھا اور وہ تو شادی کے بعد ہم نے سنیما میں جا کر جو پہلی فلم دیکھی تھی اس میں شامل مہدی حسن کے گائے ایک گیت کے مکھڑے کے بول تھے۔

ہم کسی حد تک دو متضاد طبیعتوں کے حامل افراد تھے۔ تم ایک خواب دیکھنے والے ایسے شخص جو اپنی بے سروسامانی اور بظاہر کسی پختہ وسیلے اور سہارے کی

غیر موجودگی کے باوجود بھی ہمہ وقت آنے والے روشن دنوں کے منتظر اپنی بانہیں وا کیئے ہنستے مسکراتے اُن کے استقبال کے لیئے چشم ما روشن دلِ ماشاد کی عملی تصویر بنے رہتے۔

اِس کے برعکس میں ایک ایسی لڑکی جس کا دل و دماغ ہر لحضہ آنے والے دنوں کے اندیشہ ہائے سودوزیاں میں غلطاں وپیچاں رھکر کسی حد تک اپنے آج کو فراموش کر دیتا۔ جبکہ تم ہر دن ہر لمحے میں جینے والے اور ہر دن اور ہر لمحہ کو جینے والے ایک نٹ کھٹ سے نوجوان۔

سچ پوچھو تو وہ تمھارے اچھے دنوں کے سپنے کوئی اب ایسے انھونے بھی نہ تھے۔۔۔۔۔۔۔۔!۔ تم اپنے کل اور بقُول خود تمھارے، "روشن اور سُنھرے مستقبل" سے بھلا چاہتے ہی کیا تھے؟ زندگی کے وسیع تر دامن سے تم نے اپنے لئے مانگا ہی کیا اور کتنا تھا؟ بھلے ہی تم ایک سپنے دیکھنے اور ان میں گم رھکر خوش رہنے والے انسان تھے لیکن تمھارے وہ سپنے خود تمھاری سادہ طبیعت کے جیسے سادہ ہی تو تھے۔

رہنے کو ایک اچھا سا گھر، اُس گھر کو اپنی قلقاریوں سے زندگی بخشتے دو بچے، زندگی ہنستے کھیلتے گزر جائے بس اتنا ہی مٹھی بھر روپیہ، پڑھنے کو ڈھیر ساری

کتابیں، سننے کو رُوح کی گہرائیوں تک اتر جانے والا مدھر سنگیت، فارغ اوقات میں سیر سپاٹے یا پھر من پسند فلمیں۔ سُنہری رنگت کے تو تم غلام بے دام تھے۔ لیکن سُنہری رنگت والے سونے کے نہیں بلکہ چائے کی گرما گرم بھاپ اُڑاتی پیالی میں ڈوبتے سورج کی گہری سُنہری رنگت کے۔ گھومنے پھرنے کے لیئے پرانے ماڈل ہی کی سہی مگر ایک چلتی ہوئی گاڑی۔ تمھاری ایک بڑی خواہش اُن تمام تحریروں کا مجموعہ شائع کروانا بھی تو تھی جو تم نے اپنی اخبار کی ملازمت کے دوران لکھی تھیں۔ ہاں البتہ ایک شوق تمھارا رئیسانہ سا ضرور تھا۔ تمھیں ساری دنیا بطورِ خاص امریکہ اور انگلستان دیکھنے کا بہت شوق تھا اور جب میں تمھیں اس بات کو لے کر چھیڑا کرتی تو تم حسبِ عادت مسکراتے ہوئے کہتے: "میری جان۔۔۔۔۔۔!۔ سفر پیسوں سے نہیں مقدر سے ہوا کرتا ہے"۔ کتنا سچ کہتے تھے تم۔۔۔۔۔۔۔!!!۔

ہاں البتہ مجھے یہ تو کہنا ہی پڑے گا کہ تمھاری پُرامیدی اور مستقبل کے حوالے سے تمھاری وہ پُرخیالی محض زبانی جمع خرچ تک ہی محدود نہ تھی۔ تم اچھے دنوں کی تلاش میں بن پڑی محنت اور ہر قابلِ عمل تدبیر میں لگے رہتے۔ ہماری شادی کے فوراً بعد ہی سے تو تم دو نوکریاں کرنے لگے تھے۔ ایک دن کے وقت کسی دفتر میں دوسری رات دیر گئے تک ایک اخبار میں۔

ہاں رات دیر گئے پر مجھے یاد آیا کہ اکثر کڑکتی سردیوں کی راتوں اور برستی برساتوں میں تم اخبار کے دفتر سے واپس گھر آتے ہوئے کہیں سڑک پر کسی دکان کے چبوترے یا ریڑی کے نیچے سردی کی شدت سے ٹھٹھرتے ہوئے بھیگے کتے کے پلے یا بلی کے بچے کو اخبار میں لپیٹ کر گھر لے آتے اور پہلے تولیئے سے رگڑ رگڑ کر خشک کرکے نیم گرم دودھ پلاتے اور پھر کسی پرانے لحاف میں لپیٹ کر اُس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر پھیر کر سُلانے کی کوشش کرتے اور جب وہ قدرے خُوابیدہ سا ہوجاتا تو تم خود تو کھانا کھا کر لمبی تان کر سو رہتے لیکن اُن کی چیاؤں چیاؤں اور میاؤں میاؤں ساری رات مجھے جگائے رکھتی۔ تمھاری آئے دن کی اِن حرکتوں پر میں کتنی بھی سیخ پا ہوتی مگر تم کسی بھی بات کا اثر لیئے بغیر اپنے چہرے پر وہی اپنی ٹریڈ مارکہ مسکراہٹ سجائے مجھے جانوروں سے حسنِ سلوک کا درس دیتے رہتے۔ اگلی صبح تمھارے دفتر چلے جانے کے بعد میں تمھارے دیئے درسِ حیوانیت کو بالائے طاق رکھ اُسے بناء کسی عزت واحترام کے لعن طعن کی توپوں کی سلامی دیتے ہوئے گھر سے رخصت کر دیتی۔

چلو یہاں تک تو بات ٹھیک تھی۔ مگر یہ کیا کہ جہاں کسی ضرورت مند نے دستِ سوال دراز کیا وہاں تم نے اپنے بٹوے کا آخری نوٹ بھی میری شعلہ بار نظروں کی پرواہ کیے بغیر ہی اُس کی ہتھیلی پر دھر دیا۔

دن گزرتے رہے۔ اللہ نے ہمیں دو بیٹوں کی عظیم نعمت سے نوازا۔ ہم کرائے کے گھر سے ایک دو کمروں کے مختصر سے چھوٹے مگر ذاتی گھر میں اُٹھ آئے۔ ہتھ چھٹ روپیہ نہ سہی لیکن اُس رحمان و رحیم کے فضل سے کبھی یہ نوبت بھی نہ آئی کہ کسی کے آگے دستِ طلب واکرنا پڑا ہو۔ گاڑی نہ سہی لیکن تم نے ایک عدد سکینڈ ہینڈ موٹرسائیکل تو شادی کے چند سال بعد ہی خرید لیا تھا۔ بچوں کے آنے سے قبل ہم دونوں اُس پر شہر بھر کی سڑکوں پر خوب فراٹے بھرتے گھوما کرتے اور پھر بچوں کے آ جانے کے بعد وہ بھی ہمارے اُس ہوادار سفر کے ساتھی ٹھہرے۔

البتہ شادی کے بارہ پندرہ برس گزر جانے کے بعد کبھی کبھار تم دبے لفظوں میں یہ گلہ ضرور کرتے کہ ابھی تک ہم کسی بیرون ملک کے سفر کو نہیں جاسکے۔ جس پر میں تمھیں شادی کی پہلی سالگرہ پر جب ہم پہلی بار اپنے شہر کراچی سے نکل کر ایک چھوٹے اور سادہ سے پاکستان ٹور پر گئے تھے۔ جس میں ہماری پہلی منزل لاہور تھی۔ اُس کے بعد مری براستہ و مختصر قیام روالپنڈی اسلام آباد اور پھر حتمی منزل سوات کے حسین و یادگار سفر کی یاد دلاتی تو ہم دونوں گھنٹوں اُس ٹور کی باتیں کرتے اور ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے ہم وہاں شادی کی پہلی سالگرہ پر نہیں ابھی کل ہی تو گئے ہوں۔

وقت کا پہیہ یونہی چلتا رہا۔ تمھارے سیاہ بالوں میں اب چاندی اور اِٹھلاتے

سے شگفتہ لہجے میں تردد اتر آیا تھا۔ خیر بالوں کی چاندی تو وقت اور عمر دونوں ہی کا تقاضہ تھا لیکن تمھارے لہجے میں در آنے والا وہ تردد شاید اِس بات کا غماز تھا کہ تمھیں اب یہ فکر لاحق ہو چلی تھی کہ کیا تمھارے دونوں بیٹے تمھاری طرح ہی کی زندگیاں گزاریں گے۔ تم نے کبھی یہ ظاہر نہیں کیا لیکن شاید تمھیں یہ ملال تھا کہ پوری زندگی تم نے بھرپور محنت کی اور گو کہ تم نے کبھی مجھے اور بچوں یاسر اور باقر میں سے کسی کو بھی حتی المقدُور کوئی کمی نہ آنے دی تھی لیکن اتنا سب کچھ کرنے کے باوجود تم اتنا پس انداز نہ کر سکے تھے کہ اِنہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرونِ ملک روانہ کر سکو یا یہیں کسی چھوٹے موٹے کاروبار ہی کا آغاز کروا دو۔

شاید تمھیں یہ اندازہ نہ ہو کہ آج بھی یاسر اور باقر تمھاری محبتوں، محنتوں اور قربانیوں کے تہہ دل سے معترف ہیں اور یہ کہتے نہیں تھکتے کہ آج وہ جو بھی ہیں خدا کے بعد اپنے والد ہی کی مرہونِ منت ہیں۔ ہمارا بڑا بیٹا یاسر تو اب ماشاء اللہ سے امریکہ جا بسا ہے جبکہ باقر یہیں کراچی میں ہی ایک بہت ہی اچھے ادارے کے لیئے کام کر رہا ہے اور اللہ اُسے بُری نظر سے محفوظ رکھے بہت اچھی اور مطمئن زندگی گزار رہا ہے۔

ہاں یاد آیا۔ وہ جو تم کہتے تھے نہ کہ: "سفر پیسوں سے نہیں مقدر سے ہوا

کرتا ہے"۔ سو فیصدی درست کہتے تھے۔ اب میں موسمِ گرما میں یاسر کے پاس امریکہ چلی جاتی ہوں اور موسمِ سرما باقر کے پاس گزارتی ہوں۔ یاسر نے تو اپنے امریکہ والے گھر کا ایک پورا کمرہ دیوار در دیوار کتابوں سے ٹھیک اُسی طرح سے سجا کر رکھا ہے جسے کبھی تم نے سوچا تو ضرور تھا لیکن عملی جامعہ نہ پہنا سکے۔ تمھیں یاد تو ہوگا کہ یاسر کو بھی تمھاری طرح سے لکھنے لکھانے کا بہت ہی شوق تھا اور جب اُس کا پہلا مضمون نہ جانے کس اخبار میں شائع ہوا تھا تو وہ اخبار اور اُس میں چھپے یاسر کے پورے نام "یاسر حماد خان" کو دیکھ دیکھ کر تمھارے چہرے پر آئی سُرخی کو میں کیسے بُھول سکتی ہوں۔ اب تو سنا ہے کہ یاسر بڑے اچھے افسانے لکھنے لگا ہے۔ لگتا ہے سال دو سال میں اُس کے افسانوں کا مجموعہ بھی چھپ ہی جائے گا تو اس پر یاسر کے نام کے ساتھ تمھارا نام حماد خان بھی تو چھپے گا تو یوں تمھارا صاحبِ کتاب ہونے والا ارمان بھی انشاءاللہ ضرور پورا ہو جائے گا۔ یاسر اکثر کہتا ہے کہ ابو کو امریکہ دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ کاش کہ اللہ اُنہیں کچھ اور عمر بخش دیتا تو میں اُن کا یہ ارمان ضرور پورا کرتا۔۔۔۔۔۔! لیکن جو اُس کو منظور۔۔۔ ۔۔۔۔۔!!!۔

ویسے مجھے یقین ہے کہ اب تم جہاں ہو وہاں سے اچھی جگہ تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی اور یوں بھی تمھیں اچھی جگہیں دیکھنے اور گھومنے کا شوق تو شروع ہی سے تھا تو اب اُس جگہ سے بھی بھلا کوئی اچھی جگہ ہو سکتی ہے کیا؟ مجھے پتہ ہے

تم اپنی عادت کے مطابق وہاں بھی سب کو اپنے گرد جمع کرے اپنے پسندیدہ شاعر احمد فراز کی اپنی پسندیدہ نظم تحت الفظ میں سناتے ہوگے اور ہاں اب تو فراز صاحب بھی وہیں کے مکیں ہوگئے ہیں تو تمھاری اور اُن کی تو بڑی گاڑھی چھنتی ہوگی؟

سنو حماد۔۔۔۔۔۔۔۔۔!۔اب میں تم سے جو کہنا چاہتی ہوں اور اگر تم میری بات سن سکتے ہو تو پھر غور سے سنو۔ میں تم سے وہی بات کہنا چاہتی ہوں جو تم مجھ سے کہا کرتے تھے۔ ہاں وہی بات اور یہ بات تم سے زیادہ اور کون بہتر سمجھ سکتا ہے:۔

۔"خواب مرتے نہیں" ۔

تمھارے آخری دنوں میں، میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ شاید تم اِندر ہی اِندر اِس بات کی سچائی سے کچھ مایوس سے ہو گئے تھے لیکن آج تم خود دیکھ لو کہ یوں تو اب تم نہ سانس لیتے ہوں، نہ ہی تمھاری آنکھیں خواب دیکھتی ہیں لیکن تم نے جو خواب دیکھے تھے وہ تمھاری جسمانی موت کے باوجود آج بھی زندہ وجاوید ہیں۔ وہ خواب اب بھی سانس لیتے ہیں۔ اُن خوابوں کی دھڑکنیں اب بھی جاری ہیں۔ میں اُن کے سانس لینے کی آواز اور اُن کی دھڑکن جو میرے اُرد گرد فضاؤں

میں پھیلی ہوئی ہیں کو یوں سن سکتی ہوں جیسے وہ خُود تمھاری اپنی ہی سانسیں و دھڑکنیں ہوں۔ تمھارے وہ خواب اب بھی مجھے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ روشنی بکھیرتے ہیں۔ یاسر اور باقر کی صُورت میں۔

اچھا حماد۔۔۔۔۔۔! ، رات کافی ہوگئی ہے، اب مجھے اجازت دو مجھے اب سو جانا چاہیئے۔۔ ویسے بھی صبح میری فلائٹ ہے۔ ارے بھئی یاسر کے پاس گرمیاں گزارنے جو جارہی ہوں۔ تمھارے اُن ہی خوابوں کی تلاش میں جو کبھی تم نے دیکھے تھے اور ویسے بھی اب اِس عمر میں میرے پاس سوائے خواب دیکھنے کو اور کام ہی کیا ہے اور تم تو جانتے ہی ہو ناکہ خواب مرتے نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!!۔

میرے بچے میری آنکھیں

۔"کیا آپ اِن صاحب کو جانتے ہیں؟ "۔میں نے اپنی آنکھوں کے اشارے سے باغ کے کونے میں لگی بینچ پر بیٹھے انتہائی عمر رسیدہ شخص، جس کے سر کا ایک ایک بال سفید اور وہ بس یونہی خلاؤں میں گھورے چلا جارہا تھا، کی طرف اشارہ کرتے ہوئے باسط احمد سے دریافت کیا۔

۔"نہیں نذیر بھائی، بس میں بھی آپ ہی طرح سے اِنہیں گذشتہ چند ہفتوں سے یہاں پارک اور مسجد میں دیکھ رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ اِس علاقے میں نئے نئے رہائش پذیر ہوئے ہوں۔ لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"۔ باسط صاحب نے اپنی بات پوری ہوتے ہی ایک عدد سوال بھی داغ دیا لیکن پھر فوری طور پر اُس کا جواب بھی خود ہی دینے لگے: "ہاں بھئی کیوں نہیں، آپ ٹھہرے صحافی اور وہ جو کہتے ہیں نا کہ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے، ریٹائرڈ ہونے کے بعد بھی آپ کا صحافیانہ تجسس اب بھی برقرار ہے"۔

۔"باسط صاحب، بات دراصل یہ کہ اِن چار پانچ ہفتوں کے دوران اِنہیں ہمیشہ لگ تھلگ ہی دیکھا ہے، حتیٰ کہ وہ مسجد میں بھی کسی سے گھلتے ملتے نہیں۔ بس

ہمیشہ خاموش ہی رہتے ہیں"۔ میں نے باسط احمد سے کہا۔ "کم و بیش روزانہ ہی نمازِ فجر کے بعد سجدے میں چپکے چپکے گھٹی گھٹی آواز میں روتے اور اِن کی آنکھوں کو لال سرخ متورم بھی دیکھا ہے"۔

میری بات سن کر باسط احمد دھیرے سے مسکرا دیئے اور بولے: "نذیر صاحب، اِس عمر میں ہی تو انسان کو سفرِ آخرت کا خیال آتا ہے اور اپنی مغفرت کی فکر آن گھیرتی ہے۔ میں نے تو بڑے بڑے دنیا داروں کو اِس عمر میں دنیاداری سے کنارہ کش ہو کر یاد اللہ میں مشغول ہوتے اور دن رات فکرِ آخرت میں گریہ وزاری کرتے دیکھا ہے۔ میری ذاتی رائے میں جتنے عمر رسیدہ یہ نظر آتے ہیں تو اب یہ ان کی عمر کا تقاضہ بھی تو ہے"۔

۔"لیکن باسط صاحب، مجھے یہ کچھ اور ہی بات لگتی ہے"۔ میں نے انتہائی پُریقین لہجے میں کہا۔ "وہی تو میں کہہ رہا تھا ابھی کچھ ہی دیر پہلے کہ کوتوالِ شہر کو تو بس ہر کسی کی داڑھی میں تنکا ہی نظر آتا ہے۔ کیا ہوا جو اب آپ عملی صحافت نہیں کرتے لیکن کیا کیجیئے کہ ہر اچھے صحافی کا مزاج بچپن ہی سے صحافیانہ ہوا کرتا ہے اور پھر مرتے دم تک رہتا ہے"۔ باسط صاحب حسب معمول اپنی مخصوص بزلہ سنجی پر اتر آئے۔ "چلیں صاحب آپ کے اِس تجسس کا بھی کچھ علاج کرتے ہیں۔ آپ نے تو مجھے بھی تجسس میں مبتلا کر دیا۔ ویسے بھی آپ

کے پاس تو بس نرا تجسّس ہی برآمد ہوا کرتا ہے اور محلے بھر کی ساری خبریں اپنے زوار حسین صاحب لیئے پھرتے ہیں۔ اُن کے پاس آپ کے تجسّس کا درمان ضرور ہوگا۔ بقول ازخود بلکے بقلم خود ہمارے":۔ ریٹائیرڈ صحافی ہوا کرے کوئی
میرے تجسّس کی دوا کرے کوئی
حسبِ سابق باسط صاحب کی خوش گفتاری کا چرخہ چل پڑا
ہم دونوں پارک کے ایک کونے میں اپنے ہاتھوں کو ہوا میں بلند کرتے پھر سینے کے سامنے لا کرانہیں تیز تیزاِدھر اُدھر گھما کر ورزش کرتے زوار صاحب کی طرف چل پڑے۔ زوار صاحب کو ہمارے محلے کی بی بی سی نیوز سروس کہا جاتا ہے۔ اُن کے پاس محلے کے ہر گھر کی مفصل رپورٹ موجود رہتی اور عندالطب مہیا بھی ہو جایا کرتی ہے۔
۔"السلام علیکم۔۔۔۔۔۔۔۔ ، یا اہلِ چمن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!!" باسط صاحب نے اُنہیں دیکھ کر دور ہی سے ہانک لگائی۔ "وعلیکم السلام۔۔۔۔۔۔۔۔ ، یا مرغانِ چمن۔ ۔۔۔۔۔۔!!!". زوار صاحب بھی بھلا کوئی باسط صاحب سے کچھ کم تھے کیا۔ مسکراتے ہوئے بولے۔ "آج یہ طیورِ آوارہ کی ٹولی کس

سمت کو نکلی ہے؟"۔ "جی بس آپ ہی جیسے کسی بلبلِ خُوش نوا کی تلاش میں ہیں جو نالۂ چمن کہنے کو مُضطر ہو"۔ دونوں میں ترکی بہ ترکی نشانہ بازی جاری تھی۔

اِس سے قبل کے یہ چاند ماری شدت اختیار کرلیتی، میں نے اُن دونوں کو ایک خالی بینچ دکھاتے ہوئے اُس جانب چلنے کا اشارہ کیا اور پھر ہم تینوں اُس پر براجمان ہو گئے۔ زوار صاحب کو ہم نے اپنے بیچوں بیچ بیٹھا لیا۔ ۔"جی اب کہیئے، یہ غلام بے دام، آپ کے کس کام آسکتا ہے؟" زوار حسین نے اپنا ہاتھ سینے پر رکھ کر سر خم کرتے ہوئے پوچھا۔ "ارے بھئی یہ جو اپنے نذیر صاحب ہیں نا، ریٹائیرڈ صحافی نذیر احمد صاحب" باسط صاحب نے ریٹائیرڈ صحافی پر کچھ زیادہ ہی زور دیتے ہوئے کہا: "انہیں کسی کے بارے میں کچھ جاننا ہے" یہ سن کر زوار صاحب میری طرف سوالیہ نگاہوں سے بغور دیکھنے لگے۔ میں نے اُن سے جلدی جلدی وہی کچھ کہہ دیا جو میں پہلے باسط صاحب سے کہہ چکا تھا۔ میری بات سن کر زوار صاحب کے چہرے پر ایک ہلکا سا تبسم آیا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بولے: "ویسے میں بھی اِن حضرت کو کچھ خاص تو نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ یہ معین احمد کے مہمان ہیں، وہی مکان نمبر 5 والے اور کچھ ہی ہفتے ہوئے حیدرآباد سے آئے ہیں"۔

مسجد سے ملحقہ اِس پارک جہاں میں روز نمازِ فجر کے بعد باسط احمد جو کہ میری ہی طرح سے ریٹائیرڈ زندگی گزار رہے ہیں کے ہمراہ صبح کی سیر کو آیا کرتا ہوں۔ وہاں سے واپس گھر جاتے ہوئے مسلسل اُس رنجیدہ شخص کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ گھر آ کر ناشتے کے بعد میں جب اپنے کمرے میں آیا تو حسبِ معمول میز پر اپنا مخصوص رجسٹر کھول کر بیٹھ گیا جس میں اِن دنوں اپنی گذشتہ پینتیس سالہ صحافتی زندگی اور اُس کے دوران مختلیف موضوعات پر ایک درجن بھر کتابوں کی تصینف کے تجربات محفوظ کرنے اور مقامی روزنامے میں ہفتہ میں دو بار شائع ہونے والا کالم لکھنے کی غرض سے روزانہ کوئی تین چار گھنٹے کام کرتا ہوں۔ لیکن اُس روز میرا جی لکھنے کو قعطاً نہ چاہ رہا تھا۔ زہن مسلسل اُس شخص ہی کی جانب متوجہ رہا۔

چند روز اِسی طرح سے گزر گئے۔ میں یونہی اُس رنجیدہ شخص کو مسجد میں سجدے میں پڑے چپکے چپکے گھٹی گھٹی آواز میں روتے اور اُس کی لال متورم آنکھیں دیکھتا رہا۔

اُس روز کسی وجہ سے باسط صاحب نمازِ فجر سے غیر حاضر تھے۔ میں اکیلا ہی پارک میں چہل قدمی کرتا پھر رہا تھا کہ میری نظر اُس پر پڑی۔ وہ اُسی طرح پارک کے ایک ویران گوشے میں نصب بینچ پر گم سم سا بیٹھا خلاؤں میں گھور رہا تھا۔

اُس کے چہرے پر ایک عجب سی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ میں آگے بڑھا اور پاس پہنچ کر مخاطب ہوا: "آپ کی اجازت ہو تو کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟"۔ لیکن وہ تو یونہی خلاؤں میں گھورے ہی چلا جا رہا تھا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اُس نے میری بات سنی ہی نہ ہو۔ میں اِس بار باآوازِ بلند مخاطب ہوا: "سنیئے گا صاحب، برا نہ مانے تو کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟" اِس بار میں نے اُس کے چہرے پر ایک ہلکی سی تبدیلی محسوس کی۔ جیسے وہ کسی اور ہی دنیا میں گم تھا اور اب میرے باآوازِ بلند مخاطب ہونے کے سبب واپس آ گیا ہو۔ اُس کے سر کی جنبش کے ساتھ ہی میں اُس کے برابر بیٹھ چکا تھا۔ "میرا نام نذیر احمد خان ہے اور میں ایک ریٹائیرڈ صحافی ہوں۔ غالباً آپ نے میرا کالم جو کہ روزنامہ "آواز" میں شائع ہوتا ہے پڑھا ہوگا۔ ویسے آپ کا اسمِ شریف؟" میں نے فوراً ہی یہ سوچ کر اپنا تعارف خود ہی کروا کر اُس کا نام بھی پوچھ لیا کہ شاید اِسی بہانے سے آغازِ کلام ہو سکے۔ اُس کے چہرے پر کسی قسم کے کوئی بھی تاثرات تو نہ ابھرے لیکن وہ دھیرے سے بولا: "مختار۔۔۔۔!"۔ "آپ شاید یہاں نئے آئے ہیں؟۔ ابھی کچھ ہی دنوں سے میں آپ کو مسجد اور پارک میں دیکھ رہا ہوں"۔ جی ہاں میں چند ہفتوں قبل ہی حیدرآباد سے آیا ہوں اور معین احمد کے گھر ٹھہرا ہوا ہوں"۔ وہ بہت ہی دھیمے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بولا۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ یااللہ تیرا شکر، آخر کچھ تو سلسلہ شروع ہوا"۔

۔"جی جی معین احمد، جانتا ہوں، وہی نہ جو مکان نمبر 5 میں رہتے ہیں اور جن کے پاس لال رنگ کی موٹر سائیکل ہے"۔ میں فوراً ہی یہ سوچ کر بولا پڑا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اچانک یہاں سے اٹھکر چل دے۔ "جی ہاں وہی معین احمد" اُس کی آواز بدستور دھیمی اور بوجھل سی تھی۔ "حیدرآباد میں آپ کیا کرتے ہیں؟'۔ میرے اِس سوال پر اس کی بجھی بجھی سی آنکھوں میں ہلکی سی چمک کا ایک سایہ سا لہرایا اور پھر معدوم ہوگیا۔

وہاں صدر بازار میں میرا آئل ڈپو ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ !" اتنا کہہ کر کچھ دیر" کے توقف کے بعد وہ ایک گہری سی سانس لیتا ہوا پھر سے بولا: "ہے کیا بس کبھی ہوا کرتا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ !!!"۔ "اوہ اچھا اچھا، آپ نے فروخت کردیا ہوگا؟"۔ میں نے اپنا سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔ "نہیں فروخت تو نہیں کیا البتہ اب اُسے میرے دو بیٹے چلاتے ہیں"۔ "واہ بہت خوب۔۔۔۔۔۔ !، تب تو آپ بھی میری ہی طرح سے ریٹائیرڈ ہیں"۔ میں نے اپنے لہجے میں مسرت کا عنصر نمایاں کرتے ہوئے کہا لیکن میری اِس بات کے جواب میں وہ کچھ بولا تو نہیں لیکن ایک پھیکی سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر ضرور نظر آئی۔

اب میں نے اپنا جی کڑا کرکے وہ سوال پوچھنے کا فیصلہ کر ہی لیا جس کے سبب میں پچھلے کئی ہفتوں سے تجسّس میں مبتلا تھا۔ "اگر آپ برا نہ مانیں تو کیا میں آپ سے ایک "سوال پوچھ سکتا ہوں؟" میرے لہجے میں ہچکچاہٹ تھی۔ "جی ضرور

مختار صرف اتنا ہی بولا۔ "دیکھیں میں پہلے ہی آپ سے معذرت کر رہا ہوں کہ اگر آپ کو میری بات ناگوار گزرے یا میرے سوال کا جواب نہ دینا چاہیں تو آپ انکار بھی کر سکتے ہیں"۔ میں نے ایک طویل تمہید باندھتے ہوئے کہنا شروع کیا: "میں نے اکثر دیکھا ہے کہ آپ مسجد میں سجدے میں پڑے دبی دبی آواز میں رو رہے ہوتے ہیں۔ ایسا کون سا دکھ ہے آپ کو کہ جس کے سبب آپ اِس قدر افسردہ رہتے ہیں؟"۔

میرے سوال کے اختتام کے ساتھ ہی ایک گہرا سناٹا سا چھا گیا۔ مجھے اُس کی سانسوں اور پارک میں بولتے پرندوں کے علاوہ کوئی اور آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر دور خلاؤں میں گھورنے لگا۔ کچھ دیر بعد میری جانب اپنا چہرہ کرکے دھیمی آواز میں گویا ہوا:۔۔ "یہ ایک بہت پرانی کہانی ہے۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا اور اپنے والد کا اکلوتا بیٹا جو کہ دو بیٹیوں کے بعد بہت منّتوں سے پیدا ہوا تھا۔ میرے والد کی خواہش تھی کہ اُس کے کم از کم دو بیٹے تو ضرور ہوں لیکن اُس کی قسمت میں صرف ایک ہی بیٹا تھا۔ میرے بعد بھی دو اور بچے پیدا ہوئے لیکن وہ دو بھی بیٹیاں ہی تھیں، جس کا میرے والد کو بہت قلق تھا اور اٹھتے بیٹھتے یہ ہی کہا کرتے تھے: ہائے نہ ہوئے میرے دو بیٹے۔۔۔۔۔!۔ اگر جو ہوتے تو جوان ہو کر میرے دو بازو بنتے۔۔۔۔۔!!!۔ چار بہنوں کا ایک اکلوتا بھائی ہونے کے سبب

میں سب اور بطورِ خاص اپنے والد کا بہت ہی لاڈلا تھا۔ اُن کی باتیں سن سن کر میرے دماغ میں بھی یہ بات سا گئی کہ میرے بھی اگر دو بیٹے ہوں تو وہ آگے چل کر میرے بازو بنیں گے۔ جب میری شادی ہوئی تو میں نے سہون شریف جا کے منت مانی کہ اگر جو میرے یہاں نرینہ اولاد ہو تو میں پوری چالیس دیگیں بریانی کی درگار شریف پر چڑھاوں گا۔ لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ میرے گھر بیٹی ہوئی۔ میرا دل بجھ سا گیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں تو اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ میری نسل مجھ پر ہی ختم ہو جائے۔ لیکن پھر میرے اندیشے غلط ثابت ہوئے اور اللہ تعالی نے مجھے ایک چھوڑ دو بیٹوں سے نوازا۔ دو بیٹے پا کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اللہ نے مجھے دو اور بازو دے دیئے ہوں اور میں اور اٹھتے بیٹھتے ہر کسی سے یہ ہی کہتا: "میرے بیٹے میرے بازو"۔

۔"میں نے اپنی جوانی میں ایک چھوٹی سی دکان میں مختلیف اقسام کے بیجوں سے تیل نکلنے کے کام کا آغاز کیا اور اِس قدر محنت کی کہ وہ چھوٹی سی دکان ایک بڑے آئل ڈپو میں تبدیل ہو گئی. جب میرے دونوں بیٹے کچھ بڑے ہوئے تو چونکہ اُن کا دل پڑھائی میں بالکل بھی نہ لگتا تھا، اس خوف سے کہ کہیں بُری سنگت میں نہ پڑھ جائیں اپنے ساتھ دکان میں بٹھانا شروع کر دیا۔ اپنی بیٹی زلیخاء کو میں نے میٹرک کے بعد ہی پڑھائی سے اٹھا لیا۔ میرا ارادہ تو آٹھویں کے

بعد ہی اُسے اسکول سے اٹھا لینے کا تھا لیکن وہ تو اُسے پڑھنے کا بہت شوق تھا اور دوسرا اُس کی ماں میرے سر ہو گئی اور مجھے اُن دوں وں کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ مجبوراً میں نے اُسے میٹرک کرنے کی اجازت دے دی۔ اُس کی تو پرائیویٹ ایف اے کرنے کی فرمائش بھی تھی لیکن میٹرک کے نتیجے سے قبل ہی میں نے اس کے ہاتھ پیلے کردیئے"۔

اتنا کہہ کر وہ سانس لینے کے لیئے رکا۔ کچھ دیر خلاوں میں گھورتا رہا اور پھر سے گویا ہوا: وقت گزرتا رہا۔ کچھ عرصے بعد میں نے اپنے دونوں بیٹوں کی شادیاں بھی کر دی۔" اللہ کا کرم جاری و ساری تھا۔ کاروبار بھی خُوب چل رہا تھا۔ ایک روز میں نے ایک فیصلہ کیا اور سب سے پہلے اپنی بیوی ہاجرہ کو اُس سے آگاہ کیا۔ میں نے کہا: "اب میری عمر 65 سال ہو چلی ہے اور میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ انشاء اللہ اگلے برس میں اور تم حج کرنے چلیں گے"۔ یہ سن کر وہ بھاگوان بہت خوش ہوئی۔ وقت کے تو جیسے پر لگے ہوں اور وہ وقت بھی آن پہنچا کہ میں اور ہاجرا حج کو جانے کی ساری تیاریاں مکمل کر چکے تھے اور بس اگلے ماہ ہمیں کراچی کے حاجی کیمپ میں کچھ روز حج کے اراکین کی ضروری تربیت حاصل کرکے مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ روانہ ہونا تھا۔ نکلنے سے کچھ پندرہ روز پہلے میں نے ہاجرا پر ایک ایسا انکشاف کیا جس نے اُسے بےچین کر دیا۔ میں نے اُس سے کہا: "دیکھ ری ہاجرہ، اب میں ہو گیا ہوں بڈھا اور میری ہڈیاں

جواب دے گئیں ہیں لہٰذا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اب اپنا کاروبار افتخار اور بختیار کے حوالے کر دوں اور پھر انشاء اللہ حج کی یہ عظیم سعادت حاصل کرکے جب ہم واپس آئیں گے تو صرف آرام کروں گا اور بس اللہ کے گھر ہی کا ہو رہوں گا" میری بات سن کر جیسے ہاجرہ کو چنداں مسرت نہ ہوئی ہو، جٹ سے بولی: "زلیخاء کے ابا، میری مانو تو ابھی جائیداد بیٹوں کے حوالے کرنے کا سوچو بھی مت"۔ "اوہ بھاگوان، تجھے کتنی باری سمجھایا ہے کہ مجھے زلیخاء کا ابا کہہ کر نہ بلایا کر، مگر تیری عقل میں یہ بات سماتی ہی نہیں"۔ میں نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "میں دو جوان جہان بیٹوں کا باپ ہوں۔ تو مجھے ان میں سے کسی بھی کا ابا کہہ کر پکار لیا کر، جب کبھی تو مجھے افتخار یا بختیار کا ابا کہہ کر پکارتی ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے میری جوانی واپس آ گئی ہو۔ آخر کو افتخار اور بختیار میری جوانی کی تصویر اور نشانی ہی تو ہیں"۔ میں اپنی مونچھوں کا تاؤ دیتے ہوئے بولا: "اور ہاں یہ کیا تو اول فول بک رہی ہے۔ بھلا اگر میں جائیداد، کاروبار اور مال و متاں اپنے شیر جیسے گھبرو جوان بیٹوں کے حوالے نہ کروں تو کیا خیرات میں بانٹ دوں"۔ "ارے بھئی میں کب کہہ رہی ہوں کہ تم یہ سب کچھ خیرات میں دے دو۔ میرا کہنے کا مقصد تو صرف اتنا ہے کہ جب تک تم زندہ ہو، یہ سب کچھ اپنے ہاتھوں میں ہی رکھو"۔ ہاجرا نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا: "سن ہاجرا یہ فیصلہ تو اُسی دن ہو گیا تھا جب میں نے حج پر جانے کا پروگرام بنایا تھا اور مجھے خوب

معلوم تھا کہ سب سے پہلے تم ہی اس پر اعتراض کرو گی۔ میں خوب جانتا ہوں تم عورتوں کا مزاج اور ویسے بھی بڑے بڑھوں نے درست ہی کہا ہے کہ عورتوں سے صلا مشورہ کرنے کی بجائے صرف فیصلہ ہی سنانا چاہیئے۔ بس اِسی لیئے میں نے بھی فضول بک بک جھک جھک سے بچنے کے لیئے تم سے اُس وقت کوئی زکر تک نہیں کیا اور سارے کاغذات تک مکمل کروا کر اپنے اور گواہان کے دستخط تک کروا رکھے ہیں"۔ میں نے بڑے ہی فخر و انسباط کے ساتھ ہاجرہ کو بتایا: "اب انشاءاللہ حج پر روانہ ہونے سے ایک روز قبل یہ تحفہ اپنے دونوں راج دلاروں کو جب دوں گا تو ان کی خُوشی دیدنی ہو گی"۔

۔"لیکن اپنی زلیخاء کا حصہ۔۔۔۔۔۔۔۔؟"۔ جیسے ہی ہاجرہ کے منہ سے یہ الفاظ نکلے میرے تو جیسے تن بدن میں آگ ہی لگ گئی۔ پارہ اسقدر چڑھا کہ مارے غصے کے سارا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا اور کانوں کی لویں تک چلنے لگیں۔ میں طیش میں آ گیا اور زور سے چلا کر بولا: "کیا بک رہی ہو۔۔۔۔۔!، کیسا حصہ اور کہاں کا حصہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔!، بھلا لڑکیوں کا بھی جائیدادوں میں کوئی حصہ ہوا کرتا ہے۔ اُن کے لیئے بس اتنا ہی کافی ہے کہ انہیں پال پوس کر بڑا کر دیا جائے، تھوری بہت تعلیم دلوائی۔ ایک اچھا سا بر ڈھونڈ اُن کی شادی کروا دی اور اللہ اللہ خیر صلا"۔ میرے کڑے تیور دیکھ کر بھی ہاجرہ زرا نہ گھبرائی اور بولی: "دیکھو زلیخاء کے ابا یہ ظلم میں نہ ہونے دوں گی۔ ویسے

بھی مذہبی، شرعی، قانونی اور اخلاقی طور پر باپ کی جائیداد میں بیٹی کا حصہ تو ضرور بنتا ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ تم مردوں نے معاشرے میں یہ ریت بنالی ہے کہ بیٹی کو کسی نہ کسی حیلے بہانے سے اِس حق سے محروم ہی رکھا جائے"۔

۔"کیا باتیں کرتی ہو تم۔ میں نے اُسے پالنے پوسنے، اُس کی تعلیم، دوا دارو، کپڑے لتے، شادی بیاہ اور دان دہیج میں کیا کچھ کم خرچہ کیا تھا جو اب تم آ گئی ہو اُسے میری جائیداد میں سے حصہ دلوانے"۔ میں نے اُس کی باتوں سے مذید غصہ کھاتے ہوئے کہا:

ارے کچھ تو خدا کا خوف کرو، جیسے افتخار اور بختیار تمھارے بیٹے ہیں ویسے ہی وہ بھی" تمھارا ہی خون ہے میں اُسے اپنے ساتھ جہیز میں نہ لائی تھی اور جو خرچے تم نے ابھی گنوائے ہیں کیا وہ تم نے اپنے بیٹوں پر نہیں کیئے؟ ہاجرا کی آواز میں شکایت تھی۔ "ارے میں تو خدا لگتی کہوں گی چاہیے تمھیں برا ہی کیوں نہ لگے۔ اپنے بیٹوں کو تو تم نے خوب خوب راج کروائے اور اُن پر دونوں ہاتھوں سے اپنا روپیہ لٹایا ہے۔ راج دلارے جو ٹھہرے تمھارے۔ قسم کھاکے کہو کہ میری معصوم زلیخاء نے جو تم سے کبھی کوئی فرمائش بھی کی ہو۔ جو ملا کھالیا، جو دیا پہن لیا اور جہاں جگہ ملی چادر بچھائی اور سو گئی۔ دن رات اس نے چولہا چوکی، ہانڈی روٹی اور صفائی ستھرائی میں میرا ہاتھ یوں بٹایا کہ اب مجھے اُس کی خدمت اور چاکری کی قدر ہوتی ہے۔ دونوں بھائی اُس سے عمر میں چھوٹے تھے لیکن وہ بیچاری ان کو بھیاء بھیاء

کہہ کر اپنا پیار دلار لٹاتی۔ کبھی ایک کی صدا پر یہاں بھاگتی تو کبھی دوجے کی لکار پر وہاں دوڑتی۔ پانی پلارہی ہے، کھانا لارہی ہے، جوتے پالش کررہی ہے، کپڑے استری کررہی ہے، جیسے وہ ان کی بڑی بہن نہ ہو کوئی نوکرانی ہو۔ اللہ اُسے عمر بھر خوش خرم اور پھلتا پھولتا رکھے، ماں صدقے، ماں واری، اُس غریب کے منہ میں تو جیسے زبان ہی نہ تھی کہ وہ کبھی اُسے کھولے اور اپنے بھائیوں کی طرح ہر روز نت نئی فرمائشیں کرے اور جو وہ کر بھی لیتی تو باپ کو اپنے لاڈلے بیٹوں سے فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ اُس بے زبان کی بھی کچھ سن ہی لیتا۔ بے چاری نہ جانے کیا کیا ارمان لیئے بابل کے گھر سے بس سر جھکائے پیاء کے گھر سدھار گئی"۔

۔"ہاجرہ کی یہ کھری کھری باتیں سن کر میں تو بس لاجواب ہی سا ہوا جارہا تھا اور کچھ نہ سوجی تو بس دبی آواز میں اتنا ہی کہہ سکا: "اب یہ سارے کام تو سب بہن بیٹیاں کیا ہی کرتی ہیں" میری یہ بات سن کر ہاجرہ نے کہا: "نہیں مختار صاحب، اب ایسا بھی نہیں ہوتا کہیں۔ میں تو کہتی ہوں کہ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ دیکھو زلیخاء کا میاں ایک بہت ہی اچھا، شریف و بھلا مانس انسان ہے۔ آج شادی کو کوئی پانچ سال کا عرصہ بیت گیا ہے اُس نے کبھی کوئی فرمائش یا تقاضہ تک نہیں کیا ورنہ یہ آج کل کے لونڈے جہاں دیکھتے ہیں کہ بیوی کے والدین کے پاس نقد نا وا ہے تو بس بیوی کو ہر دوسرے تیسرے دن میکے اپنی نت

نئی فرمائشوں کے ساتھ روانہ کر دیتے ہیں۔ میری مانو تو تم اپنی جائیداد میں سے زلیخاء کے شرعی و قانونی حصے کی رقم سے زلیخاء کے نام ایک مکان خرید کر اُسے اُس کا جائز حق ادا کر دو۔ ویسے تو اسکا خاوند ماشاء اللہ سے بہت اچھی ملازمت پر ہے۔ تنخواہ بھی اچھی ہے۔ بس گھر کرائے کا ہے سو اِس بہانے اُن کا یہ دَلِدّر بھی دور ہو جائے گا۔

ہاجرہ کی یہ بات سن کر تو میں بس جیسے اپنے آپے ہی سے باہر ہو گیا اور پھر کچھ جواب نہ ہونے کے سبب آخر کار میں نے بھی وہی حربہ آزمایا جو عموماً مرد آزمایا کرتے ہیں:

"دیکھ ہاجرہ میں نے اب اُس بارے میں تیری ایک نہیں سننی اور اگر جو تو نے اب اپنی زبان کھولی تو یاد رکھ میں نے تیری زرا بھی پروا کیئے بغیر تجھے فوراً طلاق دے دینی ہے" میں نے دو ٹوک لہجے میں ہاجرہ سے کہا اور طلاق کا سن کر وہ میری طرف یوں دیکھ کر بس چپ سی ہو گئی جیسے اُسے میری کہی بات پر یقین نہ آ رہا ہو۔

اگلے روز مجھے اپنے دونوں بیٹوں کی زبانی معلوم ہوا کہ ہاجرہ نے اُن دونوں کو بھی زلیخاء کی دھائیاں دیتے ہوئے اُس کے شرعی و قانونی حق کو پائمال نہ کرنے کی فریاد کی۔ دونوں نے ہی اپنی ماں کی بات سنی ان سنی کر دی۔ جس پر میں نے اُن کی خوب پیٹھ ٹھونکی۔

قصہ المختصر ہم دونوں میاں بیوی حج کے لیئے روانہ ہو گئے۔ اُس فریضے سے فارغ ہو کر جب ہم واپس آئے تو بڑے عرصے تک تو ہم محلے والوں اور رشتہ داروں کی مبارکبادیں ہی وصول کرتے رہے۔ سال دو سال کا عرصہ تو یونہی پلک جھپکتے ہی گزر گیا۔ لیکن اب میں اپنے بیٹوں کے رویوں میں ایک بڑی تبدیلی محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ مجھ سے کٹے کٹے رہنے لگے۔ ہم دوں وں میاں بیوی سارا سارا دن اپنے کمرے میں یونہی گم سم سے پڑے رہتے۔ وہ دونوں اپنی بیوی، بچوں اور کاروبار میں مست ہو کر ہم دونوں کو کچھ یوں بھول بھال سے گئے کہ جیسے ہمارا تو کوئی وجود ہی نا ہو۔ کچھ عرصے بعد ان کے لب و لہجے میں بھی اکتاہٹ، بے اعتنائی اور روکھا پن سا آ گیا اور پھر ان کا سلوک بھی کچھ ایسا ہو گیا کہ جیسے ان کو اُس گھر ہی میں جسے میں نے اپنے خون پسینے کی کمائی سے کھڑا کر کے ان کے نام کیا تھا۔ ہمارا وجود تک کھلتا ہو۔

پھر اچانک پچھلے سال میری بیوی ہاجرہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔ چالیسویں تک تو دنیا دکھاوے کے لیئے اُن سب نے میرا بہت خیال رکھا لیکن چالیسوں کٹ آخری رسم پوری ہونے کے بعد جب آخری مہمان بھی اپنے گھر کو روانہ ہوگیا تو پھر بس میں تھا اور میرا کمرہ۔ بات چیت تو دور کی بات رہی کوئی مجھے چائے پانی اور کھانا کو پوچھنے کا بھی روادار نہ تھا۔ اگر میں خود ہی اٹھ کر گھسیٹتا ہوا

باورچی خانے جا کر کچھ زہر مار کرلوں تو ٹھیک ورنہ اپنے ہاتھوں سے تو مجھے کوئی ایک گلاس پانی بھی پلانے کو تیار نہ تھا۔

چند ہفتوں قبل جب میرے صبر اور برداشت کی انتہا ہو گئی تو میں اپنے دونوں بیٹوں سے یہ سوال کر بیٹھا: "کیا میری عمر بھر کی محبتوں، محنتوں اور عنایتوں کا بس یہ ہی صلا ہے جو تم ناشکرے مجھے دے رہے ہو۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ تمھاری مرحومہ ماں نے مجھے کتنا درست مشورہ دیا تھا کہ میں اپنے جیتے جی جائیداد، کاروبار اور مال و دولت تم جیسے لالچی اور خود غرضوں کے حوالے نہ کروں۔ وہ ماں تھی نہ تمھاری۔ تم دونوں نے اُس کی کوکھ ہی سے تو جنم لیا تھا۔ خوب اچھی طرح تم اور تمھارے لچھنوں سے آگاہ تھی۔ افسوس تو مجھے اپنے آپ پر ہے کہ نہ میں تمھیں پہچان سکا اور نہ ہی میں نے اُس بہشتن ہی کی کوئی بات سنی"۔

میرے منہ سے یہ سب جلی کٹی سن کر ان بے غیرتوں نے مجھے سرد رات کے اندھیرے میں میرے اپنے گھر سے جو اب میری اپنی ہی عاقبت نااندیشی کے سبب میرا نہ رہا تھا سے نکال باہر کیا اور میں نے وہ رات پڑوس کے ایک گھر میں گزاری۔ اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ میں نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا: "مختار صاحب، صبر کریں۔ اللہ ایسی ناخلف اولاد تو کسی دشمن کو بھی نہ دے"۔ میری

بات سن کر اُس کے چہرے پر ایک بڑی ہی غمناک سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ کچھ توقف کے بعد بولا: "نذیر صاحب، یہ تو میرے غرور، ہٹ دھرمی، اللہ کی حکم عدولی اور اپنی کرموں والی بیوی کی بات نہ ماننے کی وہ سزا ہے جو مجھے جیتے جی ہی اس دنیا میں مل گئی ہے۔ میں بڑے ہی غرور سے کہا کرتا تھا کہ "میرے بیٹے میرے بازو"، تو ان ہی بازوں نے مجھے خود سے کاٹ کر دور پھینک دیا"۔ اس کی آواز میں زمانے بھر کا درد، حسرت اور افسوس نمایاں تھا۔

۔"کاش میں نے اپنے تینوں بچوں کو اپنی آنکھوں کی طرح سمجھا ہوتا تو شاید میرے ساتھ ایسا نہ ہوتا۔ کیونکہ ہر کسی کے لیئے اُس کی آنکھیں ایک جیسی ہی حیثیت رکھتی ہے کوئی بھی اُنہیں ایک دوسرے پر فوقیت نہیں دے سکتا کیونکہ جتنی پیاری ایک آنکھ ہوتی ہے اتنی ہی پیاری دوسری بھی ہوتی ہے۔ اکثر یہ آنکھیں دکھ بھی آیا کرتی ہیں اور اُن کے دکھنے سے یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ جو آنکھیں ایک وقت میں نعمت ہو سکتیں ہیں وہ زحمت کا سبب بھی بن سکیتں ہیں۔ لیکن میں نے اپنے بچوں میں امتیاز کیا۔ اپنی بیٹی کا شرعی و قانونی حق غصب کرکے اپنے بیٹوں کے حوالے کردیا"۔

ایک لمحہ توقف کے بعد وہ میری طرف دیکھتا ہوا بولا: "نذیر صاحب، میں نے آپ کو اپنی کہانی اس لیئے سنائی ہے کہ آپ ایک کالم نویس ہیں، میری آپ سے

التجاء ہے کہ آپ میری کہانی کو اپنے کالم کے زریعہ سے اور لوگوں تک بھی پہنچائیں تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں اور میرے جیسے ناانصاف بن کر خود اپنے حق میں ناانصافی نہ کریں"۔

ابھی میں اُس کی کہی ہوئی باتوں کی فُسُوں کاری میں ہی گم تھا کہ اچانک ایک پانچ چھے سال کا بچہ دوڑتا ہوا آ کر اُس سے بولا: "نانا ابو، نانا ابو۔۔۔۔۔۔۔۔۔ !، وہ نا، وہ امی آپ تو بلا لی ایں، کے لئی ایں کہ داو نانا ابو کو بولو کہ ناتتہ تیال اے، ولدی سے آ تل ناتتہ ترلیں" [امی آپ کو بلا رہی ہیں، کہہ رہی ہیں کہ جاو نانا ابو کو بولو کہ ناشتہ تیار ہے، جلدی سے آ کر ناشتہ کرلیں]۔

بچے کو دیکھ کر اُس کے چہرے پر ایک بڑی ہی وارفتگانہ سی مسکراہٹ آ گئی۔ بینچ سے اٹھ کر اُس نے بچے کو اپنی گود میں اٹھا لیا اور میری طرف دیکھتے ہوا بولا: "یہ میرا نواسہ خرم ہے، میری زلیخاء کا بیٹا اور معین میرا داماد ہے۔ اچھا اب اجازت دیں پھر ملاقات ہو گئی"۔ اتنا کہہ کر وہ پلٹ کر چل پڑا۔

میری سوچوں کے سارے سوتے خشک ہو چکے تھے اور صرف اُس کے کہے یہ جملے زہن میں بازگشت کرتے پھر رہے تھے: "بھلا لڑکیوں کا بھی جائیدادوں میں کوئی حصہ

ہوا کرتا ہے۔ اُن کے لیئے بس اتنا ہی کافی ہے کہ انہیں پال پوس کر بڑا کر دیا جائے،
تھوڑی بہت تعلیم دلوائی۔ ایک اچھا سا بر ڈھونڈ اُن کی شادی کروا دی اور اللہ خیر
صلا"۔

سیلف میڈ

نا جانے وہ رات کا کونسا پہر تھا، نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ اپنے بیڈ روم کے پلنگ پر سیدھا لیٹا اندھیری خلاوں میں گھورے جا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اپنا پسندیدہ گیت بھی مسلسل گنگناتا جارہا تھا لیکن اسکی آواز اتنی بھی بلند نا تھی جو اسکے پہلو میں گہری نیند سوتی بیوی کی نیند میں کسی خلل کا موجب بنتی۔

وہ گیت اُسے کچھ ایسا ہی پسند تھا، اُسکے سارے بول اسے ازبر تھے اور اکثر اُسکے ہونٹوں پر مچلنے لگتا۔ اُس وقت بھی ایسا ہی تو ہوا تھا۔ پہلے تو وہ کافی دیر تک اپنے بیدار ذہن کو مختلیف حیلے بہانوں سے تھپک تھپک کر سلانے کی کوشش کرتا رہا لیکن پھر ناکام ہو کر اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا اور حسبِ معمول اُسکے ہونٹ پھر وہی گیت گنگنانے لگے۔

تجھ سے ناراض نہیں زندگی حیران ہُوں میں

تیرے معصوم سوالوں سے پریشان ہُوں میں

یوں تو اِس گیت کا ایک ایک بول اُسکے دل پر اثر کرتا تھا لیکن جب جب بھی وہ

یہ بول سنتا:۔

جینے کے لیئے سوچا ہی نہیں درد سبنھالنے ہونگے
مسکرائیں تو مسکرانے کے قرض اتارنے ہونگے
مسکراوں کبھی تو لگتا ہے جیسے ہونٹوں پہ قرض رکھا ہے

تب تب نا چاہتے ہوئے بھی اسکی آنکھیں بھر آتیں۔

ویسے وہ کسی طور بھی زندگی سے ناراض نا تھا اور بھلا ہو بھی کیسے سکتا تھا؟

اُسنے زندگی سے وہ سب کچھ ہی تو پایا تھا جسکی اُسنے خواہش کی تھی۔ ایک اچھا عہدہ، معاشرے میں عزت و احترام، ایک خوبصورت سی پیار کرنے والی بیوی، دو پیارے پیارے بچے، اپنا گھر اور گاڑی۔

تو پھر وہ کیا شئے تھی جسکی کمی وہ ہر وقت محسوس کرتا؟

زندگی مکمل ہوتے ہوئے بھی اسقدر نامکمل کیوں تھی؟

وہ کونسا قرض تھا جسکے بوجھ تلے اسکے ہونٹ مسکرائے ہوئے بھی مسکرانا بھول گئے تھے
اور دل کا عالم بقول شاعر کچھ یوں تھا:۔

دل ہے تو ڈھرکنے کا بہانہ کوئی ڈھونڈے
پتھر کی طرح بے حس و بے جان سا کیوں ہے

وہ لیٹا لیٹا بس اُسی ادھیڑ بن میں مصروف تھا۔ ایسا نا تھا کے اب شادی کے پندرہ سالوں بعد اسکا جی اپنی بیوی سے بھر گیا ہو۔ اُسے آج بھی اپنی بیوی سے اتنی ہی محبت تھی جتنی شادی سے پہلے اور شادی کے فوراً بعد تھی۔ بلکے کبھی کبھی تو اسے ایسا محسوس ہوتا کے جیسے اسکی محبت تو شاید اب پہلے سے بھی زیادہ شدید تر ہوتی جاری ہے۔
دوست احباب اور رشتے داروں اِنہیں ایک مثالی جوڑے کی حیثیت سے جانے جاتے تھے اور انکی محبت کی مثالیں پیش کی جاتیں تھیں۔
لیکن پھر بھی کوئی شئے تو ایسی ضرور تھی جو وہ اب اپنے اور اپنی بیوی

کے درمیان گمشدہ سی محسوس کرتا۔ وہ شدت سے اُن دنوں کو یاد کرتا جب وہ اور اُسکی بیوی ندا ابھی رشتۂ ازدواج میں تو نہیں البتہ جس رشتے کی ڈوری میں بندھے تھے، تھا تو وہ کسی کمزور سی ڈور ہی کی مانند ہی لیکن اُس کمزور سی ڈور نے ایک مضبوط رشتے کی مانند دونوں کو تھام رکھا تھا دونوں ہی کا حال یہ تھا کہ بقول شخصے:۔

کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بندھے

اُسے اپنی شادی سے پہلے کے اُن دو برسوں کا ایک ایک لمحہ یاد آیا جسمیں شہر کا وہ کونسا کونا، وہ کونسی جگہ تھی جہاں وہ اور ندا نا گئے ہو اور وہ کیسی بیقراری تھی جو دونوں کو روز ملنے پر نہ صرف مجبور کر دیا کرتی بلکے ان ملاقاتوں کا سرور اب بھی اُسے ایسے ہی یاد تھا جیسے کل ہی کی تو بات ہو۔

دونوں کا خاندانی پسِ منظر کم و بیش یکساں ہونے کے سبب دوں وں کی شادی بناء کسی روکاٹ کے ہو گئی اور شادی کے اخراجات سے بچ رہنے والی رقم سے وہ دونوں ہنی مون پر بھی گئے۔ لاہور، اسلام آباد، مری، نتھیا گلی، ایبٹ آباد، وادی سوات وغیرہ کی خوب خوب سیریں کیں۔

شادی کے پہلے ڈیڑھ دو سال کا وہ خوشگوار زمانہ تو جسے عرفِ عام میں "ہنی مون پیریڈ" کہا جاتا ہے، ندا کو اپنا پسندیدہ ترین رومانوی گیت گا کر سناتے نا جانے کب اور کیسے بیت گیا:۔

سونا نا چاندی نا کوئی محل جانِ من
تجھ کو میں دے سکوں گا
پھر بھی یہ وعدہ ہے تجھ سے
تو جو کرے پیار مجھ سے
چھوٹا سا گھر تجھ کو دونگا
دکھ سکھ کا ساتھی بنوں گا

سچ تو یہ تھا کہ وہ ندا کے دکھ سکھ کا ساتھی تو ضرور بن گیا تھا اور پھر ماشاء اللہ سے ندا کی گود میں چند ماہ کے ننھے اسد نے قلقاریاں مارنا بھی شروع کردیں تھیں لیکن وہ اُسے حسبِ وعدہ ایک چھوٹا سا گھر اب تک نا دے سکا تھا اور باپ بن جانے کے بعد تو اِس احساس نے اور شدت اختیار کرلی تھی کے ابتک کرائے کا گھر ہی انکا مقدر ہے۔
وہ ٹھہرا ایک ملازمت پیشہ فرد اور اُسے اتنی تنخواہ تو ضرور مل جایا کرتی تھی

کے جس سے اُسکے گھر کا ماھانہ خرچ تو بخُوبی چل جایا کرتا تھا اور بچ رہنے والی رقم کو اگر دو تین عشروں تک بھی جمع کیا جاتا رہتا تو بھی اسمیں چھوٹا سا تو کیا کوئی ایک کمرے کا مکان بھی خریدنا ممکن نا ہو پاتا۔

تعلیم سے فراغت کے فوری بعد ہی اُسے اپنی ایم بی اے کی ڈگری جسمیں اسنے اعلیٰ تعلیمی کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا کے سبب ایک اچھی فرم میں بطور جونیئر اسسٹنٹ مینیجر ملازمت تو فوراہی مل گئی تھی، تنخواہ بھی بس مناسب ہی تھی اور اسنے فوری ملازمت مل جانے پر اللہ کا لاکھ شکر ادا کیا تھا کیونکہ وہ دیکھ چکا تھا کے نئے فارغ التحصیل ایم بی اے کس طرح سے ملازمت کے حصول کی خاطر دفاتر میں اپنی جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں اور ویسے بھی اُسے اپنی قابیلیت، محنت، ایمانداری اور اِس سب سے بڑھکر اپنے والدین کی دعاوں اور اللہ کی رحمت پر پورا پورا بھروسہ تھا۔ اُسنے ہمیشہ اپنے فرائضِ منصبی کو نہ صرف بھرپور انداز میں سرانجام دیا بلکے اپنے دورِ طالب علمی کے تمام تر مشاغل جسمیں کتب بینی، لکھنا لکھانا اور گٹار بجانا سرفہرست تھے انکو بھی تیاگ دیا۔
کتب بینی کی تو اُسے وہ لت تھی کے شاید ہی شہر کی کوئی لائبریری ہو جہاں جا

کر اس نے استعفادہ نا کیا ہو کیونکہ اُسکے والدین نے اپنے محدود معاشی وسائل کے باوجود بھی اُسکی تعلیم میں کسی قسم کی کمی بیشی نا آنے دی تھی اور پھر اُسکی اعلیٰ تعلیمی کارکردگی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شہر کے سب سے نامور تعلیمی ادارے میں نا صرف باآسانی داخلہ بھی مل گیا اور کسی قدر اسکالرشپ بھی میسر آ گئی تھی۔ لیکن وہ اس عیاشی" کا متحمل تو ہرگز نہیں ہو سکتا تھا کے خود کتابیں خرید سکتا لہٰذا شہر بھر کی" لائبریروں سے کتابیں حاصل کرکے اپنی آتشِ شوق سرد کیا کرتا۔ اپنی تعلیمی سرگرمیوں اور کتب بینی سے جو بھی تھوڑا بہت فارغ وقت دستیاب ہوتا وہ اپنے لکھنے لکھانے کے شوق میں صرف کرتا اور اکثر و بیشتر اسکی تخلیقات ملک کے معروف ادبی رسالوں کی زینت بنا کرتیں تھیں۔

گٹار بجانے کا بھی اُسے بہت شوق تھا۔ اچھا خاصہ بجا بھی لیا کرتا تھا اور کچھ ٹھیک ٹھاک گا بھی لیتا تھا۔ اکثر جب وہ یونیورسٹی میں اپنے دوستوں کی فرمائش پر انہیں خود ہی گیٹار بجا کر ساتھ انکا کوئی فرمائشی گیت سناتا تو یار دوست اُسے خوب خوب داد و تحسین سے نوازا کرتے تھے۔

ندا سے شادی کے وقت اُسے ملازمت کرتے دو سال کا عرصہ بیت چکا تھا اور خود ندا سے اُسکی ملاقات اُسی دفتر میں ہی تو ہوئی تھی۔ شاید خُدا نے دونوں کو

ایک دوجے ہی کے لیئے تو بنایا تھا۔ دونوں میں فوراً دوستی ہو گئی اور وہ دوستی دیکھتے ہی دیکھتے پیار میں بدل گئی، پھرانھوں نے شادی کا فیصلہ کرلیا اور دونوں خاندانوں کی مکمل باہمی رضامندی کے ساتھ وہ ہنسی خوشی رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔

ندا کے پاوں بھاری ہونے تک تو ندا نے اپنی ملازمت جاری رکھی لیکن پھر اُس ہی کے اصرار پر ملازمت سے استعفٰی دے دیا اور گھر بیٹھ گئی۔

اُسکی سوچوں کے دھارے اُسے بہائے چلے جارہے تھے۔ پھر اُسے وہ دن بھی یاد آیا۔۔۔

۔۔۔!۔

اسد دو برس کا ہوچلا تھا، اُس روز وہ ابھی دفتر میں آکر بیٹھا ہی تھا کے چپراسی نے اُسکی میز پر آکر کہا:۔

۔"احد صاحب، آپکو قریشی صاحب یاد کررہے ہیں"۔

۔"قریشی صاحب نے اُسے اِس وقت کیوں طلب کیا ہے؟"۔

قریشی صاحب اُسکے شعبہ جاتی منیجر تھے اور عموماً وہ خود لنچ بریک سے قبل ہی ساری رپورٹس وغیرہ لیکر انکی خدمت میں حاضر ہو جایا کرتا تھا۔

۔"جی احد صاحب، تشریف رکھیں"۔

قریشی صاحب نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:۔

۔"مجھے آپکی شکایت موصول ہوئی ہے تو میں نے سوچا کے آپکو خود ہی بلا کر بات کرلوں"۔

۔"میری شکایت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟"۔

احد اُن کی بات سنکر بھونچکا سا ہو کر بولا۔

قریشی صاحب نے فوراً اپنے دائیں جانب رکھا ایک فولڈر کھولا اور اُسے میں سے چند واوچرز نکال کر احد کے سامنے رکھ دیئے۔

۔"گذشتہ ماہ سے تفویض شدہ نئی ڈیوٹی جسکے تحت آپکو ہر پیر کے روز فیکٹری جا

کر پرچیز سیکشن کی فزیکل انوینٹری رپورٹ تیار کرنا ہوتی ہے اور آپ نے مقرر کردہ کنوئنس الاوئنس میں سے پہلے ہفتے 285 روپے اور اس کے بعد صرف 22 روپے فی ہفتہ کے حساب سے دو واوچرز جمع کروائے ہیں، حالانکہ فی ہفتہ کی مقررہ رقم 300 روپے ہے"۔

۔"لیکن جناب اسمیں شکایت والی بھلا کونسی بات ہے؟"۔

احد نے حیرت کے سمندر میں غوطے لگاتے لہجے میں دریافت کیا۔

۔"تمام افسران جو اپنے اپنے شعبوں کی انسپکشن روپوٹس کی تیاری کے لیئے فیکٹری جاتے ہیں انہوں نے یکجا ہو کر مجھ سے آپکی شکایت کی ہے"۔

۔"قریشی صاحب، بخدا میں سمجھنے سے عاری ہوں کے بھلا اسمیں ایسی کونسی غلط بات ہے جس سے انہیں مجھ سے شکایت ہو گئی ہے؟"۔

احد کے چہرے پر دنیا بھر کی حیرت موجزن تھی

۔"دیکھیں قریشی صاحب! پہلے ہفتے میں نے اس وجہ سے 285 روپے کا واوچر داخل

کیا کے میں پہلی بار فیکٹری جارہا تھا اور راستے سے ناواقف ہونے کے سبب میں نے آنے جانے کے لیئے رکشہ استعمال کیا تھا لیکن پھر دفتر ہی کے کسی ساتھی سے یہ معلوم ہونے پر کے ہمارے دفتر کی عمارت کے عین سامنے والے بس اسٹاپ سے ویگن چلتی ہے جو سیدھا فیکٹری کے دروازے پر اتارتی ہے اور اس وقت چونکے رش آورز بھی نہیں ہوتے، ویگن کم و بیش خالی ہی ہوتی ہے، میں دونوں اطراف میں اپنا سفر باآسانی طے کرلیتا ہوں اور اسکا یکطرفہ کرایہ 11 روپے بنتا ہے لہٰذا میں نے اسے کے بعد کل 22 روپوں ہی کے واوچز اپنے سفر خرچ کی وصولی کے لیئے داخل کیئے"۔

احد نے وصاحت کرنا چاہی۔

۔"احد صاحب آپ شوق سے ویگن میں جائیں، لیکن یہ آپ سے کس نے کہا ہے کے آپ 300 روپوں کی جگہ 22 روپے کے واوچر داخل کریں، اسطرح سے تو کل اُن تمام افسران پر اعتراض ہوسکتا ہے جو جاتے تو آپ ہی کی طرح سے ویگنوں ہی میں ہیں لیکن کنوینس الاوئنس پورے 300 روپے وصول کرتے ہیں"۔

۔"لیکن قریشی صاحب جب میں نے اپنی جیب سے 22 روپے ہی خرچ کیئے ہیں تو بھلا میں 300 روپے کا واوچر کیسے داخل کرسکتا ہوں اور ویسے بھی یہ بات میرے اصول

کے خلاف ہے؟"۔

احد نے واضح طور پر یہ محسوس کیا کے اسکا یہ جواب قریشی صاحب کو پسند نہیں آیا تھا لیکن وہ محض اپنا سر ہلا کر ہی رہ گئے اور اسے جانے کا ارشارہ کر دیا۔

اپنی میز تک جاتے ہوئے اسے کل کا دن یاد آیا جب وہ ندا کے ہمراہ بازار اسد کیلیئے کپڑوں کی خریداری کرنے گیا ہوا تھا۔

موسم بدل رہا تھا یہ اسد کا پہلا موسم سرما ہے، اور ندا کا تقاضہ تھا کے ہم اپنے لیئے گرم کپڑے لیں یا نا لیں، کم از کم اسد کیلیئے گرم کپڑوں کی خریداری از حد ضروری تھی۔

جب وہ دکاندار کو ندا کے منتخب کردہ تمام کپڑوں کی قیمت ادا کر رہا تھا تو ایک لمحے کیلیئے اُسے خیال آیا کے اِس طرح کے خرچے تو ہر ماہ نکلتے ہی رہتے ہیں اور دفتر سے ملنے والا سفری خرچ جسے وہ وصول نہیں کرتا، اِس قسم کے اخراجات میں بخوبی کام آ سکتا ہے۔ کچھ دیر اُسکے زہن میں یہ کشمکش چلتی رہی کے اُسے 300 روپے فی ہفتہ کی رقم پوری پوری وصول کرلینی چاہیے۔ لیکن پھر آخرِکار دل دماغ ہر حاوی رہا۔

کچھ ہی عرصے بعد اسکا تبادلہ براہ راست فیکٹری میں ہی کر دیا گیا۔ اب وہ پروکیورینٹ مینیجر کے ماتحت کام کرنے لگا۔ کچھ ہی روز گزرے ہونگے تو اُسے پتہ چلا کے ہر آرڈر پر سپلائیرز کی جانب سے پروکیورمنیٹ ڈیپارٹمنٹ کے تمام تر افسران کو حسبِ عہدہ کمیشن سے نوازا جاتا ہے اور جب اسنے اپنا حصہ قبول کرنے سے انکار کیا تو منیجر اس کے خلاف ہو گیا۔

احد کسی جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا لہٰذا اسنے فوری طور پر دوسری ملازمت کی تلاش شروع کر دی اور وہ جو کہتے ہیں نا کے ڈھونڈنے والے کو تو خدا بھی مل جاتا ہے، اسے نا صرف بہتر تنخواہ کی ملازمت ملی گئی بلکے کمپنی کی جانب سے بالکل نئی موٹر سائیکل بمعہ پٹرول اور مینٹیننس بھی فراہم کر دی گئی۔

اِس نئی ملازمت کا ماحول احد کو اپنی پچھلی ملازمت سے کہیں بہتر محسوس ہوا۔ احد نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرنا شروع کر دیا اور اِس حقیت کے باوجود کے وہ مینیجر کی سطح پر فائز تھا، نچلے اسٹاف کی طرح سے اوور ٹائم نا ملتا تھا، اپنے پروجیکٹس اور اسائنمینٹس کو جلد از جلد مکمل کرنے کے لیئے اُسنے دفتری اوقات کے بعد بھی اپنے سیکشن کے نچلے اسٹاف کے ہمراہ دفتر میں روزانہ اضافی دو تین گھنٹے بیٹھنا شروع کر دیا اور اُسکی شاندار کارکردگی نے اُسے کمپنی کے بورڈ آف ڈائیکٹرز کی آنکھوں کا تارا بنا دیا اور چھے ماہ بعد

ہی اُسکی تنخواہ میں خاظر خواہ اضافہ کر دیا گیا۔
لیکن اِن سب باتوں کے باوجود بھی وہ خود کو اِس قابل نا پاتا تھا کے چھوٹا ہی سہی مگر کوئی ذاتی گھر خرید سکے۔
اب اسد 5 سال کا ہو چکا تھا اور ایک روز ندا نے احد سے دوبارہ ملازمت کرنے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ کچھ روز تو احد گومگوں کی سی کفیت میں رہا مگر ندا کے مسلسل اصرار اور اِس استدلال کے اب وہ زمانہ نہیں رہا جب ایک شخص کماتا اور سارا کنبہ کھاتا، ہمیں اپنے بچے کے بہتر مسقبل کے لیئے سوچنا ہے اور آخر ہم کب تک اسی طرح سے کرائے کے گھر میں ہی پڑے رہینگے؟
بحرحال ندا کو اُسکی ماسٹرز ڈگری اور سابقہ تجربے کے سبب کچھ ہی عرصے میں ایک معروف این جی او میں مناسب سی جاب مل گئی جو کے گھر سے بہت دور بھی نا تھی اور اوقاتِ کار بھی صبح 9 سے شام 5 تک ہی تھے۔ ندا کے برسرِ روزگار ہو جانے سے گھر میں مذید خوشحالی آئی اور ساتھ ہی ساتھ دونوں نے ملکر شہر کے ایک اچھے علاقے میں کوئی مناسب سا گھر خریدنے کی منصوبہ بندی کا آغاز کیا۔
وہ جو کہتے ہیں نا آٹے دال کا بھاو، خیر اُن کے بھاو تاو سے تو وہ دونوں

بخوبی آگاہ تھے لیکن شہر کے کسی اچھے رہائشی علاقے میں ایک چھوٹے سے گھر کی قیمت جان کر تو جیسے دونوں کے ہوش ہی اڑ گئے اور قریب تھا کے احد ہمت ہار ہی جاتا لیکن ندا نے احد کے سامنے اپنے سارے زیورات ڈال دیئے۔ ساری جمع پونجی بمعہ زیورات کے بھی اسقدر نا بنتے تھے لہٰذا احد نے قرضے کے حصول کے لیئے بھاگ دوڑ شروع کر دی اور کئی ماہ کی تگ ودو کے بعد وہ بنک سے اسقدر قرضہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا کے اپنے ذاتی گھر میں منتقل ہو سکے۔

نئے گھر میں منتقل ہوتے ہی احد اور ندا دونوں پائی پائی کا حساب رکھنے لگے کیونکہ جہاں بڑے گھر اور متمول علاقے میں منتقل ہونے سے انکے ماہانہ اخراجات میں مذید اضافہ ہو گیا۔ کرائے کی رقم کی بچت تو ضرور ہوئی لیکن اب لون کی اقساط جو کے کرائے کی رقم سے کہیں ذیادہ تھی نے گھر کے بجٹ کو تلپٹ کرنا شروع کر دیا۔

لیکن وہ جو کہتے ہیں نا کے مشکلات بھی اوپر والا پیدا کرتا ہے اور ان کو حل بھی وہی فراہم کرتا ہے۔ اُنہیں نئے گھر میں منتقل ہوئے کچھ سات آٹھ ماہ ہی ہوئے ہونگے کے احد کے دفتر میں شعبۂ درآمدات و برآمدت کے منیجر حفیظ صاحب جن کی ریٹائرمینٹ میں کوئی سال بھر کا عرصہ رہ گیا تھا کے جانشین کے طور پر بورڈ آف ڈاریکٹرز نے متفقہ طور پر احد ہی کا نام تجویز کیا اور اُسے فوری

طور پر ضروری ٹرننیگ کے لیئے کمپنی کی جانب سے چھے ماہ کے کورس کے لیئے لندن بھجوادیا دیا گیا تاکے کورس کی تکیمل کے بعد وہ چند ماہ حفیظ صاحب کی زیرِ نگرانی متعلقہ شعبے کے سارے اسرار ورموز سے کماحقہ آگاہی حاصل کرلے۔

لندن روانگی سے قبل ہی اسکی تنخواہ میں اضافہ ہوچکا تھا اور واپسی پر اسکے پاس کمپنی کی فراہم کردہ نئی نویلی کار تھی۔

دن مہینوں اور مہینے سالوں میں بدلتے گئے۔ اسد اب دس سال کا ہوچکا تھا اور ندا ایک بار پھر امید سے تھی لیکن پچھلی بار کی طرح سے اسنے اپنی ملازمت سے استعفہ دینے کی بجائے اپنے دفتر سے چھے ماہ کی طویل رخصت لے لی تھی۔

پہلے تو دونوں نے ملکر اس بات پر کچھ دیر غور کیا کے کیوں نا اب ندا طویل رخصت کے اختتام پر اپنا استعفہ بھیج دے لیکن پھر فوراً ہی انہیں یہ احساس بھی ہوا کے اب وہ جس لائف اسٹائل کے عادی ہوچکے ہیں اور موجود اسٹیٹس کو برقرار رکھنے کے لیئے دونوں آمدنی کے سلسلوں کا جاری رہنا اشد ضروری ہے۔

لیکن ندا نے اسکا فوری اور آسان حل بھی ڈھونڈ نکالا اور وہ حل تھا زینب، زینب ایک پچاس باون سالہ تجربہ کار آیا تھی۔ زینب نے آتے ہی ننھے فہد کے

ساتھ ساتھ اسد کی زمہ داری کو بڑی ہی خوش اسلوبی کے ساتھ نبھانا شروع کر دیا تھا۔
احد کی طرح سے اب ندا بھی اپنی این جی او میں سنئیر مینیجمینٹ لیول پر آچکی تھی۔
البتہ اتنا ضرور تھا کے اُسکے اوقاتِ کار احد کی طرح سے بے قابو نا تھے اور نا ہی اُسے ہر دو ایک ماہ بعد اپنی کمپنی کے درآمدی و برآمدی معاملات دیکھنے کی غرض سے بیرونی ممالک کے دورے کرنے پڑتے تھے۔
گذشتہ کئی سالوں میں احد اپنی بے حساب دفتری مصروفیات اور اپنے وقت بے وقت کے غیر ملکی دوروں پر بچوں، اپنی اور ندا کی اور حد تو یہ کے اپنی شادی کی سالگرہیں بھی قربان کر چکا تھا۔
سوچ کا بے لگام گھوڑا یادوں کے تاحدِ نگاہ پھیلے جنگل میں سرپٹ دوڑے چلا جا رہا تھا۔ وہ چاہتا تو تھا کے سو جائے لیکن نیند اسکی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اُسکی نگاہوں میں شادی کے پہلے پانچ چھے برسوں میں آنے والیں شادی کی سالگروں کے مناظر جو اُن دونوں نے شہر کے کسی نا کسی اچھے ریسٹورینٹ میں کینڈل لائٹ ڈنر پر منائیں، یکے بعد دیگرے کسی خوبصورت تصویری البم کی طرح سے گھومنے لگے۔

یادوں کے جھرکوں سے جھانکتے ہوئے اُسنے سوچاکے یہ ضرور تھاکے اُن دِنوں ہمارے پاس اپنا گھراور گاڑی نا تھی، پہلے پہل تو ہم ٹیکسی اور پھر کمپنی سے ملنے والے اسکوٹر پر سوار ہو کر کینڈل لائٹ ڈنر کرنے جایا کرتے تھے۔آج کی سی آسائشات میسر نا تھیں لیکن اِس کے باوجود بھی ہم شاید آج سے زیادہ خوش تھے۔

موم بتیوں کی ذرد سی مدھم مدھم روشنی میں ڈوبا وہ کینڈل لائٹ ڈنر ٹیبل اور ریسٹورینٹ کا نیم تاریک ماحول دنیا سے پرے ایک ایسا حسین و طلسماتی جزیرہ معلوم ہوتا جہاں صرف وہ اور ندا ایک جلتے الاو کی روشنی میں ہاتھ تھامے خاموشی سے ایک دوجے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھے ہوں۔

ریسٹورینٹ سے نکل کراسکوٹر پر سوار ہو کر دیر تک شہر بھر کی سڑکوں پر ہواخوری کرنے نکل کھڑے ہوتے اور اکثر ساحلِ سمندر پر یونہی بے مقصد گھنٹوں چہل قدمی کیا کرتے۔جب ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ہمارے گالوں کو سہلاتے اور بالوں کو اڑاتے تو ایسا محسوس ہوتا کے جیسے ان کی نرمی اور ٹھنڈک گالوں سے ہوتی ہوئی روحوں میں اترتی چلی جارہی ہو۔

اُسکا جی چاہ رہا تھا کے وقت کا پہیہ الٹا چل پڑے۔ وہ ایک بار پھر ندا کے ساتھ کینڈل لائٹ ڈنر کی ٹیبل سے ہوتا ہوا ان طلسماتی جزیروں میں جا نکلے اور وہ دونوں نرم ٹھنڈی ہواوں کے دوش پر کسی جہانِ دیگر کی سیر کو نکل جائیں۔

پھر اسے وہ وقت یاد آیا جب وہ کتابیوں کا رسیا ہوا کرتا تھا۔ کتابیں دیکھ کر کو اسکا دل ایسے ہی للچایا کرتا تھا جیسے کوئی ندیدہ بچہ ٹافیاں دیکھ کر للچاتا ہے لیکن کبھی اتنے جیب بھر پیسے ہوتے ہی نا تھے کے وہ اپنی آتشِ شوق کو سرد کر سکتا۔ آج جب اُسکے پاس جیب بھر پیسہ ہے اور گھر کا ایک پورا کمرہ کتابوں سے اُٹا ٹٹ بھرا پڑا ہے، اسکے پاس کتاب پڑھنے تک کو بھی وقت میسر نہیں۔

اور وہ گٹار۔۔۔۔۔۔۔۔!، بجانا تو دور رہا، کتنے سالوں سے تو اُسنے اپنا گٹار دیکھا تک نا تھا۔ اسے تو یاد ہی نہیں تھا کے وہ کبھی گیٹار بجا کر اسکے ساتھ گانے بھی گایا کرتا تھا۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔!!!۔

افسانہ نویسی کا اسے کتنا شوق تھا۔ زمانہِ طالب علمی ہی میں وہ ملک کے نامور ادبی جرائد میں چھپنے لگا تھا۔ لیکن عملی زندگی میں قدم رکھتے ہی

اُسے یہ شوق بھی تیاگ دینا پڑا۔
اُسکے افسانے خواہ کتنے ہی بلند پایہ ادبی جرائد میں کیوں نا چھپتے رہے ہوں۔ اُسکے گھر کا چولہا گرم نہیں رکھ سکتے تھے اور اُسے کونسا وراثت کے ترکے میں کوئی بنک بیلینس یا جائیدادیں ملیں تھیں کے جن کے سہارے وہ اپنے شوق پورے کرتا پھرتا۔ اُسے جو کرنا تھا اللہ تعالی کی رحمت اور والدین کی دعاوں کے بعد اپنے روزِ بازو ہی پر تو کرنا تھا اور وہ اُسنے کیا بھی۔
بنک بیلنس، جائیداد اور روتہ ترکا نا سہی لیکن اگر ماں باپ نے اسے اپنا جیب اور پیٹ کاٹ کاٹ کر اپنی حق حلال کی کمائی سے اعلیٰ تعلیم نا دلوائی ہوتی تو شاید آج وہ بھی کسی عام آدمی کی طرح سے کہیں کلرکی کرکے اپنے نصیبوں کو دھائیاں دیتا پھر رہا ہوتا۔
اُسے والدین کا ترکہ تو میسر نا آسکا، ہاں البتہ اسے روثے میں انکی طرف سے محنت، ایمانداری، اصول اور رزقِ حلال کے حصول کا سبق ضرور ملا تھا جو کے اُس نے ہمیشہ ہی اپنی گرہ میں باندھ کر رکھا۔
اپنے سلیف میڈ، اصول پسند اور ایماندار ہونے کے سبب اسکا ضمیر مطمین تو

تھا۔ کم و بیش ہر دیناوی آسائش و خوشی اسے میسر تو تھی لیکن وہ خود کو نفس مطمعنہ نا پاتا تھا۔ کہیں کسی نامعلوم جگہ کوئی کمی تھی ضرور جو اسے بےچین کیئے رکھتی تھی۔

. یہ سب کچھ سوچتے سوچتے نا جانے کب اسکی آنکھ لگ گئی

روز کے معمول اور عادت کے عین مطابق اسکی آنکھ ٹھیک سات بجے کھلی۔ اُسنے اپنے پہلو میں بے خبر سوئی ندا کو دیکھا اور بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ خیر دن تو وہ اتوار کا تھا دفتر جانے جیسا کوئی بکھیڑا ابھی نا تھا۔ احد دبے پاوں غسل جانے کی طرف بڑھا اور اسکے اندر داخل ہو کر دھیرے سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا ندا کی آنکھ کھل جائے وہ اپنے اُس منصوبے کو پایہ تکمیل پہچانے میں ناکام رہے جو اسکے زہن میں گذشتہ ایک ہفتے سے پنپ رہا تھا۔

فریش اور نہا دھو کر وہ دبے پاوں باہر آیا اور پھر چپکے سے بیڈ روم کا روازہ دھیرے سے کھول کر باہر نکل آیا۔

اب وہ اپنی گاڑی میں سوار شہر کی سب سے مشہور بیکری کی جانب رواں دواں تھا۔ بیکری پہنچ کر اسنے ندا کا پسندیدہ ایک بڑا سے فریش کریم پائن ایپل کیک کا

آرڈر کرتے ہوئے کچھ ضروری ہدایات بھی دیں۔
واپس گھر جاتے ہوئے ایک فلاور شاپ سے بڑا سا سرخ گلابوں کا بوکے بھی خریدا
گھر میں وہ کیک کا ڈبہ اور بوکے لیکر چوروں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے داخل ہوا
کے کہیں ندا کی نظر اُس پر نا پڑ جائے۔ ڈبہ کو باورچی خانے میں رکھنے کے بعد اپنے
کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا جو اُس وقت نو بجا
رہی تھی۔
ابھی وہ دروازے پر لگے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے کھولنے کو تھا ہی کے دروازہ ازخُو کھلا
اور اس میں سے خُوب بنی سنوری سی ندا برآمد ہوئی۔
پہلے تو اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ تو خود ندا کو سرپرائز دینا چارہا تھا لیکن ندا نے تو اسے ہی
سرپرائزڈ کردیا تھا۔
وہ تو بس اُسے دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا۔ آج شادی کے سولہ سال بعد بھی وہ روزِاول
والی ہی ندا لگ رہی تھی۔

احد کو دیکھتے ہی ندا کے چہرے پر ایک بڑی حسین سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

۔"کہاں تھے احد آپ، میں تو پریشان ہو رہی تھی، بھئی مجھے بہت دیر ہو رہی ہے۔ مجھے آج ہماری این جی او کے خصوصی سیمنار میں پہنچنا ہے جو کے ایک مقامی ہوٹل میں دس بجے ہو رہا ہے۔ رات آپ لیٹ آئے تھے تو اِس بارے میں کوئی بات ہی نا ہو سکی۔ میں نے زینب سے کہ دیا ہے وہ آ کر بچوں کو بھی دیکھ لے گی اور کھانا وغیرہ بھی پکا لے گی۔ آپ نے اگر کہیں جانا ہو یا پھر آ سونا چاہیں تو اپنا کمرہ بند کرے سو جائیں۔ میں نے بچوں سے کہہ دیا کے کوئی بھی آپکو ڈسٹرب نا کرے گا۔ جب اٹھیں تو کھانا کھا لیجئے گا میرا انتظار نا کیجئے گا میں سیمنار سے شام دیر گئے ہی آ ونگی"۔

ندا بغیر رکے کہتی چلی گئی اور اِس سے پہلے کے احد کچھ کہتا ندا نے اپنی گاڑی کی چابی اٹھائی اور احد کو ایک بھرپور الوداعی مسکراہٹ کے ساتھ خدا حافظ کہتے ہوئے گھر کے مرکزی دروازے سے باہر نکل گئی

احد وہیں کھڑا کا کھڑا ہی رہ گیا پھر اسنے ندا کی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے اور پھر جانے کی آواز سنی۔ گاڑی کی آواز مدھم ہوتے ہوتے معدوم ہو گئی۔

اب وہاں ایک مہیب سناٹا تھا۔ ایسا سناٹا جسمیں احد اپنے دل کی ڈھرکن تک سن سکتا
تھا۔
۔"تو کیا ندا کو یہ بھی یاد نہیں تھا کے آج ہماری شادی کی سولہویں سالگرہ ہے"۔
اسنے سوچا تھا کے اسسال وہ شادی کی سالگرہ اُسی طرح سے منائے گا جیسے وہ شروع کے
چند سالوں تک منایا کرتے تھے۔
اسی لیئے تو آج وہ صبح صبح ندا کے پسندیدہ ترین کیک پر بھی بڑے ہی خوبصورت سے انداز
میں

"Happy 16th Wedding Anniversary

Ahad & Nida"

لکھوالایا تھا۔ پھر بوکے خریدا۔
سونے کا ایک بڑا ہی نازک اور حسین سا بریسلیٹ تو وہ پچھلے ہفتے ہی خرید چکا

تھا اور ایک پیارا سا اینیورسری کارڈ بھی لیکر اسپر بڑا ہی رومانٹک سا پیغام بھی درج کرلیا تھا۔

وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتا ہوا اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھا، دروازہ کھولا کر اندر داخل ہوتے ہی ساری بتیاں گُل کرکے اپنے بستر پر ڈھیر ہو کر تکیہ اپنے سر پر لیکر ایک بار پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کے ہونٹ تو خاموش تھے لیکن اندھیرے کمرے میں کہیں دور سے آتی مدھم سی صدا سنائی دیتی محسوس ہونے لگی:۔

تجھ سے ناراض نہیں زندگی حیران ہُوں میں

امیدِ بہار

امیدِ بہار۔ انتساب: احمد صفی اور سحر طاہر خان

تحریر: امین صدرالدین بھایانی

مذکورہ افسانے کی تحریک مجھے گذشتہ روز جناب احمد صفی کے فیس بک پیج پر اُن کی طرف سے سحر طاہر خان کے بلوچ کالونی، کراچی میں دیکھے ایک واقعے کو بڑے ہی متاثر کن انداز میں پیش کیئے جانے سے ملی۔اِسی لیئے میں نے اپنا یہ افسانہ اُن ہی سے منسوب کردیا ہے۔ مجھے امیدِ واثق ہے کہ انشاءاللہ آپ کو میرا یہ افسانہ بھی دیگر افسانوں کی طرح سے ضرور پسند آئیگا۔ مجھے آپ سب کی رائے کا شدت سے انتظار رھیگا۔

آخری سوٹ کیس بھی گاڑی کی ڈکی میں رکھے جانے کے ساتھ ہی چار پانچ گاڑیوں کا

وہ مختصر سا قافلہ حرکت میں آیا۔ سب سے اگلی گاڑی میں سیٹھ ستار کپاڈیہ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر براجمان تھا۔ پچھلی نشست پر اُس کی بیوی بلقیس کپاڈیہ اور دو بیٹیاں چودہ سالہ کلثوم کپاڈیہ اور نو سالہ زینب کپاڈیہ بیٹھے تھے۔ پیچھے والی گاڑی میں اُس کا سولہ سالہ جوانسال اکلوتا بیٹا فیصل کپاڈیہ اپنے چند دوستوں اور کزنز کے ہمراہ خوش گپیوں میں مشغول تھا۔ بقیہ گاڑیوں میں سیٹھ کپاڈیہ کے وہ رشتہ دار عورتیں اور مرد سوار تھے جو اُنہیں ائیرپورٹ تک الوداع کہنے کے لیئے ساتھ جارہے تھے۔ اگلی گاڑی قدرے سُست رفتاری کے ساتھ چلتی ہوئی ایک دو رویہ گلی جس کے دونوں اطراف بڑے ہی شاندار وسیع و عریض بنگلے، کوٹھیاں اور عین بیچ میں چھوٹی سی ہرے بھرے سرسبز پودوں، پھولوں اور درمیانے قد کے درختوں سے لدی گرین بلیٹ تھی، سے دائیں مڑ کر ایک بڑی سڑک جس پر خیابانِ سعدی کی تختی لگی ہوئی تھی میں داخل ہو گئی۔ گاڑی دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگی جبکہ قافلے میں شامل دیگر گاڑیاں اُس کی رفتار کا ساتھ دیتے ہوئے پیچھے چلی آرہی تھیں۔ تھوڑا ہی آگے جا کر گاڑی بوٹ بیسن کے چوراہے سے دائیں مڑ کر خیابانِ رومی کی وسیع و کشادہ سڑک پر آ گئی۔ سیٹھ کپاڈیہ اپنی نشست پر بیٹھا گاڑی کی ونڈ اسکرین اور بند شیشے والی کھڑکی سے سارے مناظر کچھ یوں حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ انہیں آخری بار ہی تو دیکھ رہا ہے۔

گاڑی کی رفتار کچھ تیز ہوئی اور پھر وہ شون سرکل والے چوراہے کے سرخ اشارے پر رک گئی۔ اچانک سیٹھ کپاڈیہ کی نظریں چوراہے کے پار عین بائیں جانب والے کونے پر قائم دین آرکیڈ کی چھت پر لگے اشتہاری بورڈ پر پڑی جس پر کسی تنظیم کی جانب سے حضرتِ علامہ اقبال کا یہ شعر لکھا ہوا تھا:۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتارہا

سیٹھ کپاڈیہ نے اپنی نگاہیں ایک جھٹکے کے ساتھ بورڈ سے یوں ہٹالیں جیسے وہ کوئی قابلِ اعتراض منظر ہو اور کوئی اُسے دیکھتے ہوئے نہ دیکھ لے۔ اُس نے چور نگاہوں سے گاڑی کے ونڈ اسکرین سے باہر دیکھ کر پورے انہاک سے گاڑی چلاتے ڈرائیور کی جانب دیکھ کر یہ تسلی بھی کرلی کہ کہیں اُس نے اُسے وہ شعر پڑھتے ہوئے دیکھ تو نہیں لیا۔

سرخ اشارے کے سبز ہوتے ہی گاڑی چوراہا پار کرکے آگے بڑھی اور سب میرین چورنگی کو تیزی سے پیچھے چھوڑتی پنجاب کالونی کی حدود سے نکل کر ڈیفینس کے سن سیٹ بلے وارڈ میں داخل ہو گئی۔ سیٹھ کپاڈیہ اُن سب سڑکوں، پوش دکانوں، شاپنگ سینٹروں، مالوں، چوراھوں اور اُن پر نصب یادگاروں کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ اُن سب کو اپنی آنکھوں میں بھر لینا چاہتا ہو اور سچ بھی یہ ہی

تھا کہ وہ صرف ان مناظر کو ہی نہیں، اپنے پیارے شہر کراچی ہی کو اپنی آنکھوں میں بسا لینا چاہتا تھا۔

کراچی۔۔۔۔۔۔۔!، جہاں وہ پیدا ہوا، جس کے گلی کوچوں میں کھیل کود کر وہ بچپن کی سرحدوں کو پھلانگ کر لڑکپن کی حدود میں داخل ہوا۔ جس شہر نے اُس کے لڑکپن کی ہر وہ اٹکھیلیاں دیکھیں جو اُس عمر کا خاصہ ہوا کرتیں ہیں۔ اُس نے اِسی شہر میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے ساتھ ساتھ لڑکپن ہی سے میمن مسجد کے عقبی علاقے کاغذی بازار کی "کپڑا مارکیٹ" میں قائم اپنے والد کی سوتی کپڑے کی دکان میں اُن کے ساتھ بیٹھنا شروع کیا۔ کپڑے کی تجارت سیٹھ ستار کپاڈیہ کا جدی پشتی کاروبار تھا اور اُسی کی نسبت سے وہ "کپاڈیہ" کہلاتے تھے۔

اُسے اپنا بچپن یاد آیا۔ وہ اپنے ابو سیٹھ حاجی غفار کپاڈیہ کے ساتھ کپڑا مارکیٹ والی دکان "کپاڈیہ اینڈ سن، کلاتھ مرچنٹس" میں اُن کے ساتھ جایا کرتا اور اُن کے منہ سے ہزار بار کی سنی ہوئی داستان ایک بار پھر سنتا کہ ستار یہ تیرے دادا سیٹھ حاجی جبار کپاڈیہ بہت ہی "جمیین" کاروباری "آدمین" تھے۔ قیامِ پاکستان سے قبل گجرات کاٹھیاواڑ میں وہ اِسی "کپاڈیہ اینڈ سن، کلاتھ مرچنٹس" ہی کے نام سے کاروبار کرتے تھے اور خود میری "پیدائس" بھی

کاٹھیاواڑ ہی میں ہوئی تھی۔ ستار تم ہماری کپاڈیہ "پھیمیلی" کے وہ پہلے "پھرد" ہو جس کی "پیدائس" پاکستان میں ہوئی ہے اور تم بڑے "خوس نصیب" ہو جو پیدائسی" پاکستانی ہو۔"

ننھے ستار کو خوب پتہ ہوتا تھا کہ اب ابو داداکے پاکستان آنے کا قصہ بھی ضرور چھیڑیں گے اور ایسا ہی ہوتا۔ اُس کے ابو دور خلاوں میں گھورتے ہوئے وہ ساری کہانی کچھ یوں سناتے جیسے وہ خلا میں نہ گھور رہے ہوں بلکہ کسی نظر نہ آنے والے سنیما کی اسکرین میں سے دیکھ کر یہ سارا واقعہ سنا رہے ہوں اور ہر بار سارا واقعہ حرف بہ حرف وہ ہی ہوتا جو ننھا ستار اپنے ہوش سنبھالتے ہی سنتے آیا تھا:۔

۔" میرے ابو بہت ہی جہین آدمین تھے۔ اُنکا کاٹھیاواڑ میں کپڑے کا بیجنس تھا اور اُس میں ایک گجراتی ہندو بیوپاری کی بھاگی داری [حصہ داری] بھی تھی۔ پاکستان بننے سے پلے ہی وہ کہتے تھے کہ انساء اللہ ہم سب پاکستان جایںگے اور بٹوارے سے کوئی آٹھ دس مہینے پلے ہی انہوں نے اپنے ہندو بھاگیدار سے اُس کا حصہ خرید لیا اور پھر بڑی مُسکلیوں کے بعد وہ کاروبار ایک دوسرے گجراتی ہندو کو بیچنے میں کامیاب ہوسکے۔ اِس دوران کراچی براستہ سمندر دو تین چکر لگا کر یہ اپنی کاگجی بجار والی دکان کا سودا طے کرلیا اور پھر

کاٹھیاواڑ والی دکان کو بیچنے کے بعد ایک بار پھر کراچی آئے اور اِس دکان کو خرید کر اپنا تالہ ڈال دیا۔ اِسی کاگجی بجار ہی کی ایک بلڈنگ میں چالی والا "ڈوھڈھیا" گھر خرید کر اُس پر بھی تالہ لگا کر پھر واپس کاٹھیاواڑ آئے اور وہاں کا گھر بیچ کر پہلے تو ہم سب گھر والے گھر کے سامان سمیت ٹرین سے بمبئ پہنچے اور وہاں سے ایک بڑے سمندری جہاج میں بیٹھ کر سارے سامان کے ساتھ قیامِ پاکستان سے پورے تین ایک مہینے پہلے ہی کراچی پہنچ گئے۔ پھر میرے ابو نے دکان میں یہ جو نام کا پاٹیا تو دیکھتا ہے نے ستار یہ، ایک بڑے ہی جبرجست پینٹر سے لکھوا کر اپنے ہاتھ سے لگایا اور جیسے تو میرے ساتھ دکان پر بیٹھتا ہے ویسے ہی میں بھی روج آ کر بیٹھنے لگا، حالانکہ میں اس وقت بمُشکیل آٹھ سال کا تھا"۔

اچانک ایک جھٹکے سے گاڑی سن سیٹ بلے وارڈ اور کورنگی روڈ کے سنگم پر ڈیفینس موڑ پر کچھ لمحات کو رکی اور دائیں جانب مڑ کر کورنگی روڈ پر آ کر شہیدِ ملت کار وے کی طرف بڑھنے لگی۔ اِس جھٹکے نے سیٹھ ستار کپاڈیہ کی سوچوں کا تار توڑ دیا۔ اُس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر وقت دیکھا اور کچھ ایسے انداز میں سر ہلایا جیسے اُسے اطیمنان ہو کہ وہ پورے وقت پر ہی ایئرپورٹ پر پہنچ جائے گا۔ گاڑی سے باہر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اس نے کوشش تو ضرور کی کہ اب سوچیں اُس پر حاوی نہ ہوں لیکن ایسا ہو نہ سکا۔ سوچوں کے بھنور نے ایک

بار پھر سر اٹھانا شروع کیا۔ اُسے یاد آیا کہ کیسے اُس نے دادا اور باپ کے چھوٹے سے کاروبار پر اپنی نوجوانی کے شب و روز وار کر اُسے کچھ ایسے آگے بڑھایا کہ وہ کاروبار کاغذی بازار کے کپڑا مارکیٹ کی ایک چھوٹی سی دکان سے آگے بڑھ کر پہلے ریڈی میڈ گارمینٹس کی ایک چھوٹی سی فیکٹری میں منتقل ہوا اور پھر وہ چھوٹی سی گارمنیٹس فیکٹری ایک بہت بڑے جدید گارمینٹس ایکسپورٹ یونٹ میں تبدیل ہو گئی۔ جس میں بننے والیں مصنوعات یورپ، امریکا اور کینیڈا تک جانے لگیں اور اُس کا کاروبار دن دونی و رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔

لیکن پھر وہ افسوسناک مرحلہ بھی آیا کہ مسلسل بجلی نہ ہونے، امن و امان کی مخدوش صورتحال اور آئے دن کی ہڑتالوں کے سبب پروڈکشن میں آنے والی کمی کے سبب غیر ملکی خریداروں کو بروقت شپمینٹس نہ سکیں اور نہ صرف آرڈرز کینسل ہونے لگے بلکے کمپنی کی سال ہا سال کی بنی ہوئی ساکھ کو بھی شدید دھچکے لگے۔ لہٰذا اِس ساری صورتحال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سیٹھ ستار کپاڈیہ نے اپنے ہی جیسے ایک بہت بڑے گارمنیٹس ایکسپورٹر کے ساتھ شراکت داری کا آغاز کیا اور پہلے سے بھی بڑے مینیو فیکچرنگ یونٹ کے قیام کو منصوبہ بنایا گیا لیکن اس عظیم الشان یونٹ کو کراچی میں نہیں لگنا تھا بلکہ کراچی تو کیا اسے تو پاکستان میں ہی نہیں لگنا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!
اُسے تو ڈھاکہ میں لگنا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔! جی ہاں ڈھاکہ، بنگلادیش، میں۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!!. اور لگتا کیا تھا وہ تو نہ صرف لگ بھی گیا بلکہ وقتِ مقررہ پر دھڑا دھڑ پروڈکشن کا آغاز بھی ہوگیا اور دنیا بھر میں ایکسپورٹ نہایت ہی کامیابی سے شروع بھی کردی گئی اور سچ تو یہ ہی کہ اِن دنوں بنگلادیش میں گارمنیٹس انڈسٹری جس طرح سے پھل پُھول رہی ہے اور حکومت کی طرف سے ملنے والیں مراعات نے پاکستانی سرمایہ کاروں کے لیئے اُسے محفوظ سرمایہ کاری کی جنت بنا دیا ہے۔

سیٹھ ستار کپاڈیہ نے اپنے ایکسپورٹ یونٹ کو کس دکھی دل کے ساتھ کراچی سے ڈھاکہ منتقل کیا اُسے تو بس وہ ہی جانتا تھا۔ اُس کے کراچی والے یونٹ جسے چلتے ہوئے کوئی بیس برس کا طویل عرصہ گزچکا تھا اور اِنگنت کارکنان جو سال ہا سال سے اُس کی کمپنی سے وابستہ تھے، جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ کمپنی اپنے دروازے اُن پر ہمیشہ کے لیئے بند کررہی ہے تو اُن کے غمگین چہروں پر لکھیں تحریروں کو پڑھ کر اُسے نہ جانے کتنی راتوں کو نیند تک نہ آئی۔

گاڑی کورنگی روڈ سے شہیدِ ملت کازوے کے پُل پر چڑھنا شروع ہوئی،پُل کے وسط سے دو راستے نکلتے ہیں۔ سیدھا راستہ اِنگلش بسکٹ فیکٹری سے ہوتا ہوا کورنگی انڈسٹریل ایریا کی طرف جاتا ہے سے ہٹ کر گاڑی پل کے بائیں والے موڑ پر مڑ گئی اور اب وہ کازوے کے بلوچ کالونی دوڑ پر دوڑے چلے جارہی تھی۔ سیٹھ

کپاڈیہ نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی۔ حالانکہ وہ اِس طرح سے گھر سے چلا تھا کہ اپنے وقت سے بھی پہلے ائیرپورٹ پر پہنچ جانے کی پوری امید تھی لیکن نہ معلوم وہ کیا بات تھی جو اُسے بے چین کیئے دے رہی تھی۔ شاید وہ بات اُس کا وہ فیصلہ تھا جس کے سبب وہ خود اور اُس کے سارے گھر والے ائیرپورٹ کی جانب رواں دواں تھے۔

اُس کا کاروباری شراکتدار محسن علی خان تو دھاکہ والی فیکٹری کے شروع ہوتے ہی اپنے پورے خاندان کے ہمراہ مستقل طور پر ڈھاکہ ہی منتقل ہوگیا تھا اور مسلسل اُسے بھی سمجھا رہا تھا کہ ملک اور بطورِ خاص کراچی کے حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وہ بھی اپنے سارے خاندان کے ساتھ ڈھاکہ ہی منتقل ہوجائے لیکن وہ ہمیشہ یہ کہہ کر صاف انکار کردیتا کہ میں نے کراچی کے.برے حالات کے سبب اپنا کاروبار تو ضرور ڈھاکہ منتقل کیا ہے لیکن ابھی حالات اتنے بھی خراب نہیں ہوئے کہ میں اپنا شہر، اپنا ملک چھوڑ کر ڈھاکہ ہی منتقل ہو جاوں۔

لیکن پھر چار روز قبل ہونے والے عباس ٹاون سا نحے نے تو جیسے اُس کی ہمت توڑ کر رکھ دی۔ ٹی وی اسکرین پر عباس ٹاون کے فلیٹوں کو دیکھ کر اُسے وہ منظر یاد آئے جو اُس نے کبھی بیروت کی خانہ جنگی کے دوران دیکھے تھے۔ اُس نے سوچا کہ پہلے تو لوگ کہتے تھے کہ اگر حُریت درکار ہے تو گھر میں ہی دُبکے

رہو لیکن اب تو یہاں انسان اپنے گھر میں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ سونے پہ سہاگہ محسن علی خان نے یہ خبر سنتے ہی اسے فوراً فون کرکے اُس کے وہ لتے لیئے کہ بس خدا کی پناہ اور کہا: "میاں اب تو کچھ ہوش کے ناخن لو اور اِس سے پہلے کے کچھ اس سے بھی بُرا ہوجائے فوراً گھر والوں کو لے کر یہاں منتقل ہو جاو"۔

اِس واقعے نے تو سچ مچ اُسے ہلا کر ہی رکھ دیا تھا اور پھر اُس نے فیصلہ کر ہی لیا کہ وہ ڈھاکہ منتقل ہوجائے گا اور اگر جو وہاں مزا نہ آیا تو دو ایک سال بعد دبئ چلا جائے گا یا پھر کینیڈا کی شہریت کے لیئے درخواست دے دے گا۔ محض تین دنوں میں ساری تیاری ہو گئی۔ ویسے تیاری کرنی ہی کیا تھی۔ کاروبار تو ویسے ہی سارا کا سارا ڈھاکہ منتقل ہوچکا تھا۔ گھر کے سارے ساز و سامان کو سفید چادریں اوڑھا دیں گئیں اور تالے لگا دیے گیئے۔ باقی رہ گیا ڈھاکہ کا تو وہاں محسن علی خان کی یہ لمبی چوڑی سجی سجائی رہائش گاہ تو موجود تھی ہی اور پھر وہ جو کہتے ہیں نہ کہ پیسہ پھینک تماشہ دیکھ۔ تو پیسے کی تو کوئی کمی تھی ہی نہیں۔

گاڑی شہید ملت کار وے اور شاہراہ فیصل کے سنگم پر بلوچ کالونی موڑ پر دائیں جانب مڑ گئ اور ابھی کونے والی گول حبیب بنک سے تھوڑا سا ہی آگے بڑھی تھی

کہ ایم سی بی بنک سے کچھ ہی پہلے شدید ٹریفک جام نظر آیا۔ ڈرائیور کو گاڑی روک دینا پڑی۔ تھوری دیر میں گاڑی کے پیچھے گاڑیوں کا ہجوم جمع ہوتا چلا گیا اور پھر آگے اور پھیچے دونوں جانب بس یوں جانوں جیسے گاڑیوں کا ایک سمندر نظر آرہا تھا۔ سیٹھ ستار کپاڈیہ بار بار بیچینی سے گھڑی کو دیکھتا تو کبھی گاڑی کی کھڑکی سے سر باہر نکال کر آگے پیچھے دیکھتا لیکن اُسے تو بس چاروں طرف گاڑیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ نظر آرہا تھا۔

کوئی آدھا گھنٹہ یونہی ٹریفک میں پھنس کر اُس نے دل میں سوچا کہ ایسی جگہ جہاں کسی کو اپنی زمہ داری کا قطعاً کوئی احساس ہی نہ ہو وہاں سے تو چلے جانا ہی بہتر ہے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک گاڑی کے ونڈ اسکرین میں اُسے تھوڑی ہی دور چوراہے پر ایک اکیلا ٹریفک پولیس کا سپاہی نظر آیا جو اُس ٹریفک کے عظیم الشان اژدھام کو قابو میں کرنے کی کوشش میں نہ جانے کب سے مصروفِ عمل تھا۔ دھوپ کی شدت اور اِرد گرد ہزارہا گاڑیوں کے دھویں اور اُس کی تپیش سے وہ پسینے میں شرابور ہوا جارہا تھا اور بار بار اپنی آستین سے پیشانی پر آیا ہوا پسینہ پونچتا لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اب اُس کی ہمت دھیرے دھیرے جواب دینا شروع ہوچکی ہے۔ اچانک وہ لڑکھڑایا اور اُس سے پہلے کہ وہ وہیں اُس سڑک پر گر کر ڈھیر ہو جاتا، لڑکھڑاتا ہوا، اپنے اِرد گرد ہارن بجاتی ہوئی گاڑیوں سے خود کو بچاتے ہوئے سڑک کے ایک کونے پر

جا کر دھم سے زمین پر جا بیٹھا۔

ابھی سیٹھ ستار کپاڈیہ اِس منظر ہی میں گم تھا کہ اچانک ایک زور دار گونج نے اُسے چونکا دیا:۔

"چلو۔۔۔۔۔۔۔۔!"

اس نے سر گھما کر دیکھا تو اُسکی گاڑی کے بالکل ساتھ ہی بیس ایک سال کا اڑی ہوئی فلزی رنگت کی ٹی شرٹ میں ملبوس نوجوان اپنی موٹر بائیک پر سوار پیچھے کھڑے اپنے بہت سارے بائیک سوار ساتھیوں کو ہاتھ کے اشارے سے آگے بلا رہا تھا۔

وہ کسی بالی وڈ کی فلم کا سا منظر نظر آ رہا تھا۔ سیٹھ کپاڈیہ کے چہرے پر شدید ناگواری کے تاثرات ابھرے۔ اُسے ویسے بھی بالی وڈ کی فلموں سے چڑ تھی اور اُس نے سوچا کہ بائیک سوار نوجوانوں کا یہ جتھا بالی وڈ کی فلموں سے متاثر ہو کر اپنی بائیکوں پر سوار ہلڑ بازی مچانے کے لیئے آن پہنچا ہے۔

لیکن اب جو اگلا منظر سیٹھ ستار کپاڈیہ کی آنکھوں نے دیکھا تو جیسے اُسے تو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہ ہوتا تھا۔ بائیک سوار نوجوانوں کا جتھا ٹریفک سپاہی کی طرف بڑھا۔ اُن میں سے چند نے اُسے سڑک کے کنارے سے اٹھایا، دھول مٹی میں اٹے ہوئے اُس کے کپڑے جھاڑنا شروع کیئے۔ اُس ٹریفک جام میں کافی دیر سے ایک ایمبولینس کھڑی اپنا سائرن بجا رہی تھی لیکن اُسے آگے جانے کے لیے جگہ میسر نہیں آ رہی تھی۔ اُن نوجوانوں نے فوری طور پر تمام گاڑیوں پر فرداً فرداً جا کر ایک ایک ڈرائیور سے درخواست کرکے اُس پھنسی ہوئی ایمبولینس کے جانے کے لیئے راستہ بنوایا اور پھر بڑی ہی مستعدی سے دیگر پھنسی ہوئی گاڑیوں کے لیئے راستہ بنا کر ٹریفک کو بڑی ہی خوش اسلوبی کے ساتھ کنٹرول کرنا شروع کر دیا۔ اُن کے اِس عمل سے رکا ہوا ٹریفک دھیرے دھیرے آگے بڑھنا شروع ہوا۔ ٹریفک کے کسی قدر رواں ہونے کے بعد اُن نوجوانوں نے بس اسٹاپ پر کھڑے لوگوں کو جو نہ جانے کب سے بس کے انتظار میں تپتی دھوپ میں جل رہے تھے، اپنی بائیک پر لفٹ دیکر سوار کرنا شروع کر دیا۔

یہ سارا منظر دیکھ کر وہاں موجود سارے ڈرائیوروں نے گاڑیوں کے شیشے نیچے اتار کر زور زور والہانہ انداز میں تالیاں بجا کر اُن نوجوانوں کو خراج تحسین پیش کیا۔

سیٹھ کپاڈیہ کی آنکھیں آنسوں سے ڈبڈبا آئیں۔ لیکن اُس نے اپنی ڈبڈباتی آنکھوں سے امید کی ایک روشن کرن ضرور دیکھ لی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ !، امیدِ بہار کی روشن کرن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!!۔

اُس نے ڈرائیور کی طرف جھک کر اُس کے کان میں کچھ کہا اور ڈرائیور نے گاڑی کو آگے بڑھا دیا اور اگلے ہی چوراہے گاڑی کو دوبارہ واپس موڑ لیا۔ گاڑی اب ایئرپورٹ کی بجائے اُسی راستے سے واپس جارہی تھی جہاں سے چلتی ہوئی آئی تھی۔

بڑی عجیب بات تھی کہ سیٹھ ستار کپاڈیہ کو واپسی کے سارے راستے، ہر دیوار، ہر شجر، ہر گزرتے انسان کے چہرے پر بس یہ ہی مصرعہ لکھا نظر آرہا تھا اور اب وہ اُس سے اپنی آنکھیں چرانے کی کوئی کوشش بھی نہیں کررہا تھا:۔

پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

بھاٹی گیٹ کا روبن گھوش [افسانہ]۔

۔"اوے کاکا جلدی بند کر اِسے۔۔۔۔۔۔۔۔۔! آ رہا ہے رفیق استاد۔۔۔۔! اگر جو اُسے تمھاری کارستانی کا پتہ چل گیا نہ بچو، ہم دونوں ہی اپنی نوکری سے جائیں گے"۔ غفُور عرف گاما ہوٹل کے دروازے سے دوڑتا ہوا اندر آیا۔ رفیق استاد کے اندرونِ شہر لاہور کے مخصوص لہجے کی نقل اتارتے ہوئے کاؤنٹر پر بیٹھے مُشتاق کو جھنجوڑتے ہوِئے بولا جو اُس وقت ہوٹل کی فضاؤں میں گونجتے فلک شگاف فلمی آئٹم سانگ "نائٹ کی نائی کہانی، یہ ہلکٹ جوانی" کی دھماکے دار "ہلکٹ" تانوں پر آنکھیں نیم وا کئے مست ومگن جُھوم رہا تھا۔ گامے کے اُس ایک فقرے کے کانوں میں پڑتے ہی وہ کچھ یوں ہوش میں آ گیا جیسے راہ چلتا نشئی پولیس کو دیکھ لے اور گھڑی بھر میں اُس کا سارا نشہ ہرن ہو جائے۔ اُس کی نیم وا آنکھیں جواب تک چشمِ تصور میں ہوٹل میں گونجتے گانے کے جملہ "ہلکٹ" نظارے دیکھنے میں مگن تھیں، یکایک چوڑی کھل گئیں اور اُن کی پتلیاں تیزی وطراری کے ساتھ اِدھر اُدھر حرکت کرنے لگیں جیسے کوئی پرندہ زمین پر بکھرے دانوں کو چُگتے چُگتے کسی متوقع حملے سے آگاہ رہنے کے لیئے اپنی نگاہوں کو ہمہ وقت متحرک رکھتا ہے۔ چہرہ البتہ مکمل بدحواسی کی تصویر بنا ہوا تھا۔

کاؤنٹر پر رکھے اپنے دونوں ہاتھوں جس سے ابھی وہ چند ہی لمحات پہلے گیت کی تانوں پر طبلے کی سنگت کر رہا تھا کو تیزی کے ساتھ حرکت دی اور کاؤنٹر کے نیچے سی ڈی پلیئر کو بند کرنے کی غرض سے ایک کَل کو اپنی انگلی سے دبا دیا۔ بدحواسی میں انگلی کسی اور ہی کَل پر جا پڑی۔ جس کے دبتے ہی چلتا ہوا گانا فوراً تبدیل ہوا اور اگلا گانا اُسی روز و شور سے گونجنے لگا۔ کوئی منی صاحبہ تھیں جو حلق پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہی تھیں:۔ "منی بدنام ہوئی ڈارلنگ تیرے لیئے"۔ اب یہ وہ بات ہے کہ وہ نام نہاد منی گانے کے نام پر جس بیباکانہ انداز میں اور جو کچھ گا رہی تھی وہ تو خود ہی بتا رہا تھا کہ وہ کتنی پارسا ہے اور اگر جو وہ بدنام نہ بھی ہوتی تو ایسا واہیات گیت گا کر ضرور ہو جاتی۔ ہڑبڑائے مُشتاق نے پھر بڑبونگ میں وہی حرکت کی جو وہ اِس سے قبل کر چکا تھا۔ نتیجتاً اب ایک دوسرا گانا اسپیکروں سے اُبلنا شروع ہوا: "بیڑی جلئی لے جگر سے پیاء، جگر ما بڑی آگ ہے"۔ ۔"ابے بھیجہ گھوم گئے لا ہے کیا تیرا؟۔ بڑا منی جر بنا پھرتا ہے۔ استاد کا نام سُنتے ہی تیرے ہاتھوں کے توتے اڑ جاتے ہیں"۔ مُشتاق کی یہ ہیئت کزائی دیکھ گامازور سے قہقہہ لگاتے ہوئے بولا اور ساتھ ہی اُس نے آگے بڑھ کر سی ڈی پلیئر کی درست کَل دبا کر اُسے بند کر دیا اور سی ڈی نکال کر اپنی قمیض کی جیب میں ڈال لی۔ کچھ دیر پہلے تک مُشتاق جو گانے کی تانوں پر جُھوم

جُھوم کر محظوظ ہو رہا تھا، اب گانا بند ہونے پر یوں مطمئن دکھائی دے رہا تھا جیسے اب تک وہاں کوئی ہنگامۂ محشر بپا تھا جو یکایک کسی فرشتے کی جُنبشِ ابرُو سے یکسر مؤقوف ہو گیا ہو۔

مکمل چاک وچوبند نظر آنے کی کوشش میں مُشتاق نے کندھوں کو اُچکا کر چوڑا کیا اور اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا اُنہیں مستعدی سے کاؤنٹر پر ٹکا کر اطراف میں پھیلی میزوں اور کرسیوں پر بیٹھے گاہکوں کا عُقابی نگاہوں سے یوں جائزہ لینے لگا کہ جیسے اگر زرا سی بھی چُوک ہوئی تو کوئی گاہک چائے یا کھانے کا بل ادا کیے بناء ہی رفو چکر ہو جائے گا۔ گاما کاندھے پر پڑے تولیے سے کاونٹر پر زور و شور سے صافی مارنے لگا لیکن اُس کی ترچھی نگاہیں ہوٹل کے داخلی دروازے پر ہی ٹکی ہوئی تھیں جہاں سے کسی وقت بھی رفیق استاد کی آمد متوقع تھی۔

چند منٹوں کے بعد ہوٹل کے داخلی دروازے سے جو اندرون بھاٹی گیٹ، حکیماں والا بازار میں کُھلتا تھا ایک شخص داخل ہوتا نظر آیا۔ لگ بھگ پچاس کے پیٹے میں ہونے کے باوجود اپنی گھنی سیاہ مگر پریشان زُلفوں، اوسط سے چھوٹے قد، درمیانی مگر مضبوط وصحت مند کاٹھی سے چالیس سے زیادہ کا کسی طور بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ سفید شلوار قمیض پر سلوٹوں کا ایک وسیع جال بچھا ہوا تھا۔

سانولی رنگت۔ آنکھوں پر گہرے سیاہ چشمے لگا رکھے تھے۔ گھنی کالی مونچھوں میں اکا دکا کوئی چاندی کا تار جھانکتا نظر آ رہا تھا۔ ماتھے پر گرمی کی وجہ سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ اپنی قمیض کی بغلی جیب سے رُومال نکال کر پسینہ پونچھا اور چشمہ اتار کر سُرمہ بھری آنکھوں سے تمام میزوں کا سرسری سا جائزہ لیا۔ کم وبیش تمام ہی کرسیوں کو گاہکوں سے بھرا دیکھ کر یوں سر ہلایا جیسے اپنے اطمینان کا اظہار کر رہا ہو۔ دھیرے دھیرے چلتا ہوا کاونٹر تک آیا۔ مُشتاق جو کہ اب نشست سے اٹھ کر قدرے مودبانہ انداز میں کاونٹر ہی کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا کی طرف دیکھ کر بولا: "ہاں کاکا مُشتاق، آج کاڑوباڑ کیسا جاڑہا ہے؟"

استاد دھندا توبڑا دھانسو جارے لا ہے۔ بولے تو جاکاس" مُشتاق بتیسی نکالتا ہوا بولا۔ "بیٹا کتنی باڑی کہا ہے کہ اتنی ہندی فلمیں نہ دیکھا کڑ۔ دیکھ تیڑی زبان کا کیسا ستیاناس ماڑ دیا ہے"۔ "جی رفیق استاد میں بھی اُس کُو یہ ہچ سمجھتا۔ بیڑو! فلم بند اس دیکھ لیکن لوّن کا مافق دل پہ نہیں لینے کا، کیا؟۔۔۔۔۔۔ وہ کیا ہے نا کہ استاد یہ سمجھتاج نہیں"۔ گاما جو کہ کاونٹر کے ساتھ ہی کھڑا تھا حسبِ عادت بیچ میں بول پڑا۔

گامے کی بات سن کر استاد رفیق کے چہرے پر ایک گہری مسکراہٹ آ گئی: "تم دونوں کی تو بس وہ ہی مثال ہے کہ چوڑ چوڑی سے جائے ہیڑا پھیڑی سے نہ جائے اوڑ خڑبوزے کو دیکھ کڑ خڑبوزہ ڑنگ پکڑتا ہے۔ سو نہ تم دونوں ہیڑا پھیڑی سے

باز آ سکتے ہو اور نہ ہی ایک دوسرے کا رنگ پکڑنے سے "۔

یہ کہتا ہوا وہ کاؤنٹر کے ساتھ لگی اپنی نشست کی جانب بڑھا۔ ابھی بیٹھنے والا ہی تھا کہ اُس کی نظر عقب میں پڑیں جہاں اُوپر اللہ جلّ جلال ہُو اور محمد ﷺ کے طُغرے آویزاں تھے۔ اُن کے عین نیچے قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ اور مصورِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کی فریم کردہ تصاویر لگی ہوئی تھیں۔ اُس کے عین نیچے ایک اور فریم شدہ تصویر بھی نصب تھی۔ اُس نے آگے بڑھ کر طُغروں اور فریموں کو اپنی انگلی کی مدد سے درست کیا اور پھر یہ کہتا ہوا اپنی نشست پر آ بیٹھا: "کئی واری سمجھایا ہے کہ سوٹے جھاڑ پونچ کرتے ہوئے ہل جائیں تو اُسی وقت دُرست کر لیا کرو۔ آڑی ترچھی ہونے سے بے حرمتی ہوتی ہے۔۔

۔۔۔۔۔۔ !۔ اچھا خیر، تم دونوں باہر کھڑی پک اپ پر لدھا سمیان اترواکر تو اپنی نگرانی میں اندر رکھوا دو"۔ رفیق استاد نے دروازے کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "شُکر ہے اللہ کا سب کچھ مل گیا لیکن خُدا کی پناہ بازار میں تو جیسے آگ ہی لگی ہوئی ہے۔ ہر شئے کے بھاؤ آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ اِس مہنگائی سے تو اب اللہ ہی بچائے"۔

۔ "بولے تو رفیق استاد آج تو تم نے دیر بھی بڑی لگا دی"۔ مُشتاق نے سوال داغ دیا۔

بس کیا پوچھتے ہو لاہور شہر کی بے ہنگم ٹریفک کا۔ صرف شاہ عالمی اور"

اکبری منڈی تک ہی تو گیا تھا۔ وہ تو بھلا ہو شادے کا اُس نے مجھے کل ہی کہہ دیا تھا کہ استاد دوں وں یہاں سے کٹھے ہی میٹری پک اپ پڑ نکل چلیں گے۔ سوڑے کے جو ہم دونوں نکلے ہیں تو اب شام کا ویلہ ہونے کو آیا ہے تو واپس آئے ہیں۔ وہاں جاؤ تو ٹریفک جام اور واپس آؤ تو ٹریفک جام اور سونے پہ سہاگہ وہاں کا پولیوشن۔ پہلے اکبڑ منڈی آٹا، سوجی، نمک، چائے، چینی، چاول، دالیں اور مرچ مصالے لینا تھے۔ وہاں اتنا شدید ٹریفک جام تھا کہ بس اللہ کی پناہ! میری تو ظہر بھی قضاء ہو گئی۔ وہاں سے شاہ عالمی چوک اور پھر آگے ٹرنگ محل چوک سے ہوتے ہوئے کشمیڑا بازار گئے۔ ہوٹل کی دیگیں قلعی کروانی تھیں اور کچھ نئے برتن بھانڈے بھی لینے تھے۔ فارغ ہو کر وہیں آگے شاہ عالمی کی "نی ویں مسیت" میں قضاء اور عصر پڑھی۔ واپسی میں بھی آدھے سے زیادہ وقت تو ٹریفک میں ہی پھنسے رہے" رفیق استاد کے چہرے کے ساتھ اُس کی آواز سے بھی بھرپور تکان ظاہر ہو رہی تھی۔

اتنا کہہ کر وہ کاؤنٹر کے نیچے لگی دراز کھول کر چیزیں الٹنے پلٹنے لگا۔ اُس کا ہاتھ دراز سے باہر آیا تو انگلیوں میں ایک سی ڈی دبی ہوئی تھی۔ سی ڈی کو دیکھ کر مُشتاق اور گامے کے چہرے پر ہلکی سی معنی خیز مسکراہٹ نظر آئی۔ ایک دوسرے کو آنکھ کے گوشے میچ کر کھسکنے کا اشارہ کیا اور ہوٹل کے باہر جانے والے دروازے کی جانب مڑ گئے تاکہ رفیق استاد کی ہدایت کے مُوجب شادے

کی پک اپ پر لدھے سامان کو ہوٹل کے عقب والے گودام میں منتقل کردیں۔

رفیق استاد نے سی ڈی کو نیچے جھک کر پلیئر میں لگا دیا اور پھر جھٹ سے ایک کَل دبا دی۔ زرا سی دیر میں اسپیکروں سے دھیرے دھیرے سنتُور اور اُس میں مدغم ہوتی جلترنگ کی تانیں اُبھریں۔ ان دونوں سُریلے سازوں کے مدھر سنگیت کے مختصر سے انگ کے اختتام پر پیانو کا چھوٹا سا انگ ابھر کر تھما تو خان صاحب مہدی حسن خان مرحوم کی من موہنی سی مدبھری آواز میں دو بول اُبھرے:۔

ے"پیار بھرے۔۔۔۔۔۔۔۔۔!"۔

بولوں کے درمیان ایک لمحے کا وقفہ آیا۔ پھر پیانو کی دو تانوں کے ساتھ اگلے بول سنائی دیئے اور ہمراہ طبلے کی سنگت کا آغاز ہوا۔ پیانو اور طبلے کا ساتھ بانسری کی ہلکی مگر دل موہ لینے والی تانوں نے دیا:۔

ےدو شرمیلے نین

جن سے ملا میرے دل کو چین

کوئی جانے نہ کیوں مجھ سے شرمائیں

کیسے مجھے تڑپائیں

پیار بھرے دو شرمیلے نین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!!۔

استائی اور انترہ مکمل ہوا تو دیگر تمام آلاتِ موسیقی پر ستار کی روح کو جنھنجھوڑتی تانیں حاوی ہوتی چلی گئیں اور وائلن نوازوں نے اُس کا بھرپور ساتھ دینا شروع کر دیا۔ رفیق استاد تو جیسے مہدی حسن کی آواز، ساتھ سنگت کرتی موسیقی کی تانوں، گیت کے رومانوی بولوں اور رُوح کی گہرائیوں تک اتر جانے والی مدھر دھن کے جادو کا اسیر ہی ہو چکا ہو۔ نیم وا آنکھوں سے سر دُھنتا ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے کسی جہانِ دیگر کی سیر کرتا پھر رہا ہو۔

باہر کھڑے گامے نے جب ہوٹل کے دروازے سے اندر جھانکا تو رفیق استاد کو اِس حال میں دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ ناچ اُٹھی۔ مُشتاق جو آٹے کی بوری کو پک اپ سے نیچے اتارنے کی کوشش کر رہا تھا کے کاندھے کو ہلاتے ہوئے بولا: واہ بھئی واہ، بیڑو! اپنا استاد بھی کوئی تجھ سے کم نہیں۔ تُو ہندی فلموں کے آئٹم سانگ سن کر تو وہ پاکستانی فلموں کے گانے سن کر ٹُن ہو جاتا ہے۔ اندر جھانک کر تو دیکھ کیسا جھوم رہا ہے۔ کہیں کوئی گاہک اِس حال میں دیکھ کر بل چکائے بناء ہی اڑن چُھو نہ ہو جائے"۔ "ہاں یہ تو سچ ہے کہ اپنا استاد پاکستانی فلمی گیتوں کا بڑا ہی پکا عاشق ہے۔ اب بوڑھا ہونے کو جو آیا

ہے اور اُس کی پسند بھی بوڑھوں جیسی ہی ہے۔ بھلا "بیڑی جلئی لے" اور "ہلکٹ جوانی" جیسے دھانسو آئٹم سانگز میں جو دم ہے وہ اُس کے اِن تھکے ہوئے گیتوں میں کہاں"۔

۔"ہاں یہ بات تو نے سولہ آنے ٹھیک بولی۔ لیکن کچھ بھی ہو اپنا استاد ہے دل کا راجہ، کیا سمجھا" گاما اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا: "ہاں تو اس بات سے کون انکار کرتا ہے۔ تجھے استاد کا آسرا نہ بھی ملتا تو تیری خیر تھی۔ شکر کر کہ تیرا حال مجھ سا نہیں۔ نہ آگا نہ پیچھا۔ کوئی چھ برس کی عمر تھی میری جب استاد مجھے ایک دن مُوری گیٹ کے سامنے اردُو بازار کے ایک کونے پر کُوڑا کرکٹ کے ڈھیر سے کُوڑا چنتے ہوئے ترس کھا کر پکڑ لایا تھا۔ آج دس بارہ سال ہوگئے۔ اُس کی مہربانی ہے کہ اُس نے اپنے پاس رکھا، کھلایا پلایا، پہلے تو مجھے یہیں محلے ہی کے ایک سرکاری پرائمری اسکول میں داخل کروا دیا اور پھر میرے شوق اور اچھی تعلیمی استعداد کے سبب شیراں والا گیٹ کے گورنمینٹ اسلامیہ ہائی اسکول میں داخلہ دلوایا۔ جہاں سے بڑے ہی اچھے نمبروں سے میٹرک پاس کرنے کے بعد اب تیری دعاوں اور اللہ کے بعد رفیق استاد کی مہربانیوں سے چند ماہ قبل ہی میرا داخلہ رجحان ٹسٹ پاس کرکے نیشنل کالج آف آرٹس میں فلم و ٹیلی وژن کے بیچلرز ڈگری کے چار سالہ پروگرام میں ہوگیا ہے۔ لالج سے آ کر ہوٹل ، سبھالتا ہوں۔ جانتا بھی ہے کہ استاد نے صرف داخلہ

رجسٹریشن اور امتحانی فیس ہی کی مد میں کوئی دس ہزار خود میرے ساتھ جا کر جمع کروایا اور اب ہر ماہ تقریباً پانچ ہزار فیس بھی خود ہی کالج جا کر اپنے ہاتھوں سے جمع کرواتا ہے۔ میں نے استاد سے کہا بھی تھا کہ مجھے کسی شام کے کالج میں ہی ایف اے شیف اے کر لینے دو لیکن وہ بولا: "نہیں کاکا نہیں۔۔۔۔! میں چاہتا ہوں کہ تو وہی تعلیم حاصل کرے جس کا کہ تجھے شوق ہے۔ ویسے بھی سویرے سویرے ہوٹل کا کاروبار زرا ٹھنڈا منڈا سا ہی ہوتا ہے۔ میں اور غفور کام سنبھال لیا کریں گے۔ کاکا تو جم جم پڑھائیاں کر۔ اصل رونق میلہ تو دوپہر، شام اور رات میں ہی ہوتا ہے۔ تو بے فکر ہو کر سویرے کالج چلا جایا کر۔ تو نے پڑھائی اور ہوٹل دووں ہی کو بہت اچھے طریقہ سے سنبھالنا ہے۔ آخر کو تو میرے ہوٹل کا منیجر ہے۔ پورے بھاٹی میں ہے رفیق استاد کی ٹکر کا کوئی ایک بھی ہوٹل۔ خبردار جو کالج میں کسی الٹے سیدھے چکروں میں پڑا۔ تو نے کوئی بھی ایسا ویسا کام نہیں کرنا جس سے تیرے رفیق استاد اور اُسے کے ہوٹل کے نام پر کوئی بٹہ لگے"۔

۔"ہاں ہاں ساری رام کتھا کی لُن کو خبر ہے۔ بولے تو جیاستی ٹرٹر نیں مِنگتا"۔ گامے نے اپنی قمیض کی کالروں کو ہاتھوں کی انگلیوں میں پکڑ کر اُچکایا اور گردن کو زرا سا خم دیتے ہوئے بولا۔ "ابے جو استاد نے سن لیا نہ تو اب کی بار نہیں چھوڑے گا اور تیرے ساتھ رہ رہ کر تو میری زبان بھی اب

یونہی ہر وقت پھیسلتی ہی رہتی ہے۔ استاد سچ ہی کہتا ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ مُشتاق مسکراتے ہوئے بولا:۔ "ویسے تُو بھی تو میرے کچھ پیچھے ہی استاد کے پاس آیا تھا نہ؟ کیا ہی اچھا ہوتا کہ جو تو بھی آگے اور پڑھ لیتا"۔ مُشتاق نے اُس کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھتے ہوئے دریافت کیا:۔

۔"ہاں میں جب آٹھ نو سال کا تو تھا اپنے محلے یا کی دروازہ جہاں پرانے کپڑوں کی جلال دین مارکیٹ کے ساتھ والے محلے میں ہمارا گھر ہے۔ میرا ابا وہیں کسی پرانے کپڑوں کی دکان میں کپڑوں کی چھٹائی اور مرمت کرنے کی نوکری کرتا تھا اور آج بھی کرتا ہے سے پیدل چلتا ہوا داتا دربار لنگر کھانے جاتا۔ ایک روز وہاں استاد نے مجھے چند بڑے لڑکوں سے جو میرا لنگر چھیننا چاہتے تھے اور میرے نہ دینے پر مجھے مار رہے تھے سے بچا کر گھر پہنچایا جہاں میری اماں نے مجھے اُس کے سامنے ہی کوسنے دے دے کر مارنا شروع کر دیا۔ ویسے قصور اماں کا نہیں میرا ہی تھا وہ مجھے تیار کرکے اسکول روانہ کرتی اور میں روز اسکول سے بھاگ کر داتا دربار لنگر کھانے چلا جاتا۔ استاد نے یہ ساری باتیں سُن کر میری اماں سے کہا: "اسے ٹروز اندرون بھائی گیٹ، بازاڑ حکیماں والا میں میٹرے ہوٹل بھیج دیا کڑیں۔ میں ٹروز کچھ پیسے بھی دے دیا کڑوں گا اور میٹرے پاس ایک اوڑ بھی کاکا اِسی کی عمڑ کا ہے۔ یہ اُس کے ساتھ سکول چلا جایا کرے گا۔

مُشتاق پڑھاکو کاکا ہے۔ اُس کے ساتھ رہے گا تو اِس کا بھی دل پڑھائی میں لگ ہی جائے گا اور اِس کی آوارہ گردیاں بھی ختم ہو جائیں گی"۔ "لیکن مُشتاق ماے۔۔۔۔!، تُو نے تو پڑھ لیا لیکن اپن کا حال تو جو تب تھا سو اب ہے۔ استاد مجھے اسکول بھیجتا اور میں وہاں سے بھاگ کر پھر ہوٹل آ جاتا اور یوں میرا نام کئی بار اسکول سے کٹا۔ بے چارا استاد تو بہت کوشش کرتا رہا لیکن اپنا پڑھائی میں جی ہی نہیں لگتا تھا پھر بھی جیسے تیسے کر کے استاد نے پیار، محبت، دھونس، ترلے، دھمکی، غصہ اور ناراضگی دکھا کر اور دو چار بار کی کمپارٹمینٹوں کے بعد میٹرک 33 فیصدی نمبروں ہی سے سہی، پاس کروا کر ہی چھوڑا۔ لیکن اب تو وہ بھی مجھ سے ہار مان گیا ہے۔ میں نے اُسے صاف صاف کہہ دیا کہ اب آگے مجھ سے نہیں پڑھا جائے گا۔ باقی رہی بات فلمی بھاشا کی تو یہ میں استاد کو تپا کر اُس کے مزے لینے کے لیئے بولتا ہوں۔ تجھے تو پتا ہی ہے نہ کہ وہ ایسی باتوں سے کتنا چڑتا ہے"۔

اِن ساری باتوں کے دوران پک اپ پر لدھا سارا سامان گودام میں رکھوا کر جب دونوں واپس ہوٹل کے اندر آئے تو استاد رفیق اُسی طرح آنکھیں نیم وا کیئے جھوم رہا تھا لیکن اب ہوٹل میں مہدی حسن کی جگہ مجیب عالم مرحوم کی آواز گونج رہی تھی:۔

۔وہ میرے سامنے تصویر بنے بیٹھے ہیں

میرے ہر خواب کی تعبیر بنے بیٹھے ہیں

استاد کا سر اور جسم گانے کی دھن پر جُھوم رہا تھا۔ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کاؤنٹر پر یوں چلا رہا تھا جیسے اُس گانے میں بجتے پیانو کو وہ ہی تو بجا رہا ہو۔ گانے میں جہاں جہاں پیانو رکتا تو ستار کے چھوٹے چھوٹے انگ بجنا شروع ہوتے۔ استاد اپنا ہاتھ الٹا سینے کے ساتھ کھڑا کرکے کہنی پر اپنی انگلیوں کو یوں چلانا شروع کر دیا جیسے اُس جیسا ماہرِ فن ستار نواز تو آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔ مُشتاق اور گامے سمیت ہوٹل میں بیٹھے بہت سے گاہکوں کی نظریں استاد پر ٹکیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹیں کھیل رہی تھیں۔

۔"استاد سننا زرا"۔ مُشتاق کی تیز آواز سُن کر نیم وا آنکھیں کئے جھومتے رفیق استاد نے جیسے ہی آنکھیں وا کیں وہ فوراً ہی بولا:۔ "آج کی خریداری کی ساری رسیدیں اگر دے دیں تو میں اُسے حساب کتاب میں چڑھا لوں"۔ "ہاں کاکا، کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ میٹرے ہوٹل کا منیجڑ ہی نہیں بلکے چیف اکاونٹینٹ اور جنڑل منیجڑ بھی تُو ہی تو ہے"۔ یہ کہتے ہوئے رفیق استاد نے اپنی قمیض کی سامنے والی جیب سے بہت ساری رسیدیں نکال کر مُشتاق کے ہاتھ پر یہ کہتے ہوئے دھر دیں: "ہاں اگڑ کچھ سمجھ نہ آئے تو بیشک جتنی باڑ چاہے پوچھ لینا" ابھی

وہ اتنا ہی بولا تھا کہ وہ گانا ختم ہوا اور رونا لیلیٰ کی آواز ابھری:۔

ہمیں کھو کر بہت پچھتاؤ گے جب ہم نہیں ہوں گے

بھری دنیا کو ویراں پاؤ گے جب ہم نہیں ہوں گے

مُشتاق ساری رسیدوں کو سنبھالتا ہو فوراً وہاں سے کھسک لیا کیونکہ یہ بات اُس سے بہتر بھلا کون جان سکتا تھا کہ اگر جواب وہ استاد کے سامنے ایک لمحہ اور کھڑا رہا تو پھر اُستاد گانے، دھن، شاعری، موسیقی اور اِس میں بجتے ایک ایک ساز کی تعریف میں وہ لیکچر پلائے گا کہ دماغ کی اُوپر نیچے اور آگے پیچھے کی ساری چُولیں ہل کر رہ جائے گیں۔

مُشتاق ایک کونے میں جا کر اپنے حساب کتاب اور گاما باروچی کھانے کے کاموں کا جائزہ لینے میں جُت گیا۔ رفیق استاد کاؤنٹر پر بیٹھا گاہکوں سے وصولیاں کرنے کے ساتھ ایک کے بعد دوسرا گانا جُھومتا جھامتا سنے جا رہا تھا۔ جہاں ایک سی ڈی ختم ہوئی دوسری لوڈ کردی۔ مغرب اور عشاء کی آزانوں کے وقت گیت مالائی سلسلے کو بند کرکے وہ مسجد نماز پڑھنے چلا گیا۔ اُس کی جگہ مُشتاق کاؤنٹر پر آ بیٹھا اور اُس کے واپس آنے کے بعد مُشتاق اور گاما باری باری نماز پڑھ آئے۔

کوئی رات ساڑھے نو کے قریب وہ تینوں کھانا کھانے کے لیئے ایک میز پر آ بیٹھے۔ یہ روز کا معمول تھا۔ وہ رات کا کھانا ساتھ ہوٹل ہی میں کھاتے۔ اُس روز کھانے کی میز پر کچھ ضرورت سے زیادہ ہی خاموشی تھی۔ سب سر جھکائے کھانا کھانے میں مشغول تھے۔ گامے نے میز کے نیچے مُشتاق کے پیر کو اپنے پیر سے چُھوا۔ وہ متوجہ ہوا تو گامے نے آنکھوں سے اشارہ کیا جیسے کہنا چاہ رہا ہو: "استاد سے بات کرو"۔ جواباً اُس نے اپنے سر کو نفی میں ہلایا جیسے کہہ رہا ہو: "نہیں تم بات کرو استاد سے"۔ گامے نے یوں منہ بنایا جیسے کہہ رہا ہو: "تم بس استاد سے ڈرتے ہی رہنا"۔

۔"لئُں کو ایک بات بولنے کا ہے استاد"۔ گاما نے لُقمہ نگلتے ہوئے کہا۔ "ہاں بولو کاکا غفُوڑ کیا بات ہے؟" استاد نے پانی کے جگ سے گلاس بھرتے ہوئے پوچھا۔ "استاد وہ کیا ہے نہ کہ تم ہم دونوں کو اتوار کے اتوار چھٹی دیتا ہے۔ ہم دونوں کو فلمیں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ ویسے سچ پوچھ استاد دل تو اپنا سنے پلیکس جانے کا ہوتا ہے لیکن وہاں کا ٹکٹ اپنی حیثیت سے بہت زیادہ ہے۔ سو میں اور مُشتاق ماما داتا دربار روڈ والے بھاٹی سنیما میں لاسٹ شو دیکھنے چلے جایا کرتے ہیں۔ ماما اور گاما نے سوچا کہ اب کی بار استاد کو بھی ضرور لے کر چلنا ہے۔ مت پوچھ استاد کیا پٹاخہ فلم ریلیز ہوئی ہے۔ ایک

سے بڑھ کر ایک آئٹم سانگ۔ اللہ قسم استاد یقین نہ آئے تو مُشتاق ماے سے پوچھ لے۔ وہ پچھلے ہفتے جو فلم دیکھی تھی۔ واہ کیا لش پش فلم تھی۔ فلم کے آئٹم سانگ نے تو سنیما میں آگ ہی لگا دی تھی۔ سنیما میں بیٹھے سارے منچلے ٹھرکی روپے دو روپے والی ریزگاری اسکرین پر اچھال اچھال کر ہیروین کو داد دے رہے تھے کہ بس مزا ہی آ گیا۔ تو پھر استاد گل مک گئی۔ اب تم بھی اِس اتوار کو ہمارے ساتھ چل رہے ہو"۔ رفیق استاد گامے کی ساری بات خاموش سے ایک ایسی مسکراہٹ کے ساتھ سُنتا رہا جسے کوئی معنی پہنانا بڑا ہی مُشکل تھا۔ جیسے ہی گاما خاموش ہوا اُسے نے اپنی نگاہیں اُس کے چہرے سے ہٹا لیں اور دُور خلاوں میں کہیں گھورنے لگا۔ گاما داد طلب نگاہوں سے مُشتاق کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو کہ: "دیکھا ماے۔۔۔۔۔۔۔! تُو تو ایویں ہی استاد سے ڈر رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔!!!."۔

استاد کے چہرے پر سنجیدگی اور آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی نظر آ رہی تھیں۔

استاد تم نے کوئی جواب نہیں دیا" مُشتاق نے گامے کے بات کرنے کے دوران استاد" کی مسکراہٹ کے پیشِ نظر ہمت پکڑتے ہوِئے سوال کر ہی ڈالا: "کاکا تم لوگ جہاں کہوں گے وہاں چلوں گا" استاد نے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "لیکن ابھی میں تم دونوں کو ایک کہانی سنانے لگا ہوں"۔ "کہانی۔۔۔۔۔! کیسی کہانی استاد۔۔۔۔۔۔ ؟" مُشتاق حیران ہوتے ہوئے بولا: "سوال مت

پوچھو، بس سُنتے جاؤ"۔ "اچھا چلو استاد سناؤ کہانی!" مُشتاق سعادتمندی سے بولا: "اِسی اپنے بھاٹی دڑوازے میں ایک نکا جیاء کاکاڑھا کڑتا تھا"۔ استاد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولنا شروع ہوا: "چھوٹا سا تھا تو اُس کا ابا اللہ کو پیاڑا ہوگیا۔ اُس نکے جئے کاکے کی عمڑ اُس ویلے کوئی چھ سات سال کی ہوگی۔ اُس سے تین چھوٹے بہن بھرااوڑ بھی تھے۔ ماں اُس کی نے لوگوں کے گھڑوں میں کام کاج کرنا شڑوع کڑ دیا لیکن پھڑ بھی گھڑ کا خڑچہ چلانا بہت مُشکل ہوگیا تھا۔ ایک دن اُس کی ماں کا چچیڑا بھائی جسے ساڑے بچے چاچا شوکی چاچا شوکی کہہ کڑ پکاڑتے تھے گھڑ آیا اور کاکے کی ماں سے کچھ کہا۔ جاتے وقت کاکے کا ہاتھ پکڑ کڑ ساتھ ہی لے گیا اور دونوں ایک مزدے میں سواڑ ہو گئے۔

مزدا بہت دیڑ تک چلتا ڑہا۔ شہڑ سے باہڑ نکل کر ویڑان سے عَلاقے میں ایک اشٹاپ پڑ ڑکا تو چاچا شوکی کاکے کو لے کر اُتڑ گیا۔ سڑک پار ایک بہت بڑی جالی داڑ آہنی پھاٹک والی نیچی سی عماڑت تھی جس کا پھاٹک تو بند تھا لیکن باہڑ لوگوں کی ایک بھیڑ جمع تھی جیسے وہ سارے ہی اندڑ جانا چاہتے ہوں۔ چاچا شوکی بھیڑ کو چیڑتا ہوا پھاٹک تک پہنچا۔ چوکیداڑ نے جو شاید اُسے پہچانتا تھا اندڑ جانے دیا۔ عماڑت کے ایک کونے میں چاچا شوکی چائے کی کنٹین چلاتا تھا۔ وہ کاکے کو اُس کی ماں سے کہہ کر مددگاڑ کے طوڑ پڑ کام کڑنے کے لیئے لایا تھا۔ چاچا شوکی ساڑا وقت ایک بڑے پتیلے میں چائے اُبالتا رہتا۔ چھوٹا کاکا ایک دوسرے کاکے کے ساتھ جسے سب بالا بالا کہہ کڑ پکاڑتے اور عمر میں اُس سے کچھ

چار پانچ سال بڑا تھا چائے کو شیشے کے چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں بھر کر لوہے کی ایک جالی جس میں چائے کے گلاسوں کو لٹکانے کے لیے گول گول دائرے بنے ہوتے پھنسا کر عمارت کے اندر بنے بڑے بڑے تاریک کمروں اور دوسری طرف بنے دفاتر میں کام کرتے لوگوں کو چائے پہنچاتا اور پھر تھوڑی دیر بعد واپس جا کر چائے کے خالی گلاس سمیٹ کر واپس لے آتا۔ چند دنوں بعد اُسے پتہ چلا کہ بند پھاٹک والی وہ نیچی عمارت جس کے باہر ہر وقت لوگوں کا ایک جم غفیر ہوتا ہے دراصل لاہور شہر کا مشہور ایورنیو اسٹوڈیو ہے اور وہ بڑے بڑے تاریک کمرے دراصل اسٹودیو کے مختلف شوٹنگ فلور تھے اور دوسری طرف فلم کمپنیوں، فلمسازوں، ہدایت کاروں، کہانی نویسوں اور بڑے بڑے اداکاروں کے دفاتر تھے۔

۔ "ایورنیو اسٹوڈیو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !۔ ارے استاد وہاں تو ایک زمانے میں پاکستانی فلمیں بنا کرتیں تھیں اور اب وہاں ٹی وی ڈراموں کی شوٹنگ ہوتی ہے۔ کبھی کبھار اکا دکا فلموں کی بھی شوٹنگ ہو جایا کرتی ہے۔ میں اور گاما ایک بار جا چکے ہیں وہاں۔ وہ تو یہاں سے بہت دور ملتان روڈ پر ہے"۔ مُشتاق سے رہا نہ گیا اور وہ بول ہی پڑا۔

۔ "ہاں کاکا وہی ایورنیو اسٹوڈیو"۔ رفیق استاد کی آواز کسی کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔

ایک روز وہ چاچا شوکی کے ساتھ کھڑا چائے بنا رہا تھا۔ ایک "

آدمی آیا اور چاچا کو ٹریکارڈنگ اسٹوڈیو میں جہاں کسی گانے کی ٹریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ بہت سارے لوگوں کے لیئے چائے بھجوانے کا آرڈر دیا۔ شوکی چاچا نے فٹافٹ چائے کے گلاس بھر کر جالیوں میں چڑھائے، کاکے اور بالے کو دے کر فوراً ریکارڈنگ اسٹوڈیو لے جانے کو کہا۔ کاکے کے لیئے یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ کسی ایسے وقت میں ٹریکارڈنگ اسٹوڈیو جا رہا تھا کہ جب وہاں فلمی گانے کی ٹریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ وہ وہاں پہنچے تو اسٹوڈیو میں بے شمار سازندے جمع تھے۔ ایک میز پر سنتُور سجا ہوا تھا اور ایک سنتُور نواز مضراب مصراب] سے جو اُس کے ہاتھوں کی شہادت اور درمیانی انگلیوں کے بیچ ایسے دبا ہوا تھا] جسے سگریٹ دبایا جاتا ہے۔ انگلیوں کی پشت سے مضراب کا جو حصہ باہر نکل رہا تھا اُس پر اپنا انگوٹھا رکھے تاروں کو چھیڑ چھیڑ کر اُس کے سُروں کو جانچ رہا تھا۔ ایک طرف ستار نواز ایک بہت بڑے ستار کی مختلیف کَلیں گھما کر تاریں کستا جاتا اور انگلیوں میں پہنے ہوئے مثلث نما آہنی چھلے "زخمہ" سے تنی ہوئی تاروں کے سُروں اور آہنگ کا اندازہ لگا رہا تھا۔ ایک طرف طبلچی طبلوں کی جوڑی لے کر فرشی نشست پر براجمان تھا۔ دائیں جانب تین چار قطاروں میں کئی وائلن نواز کرسیوں پر بیٹھے دھیرے دھیرے اپنے سازوں کو چھیڑ رہے تھے۔ ان کے ساتھ ہی ایک بہت ہی بڑا پیانو رکھا ہوا تھا۔ ان سب کا جائزہ لینے کے بعد کاکے کی نظریں کمرے کے ایک کونے میں چبوترے پر پڑی جہاں دو لوگ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک دبلا پتلا لمبا سا سنوالا خُوش شکل اور خوش

لباس جوان شخص جو سفید پتلون قمیض میں ملبوس تھا اور جوتے بھی سفید ہی پہن رکھے تھے۔ اُس کے سامنے ایک ہارمونیم رکھا تھا اور ہارمونیم پر رکھے کاغذ میں سے کچھ پڑھ پڑھ کرایک ہاتھ سے ہارمونیم کو ہلاتا اور دوسرے ہاتھ سے ہارمونیم بجاتا جارہا تھا۔ ساتھ ہی ایک بہت ہی بارعب سی شخصیت براجمان تھی۔ اُس کے چہرے کا وقار گواہی دے رہا تھا کہ وہ کوئی بڑا مہان فنکار ہے۔ سفید شلوار قمیض پر کالی سیاہ بند گلے والی کوٹی جس پر سیاہ شال کی بُکل ماری ہوئی تھی۔ ہارمونیم کی لے پر کچھ گنگنا رہا تھا۔

ابھی کاکا اس سارے منظر کے جادو میں کھویا ہوا تھا کہ اُسے کسی نے کاندھے سے پکڑا کر جنجھوڑا۔ کاکے نے مڑ کر دیکھا تو بالا کھڑا تھا:۔ "باشاھو کی سوچدے پئے او" بالا مسکراتے ہوئے بولا۔ "ارے تمھارے چائے کے سارے گلاس تو ویسے کے ویسے ہی پڑے ہیں۔ دیکھ کیا رہے ہو۔ جاو سامنے خان صاحب اور دادا کو چائے دے آو"۔

۔" کون خان صاحب اور کس کا دادا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟" کاکا حیران ہوتا ہوا بولا۔

ابے وہ سامنے دیکھ تجھے خان صاحب مہدی حسن خان اور دادا روبن گھوش نظر نہیں آ رہے کیا؟" بالے نے اُن دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "م م م مہد مہدی حسن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!" مارے حیرت کے کاکا اتنا ہی کہہ سکا۔ مہدی حسن کو اُس نے دیکھا بھلے ہی نہ ہو لیکن وہ اچھی طرح سے اُنہیں جانتا تھا۔ جب اُس کا ابا زندہ تھا اور ریڈیو پر اُن کا گانا آتا

تو ابا گانا سنتے وقت ہمیشہ واہ مہدی حسن واہ کہا کرتا اور خود اُسے بھی مہدی حسن کی آواز بہت بھلی لگتی تھی۔ ان کے گھر کے پاس ماجھے حلوائی کی دکان پڑ بھی ساڑے وقت یا تو ملکہ ترنم نوڑجہاں کے گانے بجتے یا پھڑ مہدی حسن کے"۔

۔"ماجھا حلوائی۔۔۔۔۔۔۔؟" گامے کا منہ حیرت سے کھلا۔" ہاں تم کیا جانو ماجھے حلوائی کو۔ بھئی وہ اپنے ہوٹل کے ساتھ ہی ساجھے حلوائی کی جو دکان ہے نا جہاں سے ساڑے دن نحُوست ماڑے واہیات گانوں کی صدائیں بلند ہوتیں ہیں، ماجھا پہلوان اُس کا ابا تھا جو شاید تم دونوں کے پیدا ہونے سے بھی پہلے اللہ کو پیاڑا ہوگیا۔ اب اُس کا بیٹا ساجھا پہلوان دن پھڑ واہیات گانے چلا چلا کر محلے کے بچوں کا اخلاق.برباد کڑ رہا ہے" استاد بولتا چلا گیا۔ "اب استاد ایسا تو نہ کہو اُس کی وجہ سے محلے میں کسی رونق لگی رہتی ہے اور یہ تو نئے زمانے کی موسیقی ہے۔ نہ رہے وہ مہدی حسن اور نورجہاں اور نہ ہی رہی اُن کے اور تمھارے زمانے کی موسیقی" مُشتاق ماجھے پہلوان کی حمایت کرتے ہوئے بولا۔ "بہت افسوس ہوا تمھارے منہ سے یہ سن کر۔ سن لو یہ وہ لوگ ہیں جو نہ بھلائے گئے ہیں اور نہ ہی بھلائے جائیں گے۔ ہاں البتہ تمھاری یہ نئے دوڑ کی موسیقی اور اُس کی عمر دو دن سے ذیادہ کی نہیں" استاد کی آواز میں جوش تھا۔ "تُو جانتا ہے مُشتاق ہے میں نے تجھے فلم اور ٹی وی کے مضمون میں

گریجویشن کرنے کے لیئے ہی کالج میں کیوں داخل کروایا ہے؟" "ہاں استاد اِس لئے کہ مجھے اس شعبے میں جانے کا بہت شوق تھا" مُشتاق مسکراتا ہوا بولا۔ "ہاں شُوق والی بات تو دُرست ہے تیری۔ پر ایک بات اور بھی ہے۔ چل تو یوں سمجھ لے کہ جو کام مہدی حسن اور ملکہ ترنم نورجہاں مرحومین کر گئے ہیں نہ وہ خود بھی ہمیشہ زندہ رہے گا اور اُن کو بھی سدا زندہ رکھے گا۔ ہمارے کام کی عمر جانتا ہے کتنی ہے؟ اُس کام کی عمر ہر رات ہوٹل کے بند ہونے پر دروازے پر تالا لگتے ہی پوری ہو جاتی ہے اور پھر اگلے روز جب صبح غفُور تالا کھولتا ہے نہ تو ہر روز کی طریوں ایک نیاء کھاتہ کھلتا ہے اور رات کو پھر ہمیشہ کی طریوں تمام ہو جاتا ہے۔ اصل کام تو یہ بس لوگ کر گئے ہیں۔ اُن کا ہر روز کا کیا کام ہمیشہ زندہ رہ کر ان کو بھی لازوال کر گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کاکا کہ تُو بھی کچھ ایسا کام کرے جس کی عمر سورے شروع ہو کر رات ہی کو ختم نہ ہو جائے" استاد کی نظریں تو مُشتاق کے چہرے پر گڑی تھیں لیکن دیکھ وہ کسی اور ہی دنیا میں رہی تھیں۔

۔ "ارے استاد کاکے کی کہانی کو تو آگے بڑھاؤ"۔ گامے نے معاملہ بگڑتے دیکھ کر بات کا رُخ بدلنے کی کوشش کرتے ہوِئے کہا۔ "ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ کاکا لرزتے قدموں سے آگے بڑھا اور اُس نے خان صاحب کو کانپتے ہاتھوں سے چائے کا گلاس پیش کیا۔ اگلا گلاس اُس نے روبن دادا کے سامنے پیش کیا۔ اُسے

ٹروبن دادا کی شخصیت اور اُن کا پہناوا بہت بھلا معلوم ہوا۔ گانے کی ٹریکارڈنگ کے دوران کاکا کئی بار چائے لے کر اسٹوڈیو گیا۔ جب وہ آخری بار چائے کے گلاس سمیٹنے آیا تو عین اُس وقت گانے کی ٹریکارڈنگ شروع ہوئی۔ وہ سب کی نظروں سے بچتا بچاتا ایک کونے میں ستون کے پیچھے سکڑ سمٹ کر کھڑا ہوگیا۔ چھوٹا سا تو تھا وہ۔ کسی کی اُس پر نظر نہ پڑی۔ تمام سازندے دم سادھے ہوئے تھے۔ مہدی حسن مائیک کے سامنے اپنے کانوں پر بڑے بڑے ایئر فون لگائے تیار کھڑے تھے۔ سازندوں کے عین سامنے ٹروبن دادا اپنے ہاتھوں کو ہوا میں بلند کرکے بالکل تیار اپنی نگاہیں اُن پر ہی جمائے ہوئے تھے۔

ٹروبن دادا نے اپنا ہاتھ گھما کر سنتُور نواز کو اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی اُس نے مضراب سے اپنے ساز کو چھیڑ دیا۔

پہلے سنتُور اور اُس کے ساتھ ہی جلترنگ کی تانیں اُبھریں اور ٹھہریں۔ پھر پیانو کا انگ ابھرا اور تھما تو مہدی حسن خان صاحب نے اپنی جادو بھری آواز میں دو بول کہے:۔

ے "پیار بھرے۔۔۔۔۔۔۔۔۔!"۔

بولوں کے درمیان ایک لمحے کا وقفہ آیا۔ پھر پیانو کی دو تانوں کے ساتھ خان

صاحب نے اگلے بول گائے اور ہمراہ طبلے کی سنگت کا آغاز ہوا۔ پیانو اور طبلے کا ساتھ بانسری بجنے لگی:۔

۔دو شرمیلے نین

جن سے ملا میرے دل کو چین

کوئی جانے نہ کیوں مجھ سے شرمائیں

کیسے مجھے تڑپائیں

پیار بھرے دو شرمیلے نین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!!"۔

۔"ارے استاد یہ تو ہی گانا ہے جو تم ہوٹل میں بجاتے ہو"۔گاما چلا کر بولا۔ ہاں یہ وہی گیت ہے۔ اُس روز وہ گیت تو رُوبن دادا نے ٹریکارڈ کر لیا لیکن وہ گانا اس ننکے جنۓ کا کے کے دل ودماغ میں بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے ٹریکارڈ ہوگیا استاد دور کہیں خلاؤں میں گھورتا ہوا ڈوبتی آواز میں بولا۔

۔"استاد کہیں وہ کاکے تم ہی تو نہیں"۔مُشتاق شرارت بھرے لہجے میں بولا۔ "اور وہ تصویر جو قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ اور علامہ اقبالؒ کی تصویروں کے نیچے لگی ہے وہ کہیں روبن گھوش ہی کی تو نہیں"۔ ایک ٹھنڈی آہ نما سانس کے بعد انتہائی ٹھہرے ہوئے لہجے میں استاد کی آواز سنائی دی: "ہاں وہ کاکا میں ہی تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!۔ اور وہ تصویر رُوبن داد ہی کی ہے۔۔۔۔

۔۔۔۔!!!. آج میں سوچتا ہوں کہ اگر شوکی چاچا مجھے اُس روز اپنے ساتھ نہ لے گیا ہوتا تو شاید میں یہ نہ ہوتا جو آج ہوں"۔ "وہ کیسے؟" مُشتاق کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "اُس روز دادا روبن گھوش کے گانے کی ریکارڈنگ نے میرے اندر موسیقی سے ایک عجب سا لگاؤ پیدا کر دیا۔ یہ لگاؤ وہ نہیں تھا جو ایک گانے یا ساز بجانے والے کو موسیقی سے ہوتا ہے۔ یہ وہ لگاؤ تھا جو ایک موسیقی کے چاہنے والے کو موسیقی سے ہوتا ہے۔ لیکن یہ ایک خاص لگاؤ تھا۔ اب میں اسٹوڈیو میں ریکارڈ ہونے والے فلمی گانوں پر اپنی خاص توجہ دینا شروع کر دی۔ بطورِ خاص میں اِس ٹو میں رہتا کہ روبن دادا کی ریہرسل یا ریکارڈنگ کب ہے۔ میں پوری کوشش کر کے اُس دوران اسٹوڈیو کے اندر ہی گھسا رہتا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ روبن دادا کے گانے مجھ پر ایک خاص اثر کرتے۔ مجھے ایسا لگتا کہ جیسے اُن کی بنائی ہوئی دھنیں میری روح کی تاروں کو چھیڑ جاتیں ہیں۔ مجھ پر ایک جادو سا طاری کر دیتی۔ شاید روبن دادا کی موسیقی کی فریکیونسی میری رُوح کی فریکیونسی سے میچ کرتی ہے"۔

۔"شوکی چاچا کے ساتھ کام کرتے کرتے مجھے تقریباً چھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ میں جو بھی تھوڑا بہت کما لیتا وہ اپنی ماں کے ہاتھ پر دھر دیتا اور وہ اپنے کماؤ پوت کی کمائی کو اپنے دوپٹے کے پلو میں باندھ کر مجھے جھولیاں بھر بھر دعائیں دیتی۔" اتنا کہہ کر استاد جیسے ہی سانس لینے کو رکا

تو مُشتاق جیسے اِسی موقعے کی تلاش میں ہو یکدم بول پڑا: "اور پڑھائی؟"۔
مُشتاق کے سوال پر استاد کے چہرے پر ایک ہلکا سا تبسم آیا۔ "جب میرا ابا فوت ہوا تو میں محلے ہی کے ایک سرکاری سکول میں دوسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ وہ گھر میں جہاں ہم رہتے تھے میرے ابا کے باپ دادا کی نشانی تھی کے سواء میری اماں کے پاس اور کچھ بھی نہ تھا۔ اُس نماری نے ہم چار بہن بھائیوں کا پیٹ بھرنے کے لیئے ادھر اُدھر گھروں میں کام کرنا شروع کر دیا تھا لیکن دونوں کی ساری کمائی ملا کر بھی اتنے پیسے کٹھے نہ ہو پاتے کہ وہ ہم بہن بھائیوں کو نئے کپڑے ہی خرید کر دے سکتی تو بھلا پڑھائی کا خرچہ کہاں سے اٹھاتی۔ میں دن بھر اسٹوڈیو کے فلوروں میں بھاگ بھاگ کر فنکاروں، ٹیکنیشنوں، پروڈکشن ورکروں، سینیر و جونیئر آرٹسٹوں، ایکسٹرا فنکاروں، فلمی کہانی نویسوں اور فلم کمپنیوں کے لوگوں کو چائے کے گرما گرم گلاس پہنچاتا۔ وہاں سب میرا ایسا خیال رکھنے لگے جیسے کوئی چائے لانے والا لڑکا نہیں بلکہ اُن ہی میں جیسا کوئی فنکار یا فلم انڈسٹری سے وابستہ کوئی کارکن ہو۔ موسیقی اور خاص طور پر روبن دادا کے ساتھ خاص لگاو کو دیکھ کر لوگ مجھے چھوٹا روبن چھوٹا روبن کہہ کر پکارنے لگے"۔
۔"وقت گزرتا رہا۔ مجھے اسٹوڈیو میں کام کرتے کوئی چھ ایک برس کا عرصہ گزر

چکا تھا اور میری عمر کوئی بارہ تیرا سال کی ہو گئی۔ ایک روز مجھے بالے نے بتایا کہ آج شام روبن دادا کے ایک نئے گیت کی ریکارڈنگ ہونے والی ہے۔ ہم دونوں میں یہ بات شروع ہی سے طے تھی کہ وہ مجھے ریکارڈنگ اسٹوڈیوز جانے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرے گا۔ جب کوئی گانا ریکارڈ ہوتا تو فلمسازوں اور ہدایت کاروں کی جانب سے شوکی چاچا کو خاص ہدایت ہوتی کہ تمام سازندوں، گلوکاروں اور موسیقار کو طلب کیئے جانے سے پہلے ہی چائے وغیرہ ملتی رہنی چاہیے تاکہ وہ تازہ دم رہیں اور گانے کی بہترین ریکارڈنگ ہو۔ شام کو ریکارڈنگ شروع ہوئی تو اسٹوڈیو میں خوب گھما گھمی نظر آنے لگی۔ سازندے انہماک کے ساتھ اپنے اپنے سازوں کو تیار کر رہے تھے۔ پھر فائنل ریہرسل کا آغاز ہوا۔ وہ گانا اخلاق احمد مرحوم گا رہے تھے۔ میں دوسری بار جب چائے کے گلاس کٹھے کرنے گیا تو فائنل ریہرسلز کا آغاز ہوچکا تھا۔ میں نے ایک بڑے ستون کے پیچھے اپنا مخصوص کونہ پکڑ لیا اور وہاں آرام سے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ سارا گیت کئی کئی بار تمام سازندوں کی سنگت میں ریہرس کیا گیا۔ میں اُس گانے کے بولوں اور دھن میں کچھ ایسا مگن ہوا کہ مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں اُس وقت ریکارڈنگ اسٹوڈیو میں نہیں بیٹھا بلکہ بادلوں میں گھوم رہا ہوں۔ اُس گانا کا ایک ایک بول میرے دل و دماغ پر سمجھو جیسے نقش ہوتا جا رہا تھا۔ پھر نہ معلوم کب میں گانا سُنتے سُنتے وہیں سو گیا۔ آنکھ کھلی تو گانا تو کب کا ریکارڈ بھی ہوچکا تھا۔ سارے سازندے بھی جا چکے تھے۔ ریکارڈنگ

انجینیئر اور اُس کے عملے کا اکا دکا کارندہ اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ وہ میرا ایورنیو اسٹوڈیو میں آخری دن تھا کیونکہ شوکی چاچا نے اپنی چائے کی کنٹین کسی اور کے ہاتھ بہت اچھے داموں میں فروخت کردی تھی جس کا مجھے اُس رات ہی پتہ چلا"۔

۔"استاد تو پھر تم اُس کے بعد کبھی اسٹوڈیو گئے اور روبن دادا سے ملے؟"۔ مُشتاق نے بے چینی سے سوال کیا۔ "اسٹوڈیو تو میں اُس دن کے بعد پھر کبھی نہیں گیا لیکن روبن دادا سے تو ہر روز ہر وقت ملتا تھا اور آج بھی ملتا ہوں۔ اُن کے گیتوں کے زریعہ۔

بحر حال اب اماں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ میری آمدنی بند ہو جانے سے اُسے گھر کا خرچ چلانے میں بڑی دقت ہوگی۔ میں تھا تو اُس وقت صرف بارہ تیرہ سال کا۔ لیکن ہم جیسے بچوں پر نہ بچپن آتا ہے نہ ہی لڑکپن۔ ہوش سنبھالتے ہی جوان ہو جاتے ہیں۔ میں نے اماں کو سمجھایا کہ تُو اتنی مزیدار ہانڈیاں پکا لیتی ہے۔ اگر ہمارے گھر کی نچلی منزل کو ہوٹل میں تبدیل کر دیا جائے تو اِس سے اچھا اور کوئی کام ہو ہی نہیں ہو سکتا۔ اُوپر والی منزل کے دو کمروں میں سارا ٹبر رہ لے گا۔ اماں بولی: "رفیق پتر۔۔۔۔ ! بات تو تُو نے بہت عقلمندی والی کی ہے لیکن ہوٹل کھولنے، کرسیاں، میزیں، برتن بھانڈے، چائے کی پیالیوں، رکابیوں چُھری چمچوں کی خریداری کے لئے تو بڑا روپیہ چاہیے وہ کہاں سے آئے گا؟"۔ میں نے کہا: "اماں شوکی چاچا نے اپنی

کنڈیشن بڑے اچھے داموں فروخت کی ہے اگر وہ اِس وقت ہماری کچھ مدد کر دے تو ہمارا کام ہو سکتا ہے"۔ میری بات اماں کے دل کو لگی اور اللہ کی مہربانی کہ اُس نے شوکی چاچا کے دل میں نیکی ڈال دی اور وہ اتنی رقم ادھار پر دینے کو راضی ہو گیا کہ جس سے ہوٹل کے کام چلاؤ قسم کے سامان کا بندوبست تو ہو ہی گیا۔ اللہ کا نام لے کر ہم ماں بیٹے نے ہوٹل کا آغاز کیا۔ شروع شروع کے چند ماہ تو بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن میرے دل و دماغ پر روبن دادا کے اُس آخری دن والے گانے کے بول کسی تعویز کی طرح سے نقش ہو چکے تھے:۔

ے سماں وہ خاب سا سماں

ملے تھے دل سے دل جہاں

کہاں لے کے چلا

مجھے یہ دل میرا

وہ دن کبھی تو آئیں گے

مجھے گلے لگائیں گے

کبھی آتے ہوئے، کہیں آتے ہوئے

ہم انہی راہوں میں مل جائیں گے

بس میں دن رات اللہ میاں سے پانچ وقت کی نماز پڑھ کر خوب دعائیں مانگتا اور

سارا دن اور رات دیر گئے تک ہوٹل کے کاموں میں جت کر بس یہ گیت گنگناتا رہتا۔ مجھے ایسا لگتا کہ جیسے یہ گیت تو دادا نے بنایا ہی میرے لئے تھا۔ مجھے اللہ تعالی کی ذاتِ بابرکت سے کامل امید تھی کہ انشاءاللہ وہ دن ضرور آئیں گے جو خود آگے بڑھ کر مجھے گلے لگائیں گے اور اللہ نے چاہا تو مجھے محنت و مشقت کی انہی راہوں پر چلتے ہوئے ایک نہ ایک اپنے سہانے خوابوں کی منزل ضرور مل جائے گی۔ اللہ پاک کا بڑا کرم ہے مجھ ناچیز پر کہ اُس نے میرے سارے خوابوں کو پورا کیا۔ میرا ہوٹل بھی چلا اور میں نے پرائیوٹ ہی سہی لیکن بی اے تک تعلیم بھی حاصل کی۔ اپنے بہن بھائیوں کو پڑھایا لکھایا، اُن کی شادیاں کیں۔ ماشاءاللہ سے آج میں بال بچے دار ہوں اور تم دونوں بھی میرے بچوں جیسے ہی ہو۔ آج اللہ سوہنے کے کرم سے میرے ہوٹل کا شمار بھاٹی کے چند اچھے ہوٹلوں میں ہوتا ہے"۔

استاد کی آنکھوں میں تیرتی نمی کو صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ کچھ دیر وہ تینوں یوں گم سم و خاموش رہے جیسے سوچ رہے ہوں کہ بات کہاں سے اور کون شروع کرے۔ اچانک گامے کو جیسے ہوش آگیا ہو۔ اپنی آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولا: "واہ استاد واہ! تمھارا بھی جواب نہیں۔ تم نے ہم کو خُوب اپنی کہانی میں لگا لیا۔ بھلا یہ کون سا وقت تھا اپنی داستان ہمیں سنانے کا۔ اتنے سالوں تک تو کبھی سنانے کا خیال نہیں آیا اور آج کچھ یوں سنائی ہے کہ لگتا ہے کہ ہم نے سنی نہیں

دیکھی ہو"۔ "کاکا غفور۔۔۔۔! یہ ہی تو دُرست ویلہ تھا اِس کہانی کو سنانے کا اوڑ اِس سے بہتڑ اوڑ کوئی موقعہ کون سا ہو سکتا ہے"۔ "استاد اب یہ بُجھارتے بُوجھنا بند کرو اور صاف صاف بتاو کہنا کیا چاہتے ہو؟"۔ مُشتاق استاد کی نم آلود آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔ "میں ابھی سب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کئے دیتا ہوں لیکن اُس سے پہلے تم دونوں میڑے ایک سوال کا جواب دو۔ کون مجھے یہ بتائے گا کہ شہڑِ لاہوڑ کے کُل کتنے دڑوازے ہیں؟" مُشتاق اور گامے نے ایک لمحے کے لیئے سوچا کہ استاد کی طعبیت تو ٹھیک ہے۔ بھلا اس عجیب سے سوال کا اُس کہانی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ گامے سے جب رہا نہ گیا تو وہ بول پڑا: "استاد بھلا لاہور کے دروازوں سے تمھاری اس رام کتھا کا کیا واسطہ؟"۔ "تم اس بات کو چھوڑو اور بس میڑے سوال کا جواب دو"۔ استاد رفیق کا چہرہ اور لہجہ دونوں ہی گھمبھیرتا سے لبریز تھے۔ "دس" گامے نے ہانک لگائی۔ "نہیں استاد دس نہیں اس گامے کو کیا پتہ۔ کوئی پندرہ کے قریب ہیں، کیوں استاد؟"۔ مُشتاق اندازہ لگتے لہجے میں بولا۔ "نا دس نا پندڑہ۔ ہیں تو پوڑے تیڑا دڑوازے لیکن کہا یوں جاتا ہے کہ باڑہ دڑوازے اور تیڑویں مُوڑی"۔ لیکن استاد آخر یہ دروازوے بھلا ہماری بات میں کہاں سے بیچ میں آ گئے؟"۔ اب تو مُشتاق سے بھی رہا نہ گیا تو وہ بھی مارے حیرت کے پوچھ ہی بیٹھا۔ "بہت گہڑا تعلق ہے"۔ استاد کے چہرے پر ایک عجب پُراسرار سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ "یہ سارے دڑوازے صڑف دڑوازے نہیں یہ لاہوڑ شہڑ کی پہچان ہیں۔ یہ لاہوڑ

شہر کا دل ہیں، اُس کی رُوح ہیں اور سچ پوچھوں تو یہ دروازے لاہور شہر کی اصل ثقافت ہیں۔ اپنے اِسی بھاٹی دروازے میں علامہ اقبال دورانِ تحصیلِ علم "اقبال منزل" میں رہا کرتے تھے۔ مولانا حالی جب پانی پت سے لاہور آیا کرتے تو اُن کا قیام بھی بھاٹی دروازے میں ہی ہوا کرتا تھا۔ مغلیہ دور کی یادگار عمارتیں جو اب ہر گزرتے دن کے ساتھ مٹی کا ڈھیر بنتی جا رہی ہیں۔ شاید تمھیں معلوم نہ ہو کہ محمد رفیع جیسا عظیم فنکار بھی ہمارے بھاٹی گیٹ ہی کا رہائشی تھا۔ بچپن میں جب چھوٹا کاکا تھا تو جب بھی وقت ملتا تو میں پیدل ہی لاہور شہر کے ان سارے دروازوں کی سیر کو نکل پڑتا۔ پاویں کسی پاسے نکل جاو، ہماری تہذیب اور ثقافت ہی ثقافت دکھائی دیتی تھی۔ جس گلی، کوچے یا چوبارے وچ لنگ جاو تسی بس موجاں ہی موجاں۔ اک پاسے ملکہِ ترنم نورجہاں کی آواز سنائی دے رہی ہے تے دوجے پاسے مہدی حسن کے گلے کا بھگوان بولتا سنائی دیتا۔ لاہور شہر کے ان دروازوں میں شاید ہی کوئی ایسا گلی کوچہ ہو جہاں ان کی آوازیں سنائی نہ دے۔ مگر آج وہاں سے گزرو تو ہر گلی میں کوئی نہ کوئی فاحشہ یا تو اپنی ہلاکت جوانی کی دھائی دیتی سنائی دے گی۔ کوئی سرِعام اپنے جگر سے بیڑی سلگانے کی دعوت گناہ دیتی ملے گی۔ کوئی منی لوگوں کو اپنی بدنامی کا چرچہ کرتی۔ کوئی انارکلی ڈسکو جاتی ملے گی۔ کوئی جلیبی بائی شرم وحیا کی جلیبیاں تلتی سنائی دے گی اور کوئی رضیہ غنڈوں میں پھنسی واویلا کر رہی ہو گی"۔

استاد ایک لمحے کے لیئے رکا۔ ایک گہری سانس لے کر دونوں کی آنکھوں میں غور سے جھانکتے ہوئے بولا: "سچ پوچھو تو غنڈوں میں ڑضیہ نہیں پھنسی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ! غنڈوں میں تو ہم، ہماڑی ساڑی قوم، ہماڑی ثقافت، ہماڑی نئی نسل، اُن کا مستقبل اور آنے والے نسلیں سڑ سے پاؤں تک پھنس گئی ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ! اور اِسی ہلکٹ جوانی والی جگڑ سے بیڑی جلانے کی دعوتِ گناہ دیتی منی، انارکلی، جلیبی بائی اور ڑضیہ کو چاڑہ بناکڑ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پھنسایا گیا ہے اور مسلسل پھنسایا جاڑہا ہے"۔

۔"استاد تم بھی نہ بات کا بتنگڑ بنانے کے ماہڑ ہو"۔ گاما منہ بناتے ہوئے بولا۔ "استاد تم نے سنا نہیں اب تو فاصلے دور ہورہے ہیں اور دوستیاں بڑھ رہی ہیں جسے امن کی آشا کا نام دیا جارہا ہے اور تم ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے لیکر بس بال کی کھال ہی اتارے جارے ہو"۔

۔"امن دوستی اور خوشگواڑ تعلقات سب بہت اچھی باتیں ہیں لیکن امن، دوستی اور تعلقات کی آڑ میں یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے ہمارے لیئے اچھا ثابت نہ ہوگا۔ کہیں سے آلو، ٹماٹر، پیاز، ادڑھک، مڑچیں، چینی، دال اور چاول وغیرہ درآمد یا برآمد کرلینااور بات ہے لیکن ثقافت کے نام پر اُوچھا پن اور گھٹیا

بازاری قدروں۔ موسیقی کے نام پر اخلاق باختہ اور شرم وحیا سے عاری اقدار کو پہلے تفریح کے نام پر منگوانا اور پھر اُسے معاشرے میں سمونا اور رچانا ایک دوسری بات ہے۔ اگر یہ سب اتنا ہی اچھا ہوتا تو حضرت علامہ محمد اقبالؒ جیسے عظیم مُفکر کبھی الگ ملک کا مطالبہ نہ کرتے اور قائدِاعظم محمد علی جناحؒ جیسے دُوراندیش انسان کبھی حضرت علامہ محمد اقبالؒ کے دیکھے خواب کو سچ بنانے کے پیچھے ٹی بی کے موضی مرض میں مبتلا ہو کر اپنی جان اُس ملک پر یونہی نچھاور نہ کرتے"۔

۔"لیکن استاد یہ اب نیاء دور، نیاء زمانہ ہے۔ اس نئے زمانے میں آپ کے زمانے کا سنگیت تو چلنے سے رہا"۔ مُشتاق نے وکیلوں کے انداز میں اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

نئے دوڑ کا سنگیت" استاد کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔ تم جسے سنگیت کہہ رہے ہو وہ تو" سنگیت کے پاؤں کی جوتی کہلانے کے بھی لائق نہیں۔ موسیقی کو تو رُوح کی غذا کہا جاتا ہے۔ جب رُوحوں کو ایسی شیطانی غذا ملے گی تو پھر معاشرے میں ایسی ہی سیاہ شیطانی اقدار جنم لے گیں اور وہی سب کچھ ہوگا جو آج ہمارے یہاں ہو رہا ہے۔ چلو یہ ہی دیکھ لو کہ ہمارے دوڑ کی موسیقی سُن کر دل ودماغ میں پاکیزگی بھر آتی تھی۔ میری زندگی کی کہانی میں نے تم لوگوں کو اسی لئے سنائی تھی۔ تم پوچھ رہے تھے نہ کہ اُس کا ان سب باتوں سے کیا تعلق ہے۔ میرے جیسے انسان جسے سوائے اللہ کے کسی کا بھی آسرا نہ تھا اس

کو حوصلہ موسیقی نے ہی دیا اور آگے بڑھنے کا راستہ دکھایا۔ جیسا سنو، پڑھوں اوڑ دیکھو گے ویسے خیالات تمھارے زہن میں جنم لے گے۔ تمھارے دور کی یہ مادر پدر آزاد موسیقی سوائے شیطانی جذبات کو بھڑکانے کے علاوہ اور کر ہی کیا سکتی ہے؟ دیکھ لو کہ ہماڑے دوڑ میں اِس نئے دوڑ میں کتنا فڑق ہے"۔ پھر استاد ایک لمحے کے لیئے رکا اور غفوُر کی طرف دیکھتا ہوا بولا:۔ " تم کہہ ڑہے تھے نہ کہ استاد ہماڑے ساتھ آئٹم سانگ والی فلم دیکھنے چلو۔ میں اب بھی تمھاڑے ساتھ چلنے کو تیاڑ ہوں لیکن مجھے تم صڑف اتنا بتاؤ کہ کیا تم وہ فلم اپنی ماں بہنوں کو بھی دیکھنے کی دعوت اُسی طرح سے دے سکتے ہو جیسے تم مجھے دے ڑہے تھے۔ ناقی ڑہی یہ بات کہ وہاں آیٹم سانگ پر سنیما میں آگ لگ جاتی ہے اور لوگ سکرین پر ناچتی گاتی ہیڑوین پڑ نزگاڑیاں اچھلاتے ہیں تو شاہی محلے میں بھی یہ ہی کچھ ہوتا ہے۔ تم لوگوں نے تو ان کے بیچ کا فڑق ہی مکا دیا ہے"۔
اتنا کہہ کر استاد اپنی کرسی سے تھوڑا سا اٹھ کر مُشتاق پر جھک گیا اور اُس کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال کر بولا: "مُشتاق مجھے حیڑت تو تم پڑ ہے۔ تم فلم اور ٹی وی کے شُعبے میں نیشنل کالج آف آڑٹس سے گڑیجویشن کڑنا چاہتے ہو تاکہ آگے چل کڑ فلم یا ٹی وی کے شُعبے میں جا کڑ اپنا نام بنا سکو۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تمھیں اپنی فلموں، اپنی موسیقی، اپنی ثقافت، اپنے

فنکاروں اور اداکاروں کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ اور تو اور تم یہ تک نہیں جانتے کہ لاہور شہر کے کُل دروازے کتنے ہیں۔ میرے پیچھے دھڑلے سے ہلکٹ جوانی جیسے گھٹیا گانے سُنتے ہو۔ اتوار کی اتوار واہیات آئٹم سانگ والی گھٹیا فلمیں دیکھنے جاتے ہو۔ کیسے اس شُعبے میں جاکر کوئی ایسا کام کرنے کے لائق بن سکوگے جس سے پتہ چل سکے کہ یہ کسی پاکستانی تخلیقکار کی پاکستانی تخلیق ہے۔ اپنے نام کو روشن کرنے کی فکر چھوڑ کر پاکستان کا نام اور اُس کی ثقافت کو اونچا کرنے کی فکر میں لگ جاؤ۔ پاکستان کے صدقے تمھارا نام آپو آپ روشن ہوجائے گا"۔

اتنا کہہ کر استاد میز سے اٹھ کھڑا ہوا اور کاونٹر کی طرف چل پڑا۔ مُشتاق گامے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور سی ڈی نکال کر کاونٹر کی طرف چل پڑا۔ استاد کے عین سامنے جا کر سی ڈی اپنے ہاتھوں سے دو ٹکڑے کرکے کاؤنٹر پر رکھ دی اور بولا:۔ "استاد کیا اِس اتوار والے دن مجھے اور گامے کو ایورنیو اسٹوڈیو لے جا کر وہ والا ریکارڈنگ اسٹودیو دکھا سکتے ہو جہاں تمھارا روبن دادا اپنے وہ شہاکار گیت ریکارڈ کیا کرتا تھا۔ جسے سُن سُن کر میرا رفیق استاد ایک کامیاب انسان تو بنا ہی لیکن آج مجھ جیسے ایک بے آسر یتیم کے سر کا آسرا بھی بنا ہوا ہے۔ وہ تمھارا دادا روبن گھوش تھا اور تم ہمارے روبن گھوش ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!، بھائی گیٹ کے روبن گھوش۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!!۔

پلٹنا جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا

ایک دوست ہیں ہمارے۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ وہ کسی کا بھی چہرہ دیکھ کر اُس کی اصلیت جان سکتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔!۔

صاحب، یہ ہمارے دوست کا دعویٰ ہے، ہمارا نہیں۔ کیونکہ ہمارا حال تو یہ ہے کہ خود اپنا چہرہ دیکھ کر بھی اپنی اصلیت نہیں جان سکتے تو بھلا کسی اور کی کیا خاک جانے گے۔۔۔

۔۔۔۔۔۔!!۔

ہاں البتہ اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اگر کسی کے ساتھ کچھ مدت کے لیئے میل جول اور گفت وشُنید ہوتی رہے تو کسی حد تک موصُوف یا موصُوفہ کے بارے میں کچھ ٹوٹا پھوٹا سا اندازہ لگا ہی لیا کرتے ہیں۔ البتہ پورے وثوق کے ساتھ پھر بھی کہہ نہیں سکتے کہ ہمارا اندازہ کتنا درست ہوتا ہے کیونکہ ہم تواِس بات پر ایمانِ کامل رکھتے ہیں کہ دلوں کے حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔!!!۔

لیکن انسانوں کا ایک طبقہ ایسا ضرور ہے جن کے بارے میں پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم ان کی اصلیت سے خاطر خواہ حد تک واقف ہیں۔ البتہ یہ واضح کرتے چلیں کہ یہ

واقفیت ہمارے اُن دوست صاحب کی مانند ہرگز نہیں کہ جنھیں اپنی پہلی اور میلی نظر پر اتنا گمان ہے کہ بقول اُن کے وہ زیرِ تبصرہ شخصیت کی سات پشتوں تک کی اصلیت بتا اور جتا سکتے ہیں۔

ہمارا یہ دعویٰ تو بس ہمارے حقیر سے مشاہدے کا مرہونِ منت ہے کہ جب سے ہوش سنبھالا ہے اِس طبقے، جو کہ ملک کے طُول و عرض بلکہ گوشے گوشے اور ہر کونے کُھدرے میں یوں وافر مقدار میں پایا جاتا ہے جیسے کسی مٹھائی والے کی دکان پر مکھیاں۔ سچ پوچھیئے تو اِن کی حرکات بھی مکھیوں سے کافی مشتریک ہیں۔ جیسے مکھیاں جہاں میٹھا دیکھتیں ہیں فوراً ہی وہاں پل پڑتی ہیں۔ ٹھیک اُسی طرح سے یہ لوگ بھی کچھ اِسی ہی صفاتِ فقیرانہ سے مالامال ہیں کہ جہاں حلوہ مانڈہ دیکھا تو نہ آو دیکھتے ہیں نہ تاو بس جئے، زندہ باد، بلے بلے۔۔۔۔۔۔۔ !، کا فلک شگاف نعرہِ مستانہ بلند کرتے ہوئے ایسے پل پڑتے ہیں کہ جب تک وہ سارا "حلوہ مانڈہ" چٹ کر نہ لیں چین سے نہیں بیٹھتے۔

ہاں البتہ اِن میں اور مکھیوں میں اتنا تفاوت ضرور ہے کہ بے چاری مکھیوں کا کہنا ہے: "میٹھا میٹھا ہپ ہپ تے کڑوا کڑوا بھی ہپ ہپ"۔ لیکن صاحب، ان لوگوں کا کہنا ہے: "میٹھا میٹھا ہپ ہپ تے کڑوا کڑوا تھو تھو"۔ بلکہ کہنا کیا یہ تو ان کا ازلی ٹریڈ مارک ہے۔

تو صاحبان، اب تک تو آپ سب سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ ہم کس مخلوق کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے اُس دوست کی طرح سے آپ میں سے بھی کئی ایسے ہیں جو ماشاء اللہ اڑتی چڑیا کے بھی پر گن لیتے ہیں تو بھلا اس زمینی مخلوق اور اُس کی حرکات اور اصلیت سے بھلا کیوں کر واقف نہ ہوں گے۔

جی ہاں یہ حضرات ہمارے "سیاسی کارکنان" ہیں جو ہر تقریب، جلسے و جلوس میں محض اُس وقت تک ہی صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ جب تک کھانا کھل نہیں جاتا، کیک کٹ نہیں جاتا اور کہیں کسی سیاسی تقریب یا جلسے و جلوس میں جو اگر والا بیان کردہ لوازمات نہ ہوں تو پھر اِس صورت میں جلسہ گاہ میں لگیں کرسیاں دیکھ نہیں لیتا اپنی بھرپور سیاسی بصیرت کا بھرپور مظاہرہ کرتا رہتا ہے لیکن جہاں کھانا کھلنے اور کیک کٹنے کا اعلان ہوا بس اللہ کی پناہ وہ بھگدڑ مچتی ہے کہ مانو جیسے اس تقریب یا جلسے میں تقسیم کیا جانے والا کھانا یا کیک ان کی زندگی میں انہیں میسر آنے والا پہلا اور آخری من و سلویٰ ہی تو ہو۔

ہم ذاتی طور پر ایسے درجنوں کارکنان سے واقف ہیں کہ وہ کسی بھی سیاسی تقریب میں جانے سے پہلے یہ ضرور معلوم کرلیتے ہیں کہ آیا وہاں کیک شیک، بوتل شوتل، بریانی سریانی، روٹی شوٹی اور کرسی شُرسی کا تسلی بخش انتظام ہے یا نہیں اور اگر جو ایسا نہیں ہے تو پھر حاضری الاونس کی مد میں کچھ نقد نقدی ہاتھ آنے کی امید ہو تو ہی

مذکورہ سیساسی تقریب، جلسے و جلوس کے منتظمین کو پُٹھے پر ہاتھ دھرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ بصُورت دیگر آپ سب نے مرزا داغ دہلوی کا وہ شعر تو سنا ہی ہوگا اور اگر جو آپ نے نہ بھی سنا ہو تو انھوں نے نہ صرف سن بلکہ اپنی گرہ سے باندھ بھی رکھا ہے:۔

تو ہے ہرجائی تو اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

اِن سیاسی تقریبات، جلسے اور جلوسوں میں ہونے والی عظیم الشان بھگڈر کی تازہ ترین مثال 28 مئی کو منائے جانے والے ایٹمی دھماکہ کی سالگرہ کے موقعہ پر دیکھنے میں آئی کہ جب کارکنان کی جان تقریب میں سجے سجائے کیک دیکھ دیکھ کر لبوں تک آ گئی۔ جیسے ہی کیک کٹا ویسے ہی سب نے اس معصوم و مسکین سے کیک پر ہلہ بول دیا۔ ایک منچلے تو سارے کا سارا کیک ہی اپنے ہاتھ میں اٹھا لیا۔ اُس کی یہ جراتِ رندانہ دیگر ساتھیوں کے لیئے مہمیز ثابت ہوئی اور وہ سب بھی وہاں موجود دیگر کیکوں پر ٹوٹ پڑے۔ جسے پلیٹ میسر آئی وہ بھی اور جیسے نہ آئی وہ بھی۔ ہاں البتہ پلیٹ کے بغیر ہی ٹوٹ پڑنے والوں نے اپنے ہاتھوں ہی میں کیک کو کچھ یوں بھر بھر لیا کہ جیسے ایک ننھے مگر ندیدے بچے کو اچانک کہیں ٹافیوں کا ڈھیر نظر آ جائے اور وہ وار فتگی میں اپنی دونوں مٹھیوں میں جس قدر بھی ہوسکے اُنہیں بھر لے۔

سنا ہے کہ کیک کو کارکنان کی جانب سے اس طرح سے "ہاتھوں ہاتھ" لیئے جانے پر مذکورہ

تقریب کے منتظمین اور کرتا دھرتاوں نے اپنی شدید خفگی اور افسوس کا بھی اظہار کیا کیونکہ انہوں نے یہ تقریب یہ سوچ کر منعقد کی تھی کہ تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے اور اِس بہانے سے اُنہیں تقاریر و تصاویر کا موقعہ بھی ہاتھ لگے ہی جائے گا اور اگلے روز کے اخبارات اور ٹی وی کے بلیٹن ان کی تصاویر و تقاریر کی بھرپور عکاسی کرتے نظر آئیں گے۔ لیکن کارکنان نے بجائے انہیں "ہاتھوں ہاتھ" لینے کے اُن دو کوڑیوں کے کیک کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور میڈیا اور ان کے کیمرہ مینوں نے کیک پر جھپٹے امنڈتے کارکنان کو۔ یوں تقریب کی کاروائی کی نیوز "بریکنگ نیوز" میں تبدیل ہو گئی۔ اس طرح سے اُن بیچاروں کی تو ہینگ لگی اور پھٹکری بھی اور رنگ بھی چوکھا نہ آیا۔ چوکھا تو کیا کوئی رنگ آیا ہی نہیں۔ ہاں اگر آیا تو ان کے چہروں پر اور وہ بھی رنگِ ملال۔۔۔۔۔!۔

ویسے دیگر پارٹیوں سے وابستہ یا محض ہمدردی رکھنے والوں کو خوش ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ایسے رُوح پرور مناظر اور ایمان افروز واقعات تواتر کے ساتھ کم و بیش تمام ہی سیاسی جماعتوں کی تقریبات اور جلسے جلوسوں میں دیکھنے کو ملتے رہتے ہیں۔ بس فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ کبھی کیک کی جگہ ٹھنڈے مشروبات کی بوتلوں کے کریٹ تو کبھی سالن یا بریانی سے بھرے تھال لے لیتے ہیں اور کچھ بھی نہ میسر آیا تو وہاں جلسہ گاہ میں پڑی کرسیوں کی شامت آ جاتی ہے۔ وہ دھینگا مشتی ہوتی ہے کہ جلسہ، جلسہ گاہ کم اور میدانِ جنگ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔

تو جناب یہ تو ہوا ان کارکنانِ سیساسیانِ ملت کا ظاہر۔۔۔۔۔۔۔۔ !۔ اگر آپ کا مشاہدہ قدرے عمیق ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ ان کا باطن نہ جان پائیں۔ سوال یہ اٹھتا اور ویسے ہی اٹھتا ہے جیسے کہ اپنے فیض صاحب نے فرمایا تھا کہ یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے؟ کہ اس چھینا جھپٹی، دھینگا مشتی اور ہلڑ بازی کا آخر محرک کیا ہے؟۔

تو جناب۔۔۔۔۔ !۔ جواب آسان اور سیدھا ہے اور وہی ہے جو ہم اپنے بچپن سے ہی سنتے آئے ہیں۔ بچہ اپنے بڑوں کو جیسا کرتا دیکھے گا ویسے ہی تو سیکھے اور دھرائے گا نہ۔

۔۔۔۔۔۔۔ !!!۔

جی کیا فرمایا۔۔۔۔۔۔ ؟۔ کیا مطلب ہے ہمارا۔۔۔۔۔۔۔۔ ؟۔

صاحب، مطلب صاف ظاہر ہے۔ اپنے لیڈران کرام کے کالے کرتوت دیکھ کر ان کے زیرِ اثر سیاسی کارکنان نے بھی تو وہی کرنا ہے نہ جو ان کے آئیڈیل لیڈران الیکشن جیت کر کرتے ہیں۔ ملک و قوم کی دولت کو نانی اماں کی فاتحہ کا کیک [معاف کیجئے گا، فاتحہ میں کیک تو نہیں البتہ کھچڑی ہوا کرتی ہے۔ لیکن ہم نے کیک اس لیئے کہا کہ ان کمبختوں کے منہ کو تو خون لگ چکا ہے بھلا وہ کیوں کھچڑی کو منہ لگانے لگے] سمجھ کر اُس کی

چھینا جھپٹی۔ اسمبلیوں کے فلوروں کو اکھاڑے گردانتے ہوئے آئے روز بپا کیئے جانے والے دنگل تے دھنیگا مشتیاں۔ عوام کے ووٹوں کے نتیجے میں ملنے والی کرسیوں کو اپنی جاگیر سمجھتے ہوئے ہونے والی آپسی بندر بانٹ۔ تو اب بھلا جب ان بیچاروں کارکنان کی ایسی "شاندار" سیاسی تربیت ہوگی تو پھر وہ بھی جہاں موقعہ ملے گا تو کیونکر اپنے لیڈران کی تقلید سے باز رہ سکتے ہیں۔

غور طلب امر یہ ہے کہ جب یہ تمام اعلیٰ تربیت یافتہ سیساسی کارکنان کیک.بریانی کے تھالوں اور جلسہ گاہ کی کرسیوں کی چھینا چھپٹی.آپسی دھینگا مشتی اور ہلڑ بازی جیسی اعلیٰ جمہوری و سیساسی جدوجہد اور بھرپور مشقوں سے بہرہ مند ہو کر عنانِ اقتدار سنبھالے گے تو پھر اپنی اِس تربیت کو جو کہ اب شاید اُن کی جبلت کا خاصہ بن چکی ہے.بروِکار لاتے ہوئے اپنے اپنے مفادات کے کیک پر تمام تر اخلاقی و قانونی حدود و قیود اور قواعد و صوابط کو بالاِطاق رکھ کر ٹوٹ پڑے گے اور بالا ہی بالا ساری بالائی ہڑپ کرنے میں اپنے سابقہ لیڈران سے بھی دو ہاتھ آگے.بڑھ.بڑھ کر کارہائے نمایاں سرانجام دیتے نظر آئیں گے۔

کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب دراصل وہ خود اپنی تربیت کی نیت سے کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ انہوں نے حضرتِ اقبال کا یہ شعر بھی سن رکھا ہو۔

پلٹنا جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا

لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

اور جو اگر اُن کارکنان نے یہ شعر کبھی نہ بھی سنا ہو تو ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اُن کے لیڈران نے تو ضرور سن رکھا ہوگا اور وہ اپنی سیاسی تقریبات، جلسے جلسوں میں جانتے بوجھتے ہوئے کیک، سالن، بریانی اور کرسیوں کا بندوبست کرکے اپنے حال کے کارکنان اور مستقبل کے لیڈران کی ذہنی و اخلاقی تربیت کا سامان اور موقعہ فراہم کرتے ہیں تاکہ کہیں اِن کے بعد اُن کی جاری کردہ چھینا جھپٹی، دھینگا مستی اور ہلڑ بازی کی سنہری روایات ماند نہ پڑھ جائے۔

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات۔۔۔

پچھلے کچھ عرصے سے دوست مسلسل یہ دریافت کر رہے ہیں کہ آج کل فکاہیہ مضامیں تحریر کیوں نہیں کر رہے؟

ایسے موقعے کے لیئے چچا جان کیا خوب کہہ گئے ہیں:۔

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

اور بقول چچا جان ہی کہ:۔

پہلے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

اور جب کسی کو خود ہی ہنسی نہ آئے تو وہ کسی اور کو بھلا خاک ہنسائے گا۔۔۔۔

۔!!!۔

لیکن صاحب، دوستوں کا اصرارِ مسلسل دیکھ کر بس یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ:۔

تم ضد تو کر رہے ہو ہم کیا تمھیں سنائیں
نغمے جو کھو گئے ہیں ان کو کہاں سے لائیں

جی ہاں جب ایک قاتل قتل کے جرم میں پھانسی کی سزا پا کر عدالت میں مارے خوشی کے تالیاں بجائے اور پھر کچھ یوں احاطہِ عدالت میں مُسکراتا اور دونوں انگلیوں سے وی یعنی کہ وکٹری کا نشان بنتا ہوا نکلے کہ بقول فیض صاحب:۔

جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

اُس کا بھائی تالیاں پیٹتے ہوئے نعرے بلند کر رہا ہو: "جیت گئے، جیت گئے، جیت گئے" کہ جیسے بھائی اُس کے نے کسی معصوم اور بے گناہ نوجوان کا قتلِ ناحق نہ کیا ہو بلکہ وہ ملکی سرحدوں پر دشمنانِ وطن کو جہنم رسید کر کے غازی بن کر لوٹ ہو اور اب وہ اُسے دادِ شجاعت سے نواز رہا ہو۔ تو ایسے میں نہ تو میں اس قابل ہی رہا ہوں کہ کوئی فکاہیہ مضمون ضبطِ تحریر میں لا سکوں اور اگر جو ایسی حماقت کر بھی بیٹھوں تو پڑھنے والے شاید اُسے پڑھ کر ہنسے تو نہ ہاں البتہ ان کی آنکھوں میں شاید آنسو ضرور آ جائیں۔

ویسے ہمارے وطنِ عزیز میں جو ہو کم ہی ہے۔ انسان کس کس بات کو روئے اور کس کس سانحے پر ماتم کرے۔

آپ خود ہی ملاحظہ فرمالیں:۔
گجرات میں اسکول کی وین میں آگ لگنے سے 18 معصوم بچے لقمۂ اجل بن گئے۔
پشاور میں پولیو مہم کے رضاکار دہشت گردوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔
ملتان کے ایک ہسپتال میں ڈاکٹروں نے گردوں کی بیماری میں لاحق ایک بچے کے دھوکے میں اُس کے ہم نام دوسرے بچے کے گردوں کا آپریشن کرڈالا۔
حیدرآباد شہر میں بچوں کی آپس کی لڑائی میں چار بھائیوں کو گولیاں مار کے ہلاک کردیا گیا۔
یا میرے مالک۔۔۔۔ !، یہ سب آخر ہو کیا رہا ہے آخر اور کب تک یوں ہی ہوتا رہے گا؟
صبح صبح میں نے جب آن لائن روزنامہ جنگ کا پہلا صحفہ کھولا ہی تھا کہ نظر شاہ رخ جتوئی کی پھانسی کی سزا کی خبر پر پڑی۔ اُسے اسقدر مطمئین اور ہشاش بشاس دیکھ کر دل کو ایک چوٹ سی لگی۔ پھر یہ سوچ کر دل کو بہلا لیا کہ شاید اپنی پھانسی کی عبرتناک خبر سن کر اپنے حواسوں میں نہیں رہا۔
میں نے فوراً اس خبر کو کاپی پیسٹ کرکے اپنے فیس بک کے صفحے پر آویزاں

کر دیا۔

بس صاحب، اتنا کرنے کی دیر تھی کہ دھڑا دھڑ تبصرے آنا شروع ہو گئے۔ ان تبصروں کو پڑھ کر لگ پتا گیا کہ میاں شاہ رخ جتوئی تو پورے پورے حواسوں میں ہیں لیکن شاید میں ہی کچھ ضرورت سے زیادہ خوش فہمی کا شکار ہوں۔

بقول بھائی لوگوں کے یہ سب کچھ ایک ٹوپی ڈرامہ ہے اور میاں صاحبزادے کو خوب پتہ ہے کہ اُس کا مالدار وڈیرا باپ اپنی اُس حرام کی دولت سے کہ جس کا شمار خود اُسے بھی نہیں کے زور پر کچھ بھی کر کے اُس کی جان بچا لینے میں کسی نہ کسی طرح سے ضرور کامیاب ہو ہی جائے گا اور وہ جلد ہی یورپ، برطانیہ یا امریکہ میں کہیں بیٹھا دادِ عیش دے رہا ہوگا۔

میں یہ تو نہیں جانتا کہ ایسا ہوگا کہ نہیں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اگر جو ایسا غضب ہو گیا تو پھر میں آپ سب سے کہے دیتا ہوں کہ ہمیں اپنے بچوں کو ہر وقت اپنے اپنے گھروں میں ہی مقید رکھنا ہوگا ورنہ جہاں وہ گھر سے باہر نکلے وہاں کوئی شاہ رخ جتوئی انہیں اپنی گولی کا نشانہ بنا کر مسکراتے ہوئے اپنی انگلیوں سے خود ہماری جانب ہی وکٹری کا نشان بناتے ہوئے اک شانِ بے نیازی سے کسی اور شکار کی تلاش میں نکل کھڑا ہوگا۔

اللہ نہ کرے کہ ایسا ہو اور ہم سب کو اپنے لختِ جگروں کو گھروں میں چھپا کر رکھانے کی نوبت آ جائے۔ لیکن مجھے کہنے دیں کہ آج عدالت سے اپنی پھانسی کا فیصلہ سن کر شاہ رخ جتوئی کا مسکراتا، مطمئین اور ہشاس بشاش چہرہ دیکھ کر مجھے رہ رہ کر یہ خیال آ رہا ہے کہ کیا ہمارے معمارانِ وطن حضرت قائدِ اعظم اور حضرت علامہ اقبال نے ایسے پاکستان کا خواب دیکھا تھا کہ جہاں قاتل اکڑتا پھرے اور مقتول کے لواحقین کسی کونے کھدرے میں سکڑتے نظر آئیں۔

کیا وہ ان کا وہی پاکستان ہے؟

کیا یہ ابنِ صفی مرحوم کا وہی پاکستان ہے جہاں وہ اپنی ہر تحریروں کے توسط سے وطنِ عزیز انصاف و قانون کا بول بالا، مظلوم کا سر بلند اور ظالم کا سر خم دکھایا کرتے تھے؟

میرے ان سوالوں کا جواب میں تو خود بھی نہیں دے سکتا اور شاید آپ میں سے کوئی بھی نہ دے سکیں۔۔۔۔۔۔!۔

لیکن ان سوالوں کا جواب موجود ہے ضرور۔ لیکن اُس کے لیئے ہمیں کچھ اور

انتظار کرنا ہوگا۔ اُس وقت تک جب تک کہ سارے شاہ رخ جتوئی تختۂ دار پر نہ چڑھا دیئے جائیں۔ بصورتِ دیگر ہم سب کو اپنے اپنے لختِ جگروں کو کسی نہ کسی شاہ رخ جتوئی کی بھینٹ چڑھتے دیکھ کر اپنی آنکھوں کو بند اور زبانوں کو قفل لگا کر بے حسی اور بے بسی سے یہ سارے ظلم سہہ سہہ کر مُردوں سے بھی بدتر حال میں زندہ رہنے کے لئیے خود کو آمادہ کرلینا چاہیئے کیونکہ:۔

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!!۔

شاہ بابا کو غصّہ کیوں آیا؟ [چائیلڈ لیبر ڈے اسپیشل]۔

اور پھر وہی ہوا جس کا کہ اُس کو ڈر تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔!۔

جمعۃ المبارک ہونے کے سبب مسجد میں کافی بھیڑ تھی۔کچھ ہی دیر میں خطبہ شروع ہوا چاہتا تھا۔ وُضو کرنے کی جگہ پر نمازیوں کا ایک اژدھام تھا۔ رحمت خان کابلی اِسی انتظار میں تھا کہ جیسے ہی اُس کی باری آئے تو وہ وُضو کرکے خطبے کے شروع ہونے سے پہلے چار رکعات سُنت پڑھ لے۔ باری آنے پر وضُو کیا اور جلدی سے صفیں باندھتے نمازیوں میں شامل ہوگیا۔ آنکھیں بند کیں۔ بسم اللہ پڑھ کر نیت باندھی۔ تکبیر پڑھ کر رکعت ادا کرنا شروع کردی۔ ابھی شاید دو ہی رکعات پڑھی ہوں گی کہ ذہن پر خیالات کی یلغار ہونا شروع ہوگئی۔ اُس نے پوری کوشش کے ساتھ اُن خیالات کو اپنے زہن سے جھٹکنا چاہا لیکن اُس کے لیئے اپنی سوچوں پر قابو پانا بے حد مُشکل ہو رہا تھا۔ اسی اثناء میں اُسے یہ خیال آیا کہ ان خیالات اور سوچوں کے درمیان وہ یہ تو بُھول ہی گیا کہ اب تک کتنی رکعات مکمل کرچکا ہے۔اِس خیال کے آتے ہی جاری رکعت کے جس مقام پر تھا وہ بھی اُس کے ذہن سے نکل گیا۔ یہاں تک اُسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ اُس

نے قیام کے دوران سورہِ حمد پڑھی اور اگر پڑھی تو اُس کے بعد کوئی دوسری سورہ پڑھی بھی یا نہیں۔ وہ رکوع میں بھی گیا کہ اپنے خیالات کے دھاروں میں بہتا ہوا سیدھا سجدے میں ہی چلا گیا تھا۔ اپنے سر کو جھٹک کر اُس نے پھر سے رکعت کا آغاز کیا لیکن وہی اِدھر اُدھر کے خیالات اور سوچیں دماغ کو گھیرے رہیں۔ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ نیت کے مطابق اب تک وہ چار رکعات مکمل کرچکا ہے یا ایک آدھ مزید پڑھنی ہے۔

ابھی اِسی کشمکش میں تھا کہ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اُس کے سارے جسم پر چونٹیاں سی رینگ رہی ہوں۔ اپنے ماتھے اور بغلوں سے پسینے کے قطرے بہتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ گو کہ اُس کی آنکھیں بند تھیں لیکن وہ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ مسجد میں موجود ہر زی رُوح کی نظریں جیسے اُسی پر ہی گڑھی ہوئی ہوں۔ وہ کچھ نہ دیکھتے ہوئے بھی اپنے جسم پر بیشمار گھورتی آنکھوں کی تپش محسوس کرنے لگا۔ گھبراہٹ میں آنکھ وا ہوئیں تو دیکھا کہ کوئی بھی تو اُس کی جانب متوجہ نہیں۔ ہر کوئی اپنے کام میں لگا ہوا ہے۔

اچانک خطبے کا اعلان ہوا۔ اُس نے جلدی جلدی ایک رکعت پڑھی اور پھر خطبہ میں شامل ہوگیا۔ لیکن یہاں بھی وہی صورتحال تھی۔ ابھی بمشکل امام صاحب کی کہی چند باتیں اُس کے خُشک ذہن میں جذب ہونے بھی نہ پائی تھیں کہ اُس نے ایک

بار پھر سوچوں اور خیالوں کے گھنے جنگل میں خود کو تنہا پایا۔ نہ معلوم کب خطبہ تمام ہوگیا۔ باجماعت نماز کا آغاز ہوا تو اُس دوران بھی وہ خیالات کے طُومار سے وہ خود کو محفوظ نہ رکھ سکا۔ کب اور کیسے نماز ادا ہوئی وہ تو بس رحمت خان کابلی کا خدا ہی جانے۔ مسجد سے باہر آ کر اُس نے چہرے سے ٹکراتی اور بالوں کو اڑاتی تیز ہوا میں کئی گہرے گہرے سانس لیئے۔ گو کہ سردیوں کا موسم تو نہ تھا لیکن ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی۔ ہوا کو اپنے پھیپڑوں میں اتارتے ہوئے خود کو قدرے پُرسکون سا محسوس کیا۔ اُس نے مڑ کر مسجد کی طرف دیکھا۔ نمازی تیزی کے ساتھ مسجدِ محبت خان کے بڑے دروازے سے برآمد ہو رہے تھے۔ اُن کے چہروں سے تازگی، طمانیت، خوشی اور سکون جھلک رہا تھا۔

۔"یارب العالمین، آخر یہ کیا ماجرا ہے۔ یہ میرے ساتھ آخر ہو کیا رہا ہے؟ اب سے کچھ عرصے قبل تک تو میری نمازوں میں خُوب سرشاریاں تھیں۔ اطمینانِ قلب تھا۔ میری توجہ نماز پر مرکوز رہتی تھی۔ لیکن اب یہ کیا ہو رہا ہے۔ نہ میری توجہ ہی نماز میں مرکوز ہو پاتی ہے اور نہ ہی میں وہ پہلے سا اطمینان و سکونِ قلب حاصل کر پا رہا ہوں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ایک عجیب سی بے کلی و بے چینی ہر لحظہ مجھے گھیرے رہتی ہے۔ ایک نامعلوم سا خوف ہمہ وقت دل و جاں

پر سوار رہتا ہے۔ جتنے ہی جتن کیوں نہ کرلوں میرا دھیان دورانِ نماز بٹ ہی جاتا ہے۔ یہ آخر مجھے کیا ہو گیا ہے؟" رحمت خان کابلی یوں بڑبڑاتا ہوا چلا جارہا تھا جیسے خُود ہی سے تو باتیں کر رہا ہو۔

ابھی زرا تھوڑا سا ہی آگے بڑھا تو پھل فروشوں کی رھڑیاں نظر آئیں۔ اُسے یاد آیا کہ جب وہ گھر سے نکلا تھا تو بیوی نے تاکید کرتے ہوئے کہا تھا:۔ "خان جی، زرا یاد سے ہر طرح کا پھل فروٹ لیتے ہوئے آیئے گا۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ بچے کس شوق سے پھل کھاتے ہیں۔ دو دن پہلے آپ جو پھل لائے تھے وہ تو یہ سارے اُسی روز ہی چٹ کر گئے تھے"۔

اُس نے بناء کسی بھاو تاؤ کے ہمہ اقسام پھل درجۂ اول بڑے بڑے تھیلیوں میں بندھوایا۔ پھل فروش نے پاس ہی منتظر کھڑے ایک بچے کو اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی وہ پانچ سات سالہ بچہ تیزی سے آگے بڑھا اور بھاری بھر کم تھیلیاں اپنے دونوں کاندھوں پر ٹنگے تنکوں سے بنے بڑے بڑے تھیلیوں میں بھر لیں اور انہیں اپنے کاندھوں پر لٹکا کر بدقت تمام چلتے ہوئے گاڑی تک پہنچ پایا۔ رحمت خان نے گاڑی کی ڈکی کھولی۔ بچے نے سارے تھیلے اندر رکھ دیئے اور سلام کر کے جانے لگا تو رحمت خان نے فوراً اپنی جیب سے ایک بیس روپے کا نوٹ نکال کر اس

کے ہاتھ پر دھر دیا۔ بیس روپے کا نوٹ پا کر تو جیسے بچے کی عید ہی ہو گئی ہو۔ اُس کی تو باچھیں ہی کھل گئیں۔ اُس نے ایک بار پھر اُسے سلام کیا۔ لیکن اِس بار کے سلام اور پہلے والے سلام میں ایک واضح فرق تھا۔ بچے کے چہرے سے خوشی پھُوٹی پڑ رہی تھی۔ رحمت خان یہ منظر بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ کہتے ہیں نہ کہ مسکراہٹ بھی متعدی بیماریوں کی طرح سے اُڑ کر لگتی ہے۔ بچے کے خُوشی سے دمکتے مسکراتے چہرے کو دیکھ کر رحمت خان کے چہرے پر بھی ایک بے ساختہ سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور اُسے ایسا لگا کہ جیسے اُس مسکراہٹ کا آغاز تو اِس معصوم سے بچے کے ہونٹوں سے ہوا۔ لیکن وہ سیدھی جا کر اُس کے دل میں اُتر گئی ہو۔

ایک نہ معلوم اور عجب موہوم سا سُکون اور احساسِ مسرت لیئے وہ اپنی گاڑی میں داخل ہوا۔ گاڑی اسٹارٹ کرکے اپنے گھر واقع حیاتِ آباد کے نئے اور خوبصورت ترین فیز 7 جس کا شمار پیشاور شہر کے ممتول ترین علاقوں میں ہوتا ہے کی جانب رواں دواں ہوگیا۔ اپنے دس مرلے کے انتہائی خوبصورت سے ڈبل اسٹوری بنگلے کے آہنی دروازے پر پہنچ کر گاڑی کا ہارن بجایا۔ فوراً ہی مسلح چوکیدار نے آہنی دروازے کا ایک پٹ کھول دیا۔ رحمت خان نے کھڑکی کا خودکار شیشہ نیچے کرکے چوکیدار شیر خان کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا اور اُس کے نزدیک آتے ہی بولا:۔ " سنو شیر خان، گاڑی کی ڈکی سے پھل اتار لو اور بیگم

صاحبہ دے کر کہنا کہ صاحب چلے گئے ان کو دیر ہو رہی تھی"۔ اتنا کہہ کر رحمت خان نے گاڑی کے اندر ہی سے ایک کل دبا کر ڈکی کھول دی۔ شیر خان نے پھرتی کے ساتھ ساری تھیلیاں ڈکی سے نکال کر ڈکی بند کی اور تھیلیاں اٹھا کر اندر چلا گیا۔

رحمت خان نے گاڑی ریورس کی اور کچھ ہی دیر میں وہ پیشاور کے مشہور تاریخی قصہ خوانی بازار کے اپنے چوبیس گھنٹے کھلے رہنے والے "کابلی ریسٹورینٹ" کی جانب گامزن تھا۔ گھر اور ریسٹورینٹ کے درمیان کم وبیش کوئی بیس بائیس کلومیٹر کا فاصلہ تھا اور عموماً سارا راستہ اُسے کافی بھیڑ بھاڑ کا سامنا کرنا پڑتا لیکن اُس روز خُوش قسمتی سے اُسے بہت زیادہ ٹریفک نہ ملی۔ گاڑی بڑی سُبک رفتاری کے ساتھ پہلے فیز 7 روڈ اور پھر فیز 2 روڈ سے ہوتی ہوئی پیشاور رِنگ روڈ پر داخل ہوئی اور کوئی بارہ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے بائیں طرف والے موڑ سے کوہاٹ روڈ میں داخل ہو گئی جو کوئی آگے چار ایک کلومیٹر کے بعد سنیما روڈ میں تبدیل ہو گئی۔ چند سو میٹر کے فاصلے کے بعد رحمت خان نے گاڑی کو دائیں طرف کو مڑ کر قصہ خوانی بازار میں داخل کر دیا۔ یہ رحمت خان کا روز ہی کا راستہ تھا۔ اُسے پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ کب اُس نے گاڑی کو کس سڑک پر ڈالا اور کونسا موڑ کاٹا۔ بس یہ سب کچھ تو خود بخود ہی ہوتا چلا جاتا اور وہ اپنے گھر سے یہاں پہنچ جاتا۔ ہاں البتہ اگر ٹریفک جام

ملے جو کہ اکثر ملتا تو اُس صورت میں اُس کی پریشانی دیدنی ہوتی ہے۔

یہ ہوٹل اُس کے مرحوم دادا نے اُس وقت بنایا تھا جب وہ خود کو ایک کڑیل جوان تھے۔ کابلی پٹھانوں کا یہ خاندان رحمت خان کے دادا اور پڑداد کے زمانے میں جب ہندوو پاک پر انگریز سرکار کی عملداری تھی کابل سے بسلسلہِ روزگار ہجرت کرکے پیشاور آ بسا تھا اور پھر اُس وقت سے یہ ہی اُن کا وطن ٹھہرا۔ رحمت خان کے دادا ولایت خان کابلی نے اپنی نوجوانی میں "کابل ہوٹل" کے نام سے اِس کی داغ بیل ڈالی اور وہ اُن ہی کے زمانے میں اپنے خُوش زائقہ کھانوں اور خالص پیشاوری دودھ پتی چائے کے لیئے بے پناہ مشہور ہو چکا تھا۔ ولایت خان کابلی کے بعد اُس کے چھوٹے بیٹے کفایت خان کابلی نے اُس کا انتظام و انصرام سنبھالا اور پھر جب آج سے کچھ بیس بائیس سال قبل رحمت خان کابلی نے پیشاور یونیورسٹی سے بی اے مکمل کیا تو اُس کے والد نے اپنے بوڑھے کاندھوں کا بوجھ اُس کے جوان کاندھوں پر لادھ دیا۔ رحمت خان نے اُس کی نئے سرے سے تزئین و آرائش کرکے اُسے "کابلی ریسٹورینٹ" کا نام دیا اور روایتی شہرت کو برقرار رکھا بلکہ یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ اُن میں چار چاند لگا دیئے۔ پانچ سال قبل کوئی 65 سال کی عمر میں اُس کے والد کا اچانک انتقال ہوگیا۔ حالانکہ اُنھیں کوئی ایسی خاص بیماری بھی لاحق نہ تھی۔ ڈاکٹر ہارٹ فیلیور کا کیس بتاتے تھے۔

رحمت خان اپنی مخصوص جگہ پر گاڑی پارک کرکے پیچھے والے دروازے سے ہوٹل میں داخل ہوا۔ ابھی وہ ہوٹل کے پیچھے بنے ہوئے اپنے کمرے میں داخل ہی ہوا تھا کہ اُسے دیکھ کر کریم خان جو کہ ہوٹل کے تمام بیروں اور باورچیوں پر نگران مقرر تھا دوڑتا ہوا آیا۔ "خان جی کہاں رہ گئے تھے آپ؟ ہم کتنی دیر سے آپ کے موبائل پر کال کررہا تھا لیکن وہ مسلسل بند ہی آرہا تھا" اُس کی آواز سے پریشانی مترشح تھی۔ "اوہ ہاں اُسے تو میں نے مسجد میں داخل ہونے سے قبل ہی بند کردیا تھا اور پھر آن کرنا یاد نہ رہا"۔ رحمت اپنی جیب سے موبائل نکال کر آن کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن بات کیا ہے تم اتنے پریشان کیوں ہو؟" "جی خان جی وہ شاہ بابا آئے تھے۔۔۔۔۔۔۔!!!"۔ "اُف خدایا، میں کس قدر بھلکڑ ہوتا جارہا ہوں۔ اُنہوں نے خُود ہی تو مجھ سے کہا تھا کہ وہ بعد نمازِ جمعہ ہوٹل کا چکر لگائیں گے۔ تم نے انہیں بیٹھایا کیوں نہیں؟ ان کی کوئی خاطر تواضع بھی کی یا وہ ویسے ہی چلے گئے؟ تم نے انہیں روکا کیوں نہیں؟"۔ رحمت خان نے سوالات کی بوچھاڑ کردی۔ "جی وہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!، خان جی۔۔۔۔۔وہ۔۔۔۔۔!خان جی۔۔۔۔۔۔!،وہ وہ۔۔۔۔۔۔۔!!!" کریم خان کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن بس ہکلا کر ہی رہ گیا۔ "یہ کیا خان جی اور وہ وہ کی رٹ لگا رکھی ہے؟" رحمت خان غصّہ ہوتا ہوا بولا۔ "جی خان جی وہ بات یہ ہے کہ ہم نے تو بوتل شوتل چائے شائے دونوں کا پوچھا تھا لیکن اُنہوں نے ہی انکار

کر دیا اور کچھ دیر ہوٹل میں اِدھر اُدھر چکر لگایا اور پھر بیروں میروں سے بات شات کرتے رہے۔ پھر ہم اپنے کام میں مصروف ہوگیا کہ اچانک اُن کی زور زور سے بات کرنے کی آواز سنی۔ ہم اُس وقت کاونٹر پر تھا۔ اُن کی آواز کچن سے آرہی تھی۔ ہم ڈور کر کچن میں گیا تو شاہ بابا کا چہرہ شدید غصّے سے لال ہو رہا تھا۔ ہم کو دیکھتے ہی چلا کر بولے:۔ "کہہ دینا رحمت خان سے میں آیا تھا" اتنا کہہ کر انہوں نے وہاں ایک کونے میں کھڑے تھر تھر کانپتے ضابطہ خان کا ہاتھ پکڑا اور چلے گئے۔ ہم پوچھتا ہی رہ گیا کہ شاہ بابا آخر بات کیا ہے جو آپ اتنا غصہ کھا رہے ہیں۔ لیکن وہ تو تیزی کے ساتھ باہر نکلے اور اپنی گاڑی جس میں ڈرائیور تیار بیٹھا تھا۔ اپنے ساتھ ضابطہ خان کو سوار کرکے روانہ ہوگئے"۔ رحمت خان مارے حیرت کے بس منہ کھولے سنتا رہا۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی اور پھر جیسے یکدم اُسے ہوش آ گیا ہو۔ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے موبائل فون پر شاہ بابا کا نمبر تلاش کرنا شروع کر دیا لیکن فوراً اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور یہ کہتا ہوا باہر کی جانب دوڑا: "میرا خیال ہے کہ اُس وقت انہیں فون کرنا غیر مناسب ہوگا۔ میں خود ہی ان کے گھر جا کر ان کے غصہ کی وجہ معلوم کرتا ہوں"۔

رحمت خان گاڑی میں سوار ہو کر شاہ بابا کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ پشاور شہر کی سڑکوں پر تیزی سے دوڑتی ہوئی گاڑی کی طرح سے اُس کے ذہن کی رگ رگ

میں سوچیں ڈورتی پھر رہی تھیں۔ شاہ بابا کا غصہ تو سارے خاندان میں مشہور تھا۔ مرحوم والد کے بڑے بھائی اور خاندان کے سب سے معمر بزرگ ہونے کے ناطے وہ اُن کی بے حد عزت کرتا تھا۔ تھے تو وہ اُس کے تایا اور نام اُن کا کرامت خان کابلی تھا لیکن اُس سمیت سارا خاندان انہیں شاہ بابا شاہ بابا کہہ کر ہی پکارتا تھا۔ دورِ جوانی ہی سے مذہب میں اپنی خصوصی رغبت اور پھر اپنی مشت بھر داڑھی کے سبب شاہ جی شاہ جی کہلاتے تھے اور پھر اب پچھتّر سال کی عمر میں جب سر، داڑھی، مونچھوں حتیٰ کہ پلکوں اور بھووں تک کا ایک ایک بال سفید ہوچکا تھا۔ خاندان بھر کے لوگ باگ اور دوست احباب عرصہ ہوا انہیں شاہ بابا شاہ بابا کہہ کر پکارنے لگے تھے۔ سچ یہ تو ہے کہ یہ نام ان کی بارعُب شخصیت سے بہت ہی میل کھاتا تھا۔

رحمت خان افسوس کر رہا تھا کہ وہ یہ کیسے بھول گیا کہ ابھی پچھلے اتوار جب وہ ان کے گھر اپنا مسئلہ لے کر اُن سے ملنے گیا تو اُنھوں نے اُس کی بات بغور سننے کے بعد کچھ دیر سوچ کر صرف اتنا کہا تھا: "میں بعد از نمازِ جمعہ تمھارے ہوٹل پر آ ؤں گا اور اللہ نے چاہا تو انشاءاللہ تم کو تمھارے مسئلے کا حل بھی ضرور بتاوں گا"۔

ویسے تو وہ کئی ماہ سے ہی سوچ رہا تھا کہ وہ اپنے مسئلے کا ذکر شاہ بابا سے

کرے لیکن بس کچھ ہمت ہی نہ ہوتی تھی۔ اُسے سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کیسے شاہ بابا کو بتائے کہ پچھلے سال ڈیڑھ ایک برس سے اُس کے ساتھ کچھ عجیب سی صورتحال درپیش ہے۔ گو کہ کاروبار و آمدنی میں تو کچھ ایسی خاص کمی تو نہیں آئی تھی لیکن یہ سچ تھا کہ آمدنی میں سے برکت اٹھ سی گئی تھی۔ کہاں وہ پہلے اپنے گھریلو اخراجات کے بعد اپنی آمدنی کا ایک بہت بڑا حصہ پس انداز کرلیا کرتا تھا۔ اب آئے دن کے ناگہانی اخراجات میں اُس کی غیر معمولی آمدنی بھی اُس غریب کی محدود پونجی بن کر رہ گئی تھی کہ جس کہ دروازے پر ہر پہلی کو قرض خواہوں کی قطار لگ جاتی ہے۔ اُن سے فارغ ہو کر جب وہ اپنے گھر میں داخل ہوتا ہے تو نانِ شبینہ کے حصول کے بھی لالے پڑتے دکھائی دیتے ہیں۔

خیر رحمت خان پر کسی کا کوئی قرض تو نہ تھا نہ ہی قرض کی وصولیابی کے تقاضے اور نہ ہی اندیشہِ نانِ شبینہ۔ لیکن یہ آئے دن کے اخراجات جو نہ جانے کیوں اور کیسے یکے بعد دیگرے منہ اٹھائے چلے آتے، اُس نے اُس کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔

آئے دن اُس کے چھے بچوں میں سے کوئی نہ کوئی بیمار پڑھ رہا ہے۔ نوبت یہاں تک آن پہنچی تھی کہ اُن چھے میں سے چار آگے پیچھے ہسپتال تک ہو آئے تھے۔

تین ماہ قبل اچانک پارکنگ میں کھڑی اُس کی نئی نویلی تیس لاکھ کی گاڑی نے نہ جانے کب اور کیسے آگ پکڑ لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ رحمت خان نے انشورنش کی رقم بچا کر اُس وقت تو اپنے من ہی من خود کو عقلمند گردانا تھا لیکن اُس حادثے کے بعد تو اُسے ایسی عقل آئی کہ نئی تو نئی دیگر دو پرانی گاڑیوں کے انشورش بھی جاری کروا لیئے اور تو اور اپنی دس مرلے کی کوٹھی اور ہوٹل کا بھی مکمل انشورنش حاصل کر لیا۔ وہیں حیاتِ آباد ہی میں ایک اور بڑا سا پلاٹ جو کہ کئی برس پہلے یہ سوچ کر خریدا تھا کہ اُس پر کوئی خُوبصورت اور بڑا سا گھر تعمیر کروا کر خود وہاں اٹھ جائے گا اور موجودہ کوٹھی کو اچھے داموں فروخت کر دے گا۔ کافی تلاش بسیار کے بعد ایک ٹھکیدار ایسا مل ہی گیا جس نے ایک کروڑ روپے میں یہ پروجیکٹ مکمل کرنے کی حامی بھر لی۔ حالانکہ یہ سوا ڈیڑھ کروڑ سے کم کا پروجیکٹ تو کسی طور بھی نہ تھا۔ نصف رقم ایڈوانس اور نصف کی ادائیگی تکمیل پر ہونا قرار پائی۔ رحمت خان نے پچاس لاکھ کا چیک ٹھکیدار کے نام لکھ دیا جو اُس نے اُسی دن کیش کروا لیا اور پھر اُس روز سے رحمت خان اپنے کیش اور ٹھیکیدار دونوں ہی کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ پولیس میں رپٹ بھی درج کروائی گئی اور متعلقہ تھانیدار کو رقم کی وصولی کی صورت میں دس فیصد رقم بطور "انعام" دینے کی بھی یقین دھانی کروائی گئی۔ تھانیدار کے بے حد اور بھرپور

اصرار و مطالبے پر "انعامی رقم" کا نصف حصہ یعنی مبلغ ڈھائی لاکھ روپیہ پیشگی بھی دے دیا گیا لیکن آج اِس بات کو بھی کئی ماہ ہونے آئے۔ نہ ہی ٹھیکدار کا ہی کچھ پتہ چل سکا اور ڈھائی لاکھ کی چپت اور لگ گئی۔

سونے پہ سہاگہ رحمت خان نے گذشتہ کئی سالوں سے جن کمپنیوں کے حصص میں اپنا ہاتھ اور دل دونوں ہی کھول کر سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسٹاک مارکیٹ میں اُن کا بھاؤ کچھ یوں گرتا چلا گیا کہ اصل مالیت گھٹ گھٹا کر صرف بیس پچیس فیصد ہی کے برابر رہ گئی تھی اور اب انہیں فروخت کرنے کی بھی اُسے یہ سوچ کر ہمت نہ ہوتی کہ شاید بھاؤ پھر سے بڑھ جائیں تو نقصان پورا ہوسکے۔

ابھی انہی صدمات کا غم غلط نہ ہوا تھا کہ گذشتہ ماہ رات دیر گئے ایک شادی کی تقریب سے گھر آتے ہوئے سُرخ بتی والے اسٹاپ پر موٹر سائیکل سوار دو نوجوانوں نے پستول کے زور پر زبردستی گاڑی کا شیشہ کھلوا کر اُس کی بیوی کا سارا زیور جو کہ اُس وقت پہن رکھا تھا۔ اتروا کر یہ جا وہ جا ہوگئے اور جاتے جاتے پندرہ بیس لاکھ کا ٹیکہ لگا گئے۔ وہاں موجود لوگ فقط تماشا دیکھتے رہے۔

مذہب کی جانب نماز و روزہ کی حد تک تو اُس کی رغبت شروع ہی سے تھی اور زکوۃ صدقات سے بھی چوکنے والوں میں سے نہ تھا۔ لیکن پچھلے کچھ سال بھر سے یہ حال ہو چلا تھا کہ نمازوں میں اُس کا دھیان لگتا ہی نہ تھا۔ وہی نمازیں جو اُسے خوشی اور سکون دیا کرتی تھیں اب بس ایک ایسے فریضئے کے طور پر ادا ہونے لگی تھیں جسے کوئی بس گنتی پوری کر رہا ہو۔ ہر وقت ذہن کسی ایسی بے مقصد ادھیڑبُن میں مشغول رہتا کہ جُس کا کوئی بھی سرا اُس کے ہاتھ نہ آتا۔ بس ایک بے چینی و بے کلی جس کا حاصل ہوتی۔ ہر لحہ ایک نامعلوم سا خوف ذہن کے نہاں خانوں میں ایک چھپکلی کی طرح رینگتا رہتا۔ ایک بے نام سی اداسی ہر لحضہ دل و دماغ پر سوار رہتی۔

بہت سوچنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ وہ شاہ بابا کو تمام صورتحال سے آگاہ کرکے اُن کی رائے اور حل دریافت کرے گا۔ پچھلے اتوار جب وہ اُن کے گھر گیا تو کھل کر تمام صورتحال اور اپنی ذہنی و دماغی کیفیات کا شاہ بابا سے ذکر کیا۔ پہلے تو وہ کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر اتنا ہی کہہ کر باتوں کا رُخ دوسری طرف موڑ دیا کہ وہ جمعہ والے روز بعد نماز اُس کے ہوٹل ہرا آ کر اُس سے ملیں گے اور انشاء اللہ وہیں اپنی رائے کا بھی اظہار کریں گے اور اُس کا کوئی مناسب سا حل بھی تجویز کریں گے۔

خیالات کے پُر پیچ بھنور میں ڈوب کر گاری چلاتے ہوئے اُسے یہ بھی نہ پتہ چلا کہ کب قصہ خوانی بازار سے نکل کر چرچ روڈ پر آیا اور پھر چوک یادگار سے ہوتا ہوا کریم پورہ بازار اور گنج بازار روڈ سے ہوتا ہوا شیخ آباد روڈ کراس کرکے گلبہار روڈ سے شاہ بابا کی دس مرلے پر بنی گلبہار نمبر3 میں واقع کوٹھی تک آ پہنچا۔ ہارن دینے پر کوٹھی کے آہنی گیٹ پر نصب چھوٹی سی ایک کھڑکی میں سے چوکیدار نے باہر جھانکا اور پھر فوری کوٹھی کا بڑا آہنی دراوزہ کھول دیا۔

چند ہی لمحات کے بعد وہ شاہ بابا کی بیٹھک میں لگے گاؤ تکیوں سے مزین ایک چوڑے سے صوفے پر براجمان ایک بار پھر اپنی سوچوں میں گم تھا۔ ملازم اسے وہاں بیٹھا کر شاہ بابا کو اطلاع دینے کا کہہ کر جاچکا تھا۔ شاہ بابا کے آنے سے پہلے اُس کی خاطر تواضع کے لیئے لوازمات کی آمد ہوچکی تھی اور ملازم نے گرما گرم چائے اور فواکہات سے لبریز ٹرالی کو سرکا کر اُس کے قریب لا کھڑا کیا۔ لیکن رحمت خان تو سب چیزوں سے ایسا بے نیاز بن کر بیٹھا تھا جیسے اُسے زندگی میں کبھی اُن چیزوں سے کوئی دلچسپی رہی ہی نہ ہو۔

ابھی وہ اپنی بے ربط سی سوچوں ہی میں گم تھا کہ بیٹھک کے دروازے سے شاہ بابا اندر داخل ہوئے۔ رحمت خان فوراً ہی احتراماً کھڑا ہوگیا: "السلام

علیکم "۔ "وعلیکم السلام۔۔۔۔۔!۔" رحمت خان شاہ بابا کی آواز میں موجود گرم جوشی اور چہرے پر پھیلی بھرپور خیر مقدمی مسکراہٹ کو دیکھ کر چونک سا گیا۔ وہ تو شاہ بابا کے چہرے پر غیض و غضب اور آواز میں ناراضگی اور گھن گرج کی توقع کر رہا تھا۔ لیکن اُنہیں دیکھ کر یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کچھ دیر قبل وہ بے حد غصے میں لال بھبھوکا ہو کر ہوٹل سے نکلے ہوں گے۔ بلکہ لگ تو کچھ یوں رہا تھا کہ جیسے وہ بہت ہی اچھے موڈ میں ہیں۔ بے اختیار رحمت خان کے دل سے یہ صدا اٹھی:۔ "آخر شاہ بابا کی کیوں اور کس بات پر غصہ آیا تھا اور اگر آیا تھا تو اترا کیوں کر اور اب یہ اتنے اچھے موڈ میں کیسے دکھائی دے رہے ہیں؟"

۔"آو آو رحمت بچے۔۔۔۔۔۔۔!. ہم تمھارا ہی انتظار کر رہے تھے" شاہ بابا کی بارعب مگر شفقت آمیز آواز نے اُسے ایک بار پھر چونکا دیا۔ "ارے رحمت بچہ تم کھڑے کیوں ہوں۔ بیٹھو بیٹھو۔ کچھ کھایا پیا بھی یا بس یونہی۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!!۔" شاہ بابا بچپن ہی سے اُسے "رحمت بچے" کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ البتہ غصے یا پھر ناراضگی کی صورت میں صرف رحمت کہہ کر پکارتے۔۔"تو شاہ بابا کو اندازہ تھا کہ میں جب ان کے غصّے اور ناراضگی کے بارے میں سنوں گا تو دوڑا دوڑا یہاں چلا آوں گا۔ لیکن شاہ بابا تو بالکل بھی غصّے میں اور ناراض دکھائی نہیں دیتے۔ یہ آخر چکر کیا ہے؟ کہیں کریم خان کو کوئی غلط

فہمی تو نہیں ہوئی تھی" شاہ بابا کا یہ رویہ دیکھ کر رحمت خان سوچ میں پڑ گیا تھا۔
۔"رحمت بچے۔۔۔۔! کن سوچوں میں گم ہو۔ یہ دیکھو تمھاری چائے تک پڑی پڑی ٹھنڈی ہو چکی ہے"۔ شاہ بابا نے اُس کے سامنے پڑے چائے کے کپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جی بس یونہی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ویسے ہی میں نے سوچا کہ جب آپ آئیں گے تو ہم ساتھ ہی چائے پئیں گے"۔ "ہاں ہاں کیوں نہیں کیوں نہیں۔ میں ابھی عمر دراز کو کہہ کر تمھارے لیئے دوبارہ نئی تازہ چائے منگواتا ہوں"۔ اتنا کہہ کر انھوں نے اپنے ملازم عمر دراز کو صدا دی اور جیسے ہی وہ بیٹھک میں داخل ہوا شاہ بابا بڑے ہی دھیمے اور انتہائی پُر شفقت لہجے میں مخاطب ہوئے:۔ بیٹا عمر دراز! رحمت بچے کے لیئے تازہ چائے گرما گرم تیار کر کے لے آؤ اور ہاں کسی سے کہہ کر میرا یہ حقہ بھی تازہ کروا دو"۔ "جی شاہ بابا، جو حکم۔۔۔۔۔۔!!!" عمر دراز نے قدرے جھک کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ بصد احترام کہا۔
رحمت خان جب بھی شاہ بابا کے گھر آتا تو وہ اُن کا اپنے ملازمین سے حسنِ سلوک دیکھ کرَ بہت متاثر ہوتا۔ اُن کا برتاو اپنے ملازمین کے ساتھ اپنے گھر کے فرد سا ہی تھا اور وہ سب بھی اُن سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔

۔"ارے رحمت بچے بار بار کہاں گم ہو جاتے ہو؟" شاہ بابا کی آواز نے اُسے پھر چونکا دیا۔ "جی نہیں بس میں تو آپ کا اپنے ملازمین کے ساتھ شفقت بھرا برتاؤ دیکھ رہا تھا"۔ رحمت بچے، نہ یہ میرے ملازمین ہیں اور نہ ہی کبھی میں نے انہیں اپنا ملازم ہی سمجھا" ہے۔ یہ سب بھی میرے بچوں ہی جیسے تو ہیں۔ ہاں یہ اور بات ہے اللہ تعالی نے ان کے رزق کا وسیلہ مجھے بنا دیا ہے تو یہ اُس پاک پرودگار کا مجھ ناچیز کا بڑا کرم ہے"۔
۔"شاہ بابا میں بے حد شرمندہ ہوں۔ مجھے علم تھا کہ آپ بعد نمازِ جمعہ ہوٹل پر آنے والے ہیں لیکن وہ دراصل میں نماز کے بعد بچوں کے لیئے کچھ پھل فروٹ لے کر گھر دینے چلا گیا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ میرے زہن میں یہ بات بھی نہ رہی کہ آپ آنے والے ہیں"۔ "ارے رحمت بچے کوئی بات نہیں۔ وہ کہتے ہیں نا کہ ہر بات میں اللہ کی کوئی مصلحت ہوا کرتی ہے تو تمھارے بُھول جانے اور پھر دیر سے ہوٹل پہنچنے میں بھی پاک پرودگار کی ضرور کوئی نہ کوئی اچھائی ہی رہی ہوگی۔ تم فکر نہ کرو۔ ہاں کیا کہہ رہے تھے تم کہ نماز کے بعد تم پھل فروٹ لینے رک گئے تھے۔ کیا کچھ لے ڈالا؟" وہ خان بابا کا سوال سن کر حیران رہ گیا کیونکہ آج تک خان بابا نے اُس سے اِس قسم کا سوال پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ "جی خان بابا وہ بس کچھ تھوڑا بہت پھل فروٹ بچوں کے لیئے لے لیا

اور بس"۔ "اندازاً کتنے کچھ روپوں کا؟" خان بابا کی کُرید نے اُسے مذید حیرت میں مبتلا کر دیا۔ "بس یہ ہی کچھ دھائی تین ہزار کا"۔ "اوہ اچھا، پھر تو اتنا سارا پھل دکاندار خُود ہی تمھاری گاڑی تک چھوڑنے آیا ہوگا؟" خان بابا یکے بعد دیگرے عجیب سے سوالات کیئے چلے جا رہے تھے۔ "نہیں خان بابا، اُس پھل فروس کے پاس ایک چھوٹا سا چھے سات برس کا ایک لڑکا کھڑا ہوا تھا۔ ویسا ہی جیسا کہ عموما بازاروں میں ایسے غریب بچے تنکوں کے تھیلے لیئے پھرتے رہتے ہیں۔ وہ ہی سارا پھل اپنے تھلیوں میں بھر کر گاڑی کی ڈگی میں ڈال گیا تھا"۔ "اوہ اچھا اچھا" خان بابا سر ہلاتے ہوئے بولے۔ "تو تم نے اُس غریب بچے کو کچھ انعام شنام دیا کہ نہیں؟"۔ جی خان بابا مجھے اُس پر بہت ترس آیا اور میں نے اُسے بیس روپے کا نوٹ دیا تو اُس کی خوشی دیکھنے کے لائق تھی۔ مسکراہٹ اُسے کے چہرے سے پُھوٹی پڑتی تھی" رحمت خان کو اُس بچے کا مسکراہٹ سے دمکتا چہرا پھر یاد آ گیا اور وہ خان بابا کو جواب دیتے دیتے ایک بار پھر مسکرا دیا۔ "بہت اچھے، یہ تم نے اچھا کام کیا۔ یہ بتاو تمھارے خیال میں وہ بچہ دن میں کتنا کما لیتا ہوگا؟" رحمت خان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر آج خان بابا کو ہوا کیا ہے۔ میں ڈرتے ڈرتے اُن کے پاس جھاڑ سننے کے خوف سے آیا تھا اور یہ ہیں کہ نہ جانے کیسے کیسے عجیب سے سوالات پر سوالات پوچھے چلے جا رہے ہیں۔

۔"میرا خیال ہے کہ کچھ نہیں تو کم از کم سو جتنے تو دن بھر میں کما ہی لیتا ہوگا۔ کیا خیال ہے تمھارا؟" اِس سے پہلے کے رحمت خان کچھ بولتا، خان بابا نے اپنے سوال کا از خود ہی جواب دے ڈالا۔ "جی ہاں جی ہاں، کیوں نہیں کیوں نہیں" رحمت خان بے اختیار بول اٹھا۔ "تو اِس حساب سے تین ہزار کے لگ بھگ ماہوار تو کما ہی لیتا ہوگا" خان بابا رحمت خان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے۔ "جی ہاں شاید" رحمت خان گم سم سی آواز میں بولا۔ "اچھا چھوڑو ان باتوں کو یہ بتاؤ کہ ضابطہ خان تمھارے پاس کب سے سے کام کر رہا ہے؟" خان بابا نے یکدم موضوعِ سخن تبدیل کرتے ہوئے ایک نیاء سوال داغ دیا۔ "یہ ہی کوئی سال بھر سے"۔ "ویسے یہ ہے کون اور تمھارے پاس کہاں سے آیا؟" خان بابا تو جیسے کوئی انکوائری کمیٹی کھول کر بیٹھ گئے ہو۔ "آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے سال قصہ خوانی بازار میں بم دھماکہ ہوا تھا اور اُس وقت ہمارے ہوٹل کا ایک باہر والا بیرا فرشتہ خان جو کہ بازار میں موجود دکانوں سے موصول شدہ آڈروں کی تکمیل کیا کرتا تھا۔ ایک دکان پر کھانا دینے گیا کہ وہاں دھماکہ ہوا اور وہ موقعہ پر ہی ہلاک ہوگیا۔ چونکہ وہ اپنے گھر کا واحد کفیل تھا تو میں نے اُس کی بیوہ کی درخواست پر اُسے کے چھے سالہ لڑکے ضابطہ خان کو اپنے پاس ملازمت پر رکھ لیا۔ یہ وہاں صبح سے شام تک میزوں اور برتنوں کی صفائی کے ساتھ ساتھ گاہکوں کے چھوٹے موٹے آرڈر چائے بوتل وغیرہ بھی بھگتا لیا کرتا ہے"۔ "کتنی تنخواہ دیتے ہو اِسے؟" خان بابا کی آواز اِس بار کچھ

بدلی بدلی سی محسوس ہو رہی تھی۔ "جی تین سو روپے" "تین سو روپے روز یا ہفتہ وار۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔ !" خان بابا کی آواز رحمت خان کو کسی کنوئیں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ "جی نہیں خان بابا۔ تین سو روپے ماہوار" "کیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟" اس بار خان بابا کی آواز اتنی بلند تھی کہ رحمت خان کو اپنے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔

کچھ دیر فضاء پر ایک بوجھل سی خاموشی طاری رہی۔ اُس خاموشی کو خان بابا کی آواز جو کہ خلافِ توقع دھیمی تھی نے ہی توڑا: "میں یہ ساری باتیں ضابطہ خان کی زبانی سن چکا ہوں۔ جب اُس نے مجھے تین سو روپے ماہوار تنخواہ کا بتایا تو میں نے سوچا کہ بچہ ہے شاید اُسے اپنی تنخواہ کا ٹھیک سے پتہ نہ ہو۔ تم اُسے تین سو روپے ہفتہ وار دیتے ہو اور یہ شاید غلطی سے اُسے ماہوار بتا رہا ہے۔ لیکن جب میں نے تمھارے منہ سے بھی یہ سنا تو مجھے یقین نہ آیا اور میں خُود پر قابو نہ رکھ سکا۔ لیکن رحمت خانا، مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ !!!"۔

رحمت خان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ ابھی وہ یہ ہی سوچ رہا تھا کہ خان بابا پھر گویا ہوئے:۔ "تم نے اُس بوجھ ڈھونے والے بچے کو صرف چند منٹوں کی محنت پر بیس روپے دیئے یعنی اگر تم اُس سے روز یہ کام لو اور

روز ہی اُسے بیس روپے دو تو یہ بنتے ہیں چھے سو روپے ماہوار۔ ضابطہ خان جو کہ تمھارے لیئے سارا سارا دن کام کرتا ہے تم اُسے صرف تین سو روپے ماہوار دیتے ہو۔ تمھیں یہ خیال نہیں آیا کہ تم اُس معصوم کو جس کی عمر اسکول جانے اور کھیل کود کی ہے سے سارا سارا دن کام کرواتے ہو اور معاوضہ کے نام پر ضرف تین سو روپے جیسی شرمناک رقم دیتے ہو۔ تمھیں شرم آنی چاہیئے، رحمت خانا۔ خان نانا کی آواز تلخی سے لبریز تھی۔ "بجائے ہوٹل میں اُس سے بیگار لینے کے، تمھیں اُسے کسی اسکول میں داخل کروا کر اُس کی تعلیم و تربیت کا بدوسبت کرنا چاہیے تھا۔ تم تین تین ہزار کا پھل فروٹ اپنے بچوں کے لیئے بلاتردد خرید لیتے ہو۔ لیکن اِس چھوٹے سے بچے کو اپنے ہوٹل میں کام کروا کر اُس کو اس قدر حقیر اور شرمناک معاوضہ دیتے ہو۔ رحمت خانا تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے"۔

رحمت خان کا حال یہ تھا کہ کاٹو تو قطرہ خون نہ نکلے۔ زبان گنگ اور حلق تنگ۔ "سچ ہی تو کہہ رہے تھے خان بابا" اُس نے سوچا۔ "خان بابا، میں نے تو اِس بارے اب تک کبھی کچھ سوچا ہی نہیں۔ میں نے تو اُسے اپنا کاروباری معاملہ گردانتے ہوئے یہ فیصلہ کرتے ہوئے اُسے نوکری پر رکھ لیا اور پھر دوبارہ اس بارے میں سوچا تک نہیں"۔

خان بابا کچھ دیر خاموش رہے اور پھر بولے: "کیا اب بھی تمھیں نماز میں اپنی عدم دلچسپی، بے چینی و بے کلی اور تمھارے ذہن پر سوار خوف اور اداسی کا سبب سمجھ میں آرہا ہے کہ نہیں؟۔ اللہ تعالی نے تمھیں اپنی نعمتوں سے مالا مال کر رکھا ہے اور تم اُس معصوم سے بچے کے ساتھ یہ ناانصافی کرکے اِن نعمتوں کی ناشکری کے مرتکب ہو رہے ہو۔ اِن جیسے معصوم ضابطہ خان ملک بھر میں نہ جانے کتنے تم جیسے رحمت خان کے ہاتھوں ایسی کتنی ہی ناانصافیوں اور مظالم کا شکار ہو رہے ہیں اور شاید یہ ہی وجہ ہے کہ ہمارے اِس وطن میں جو بنا تو اسلام کے نام پر تھا میں آج چہار سو خوف اور بے برکتی کا دورِ دورہ ہے۔ اللہ تعالی قرآن پاک میں ایک ایسی بستی کی مثال بیان فرماتا کہ وہ ہر طرح امن و چین سے بستی تھی۔ ہر طرف سے رزق بافراغت چلا آتا تھا مگر ان لوگوں نے خدا کی نعمتوں کی ناشکری کی تو خدا نے ان کے اعمال کے سبب اُن کو بھوک اور خوف کا لباس پہنا کر ناشکری کا مزا چکھا دیا"۔

۔"خان بابا مجھے معاف کردیں، شاید میں اندھا ہوگیا تھا۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں اپنی اِس غلطی کا مداوا کروں گا اور ضابطہ خان کی تعلیم اور اُس کے گھر والوں کی نگہداشت کا ہر ممکن طور بندوبست کروں گا" رحمت خان کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو اور آواز میں شرمندگی کا لرزہ نمایاں تھا۔

۔"نہیں رحمت خانا، ضابطہ خان والے معاملے میں تو تم سے کافی دیر ہو گئی ہے۔ اب ضابطہ خان میرے پاس ہی رہے گا۔ اُس کی تعلیم اور نگہداشت اب میری نگرانی میں ہو گی۔ لیکن ہمارے اِس شہر میں ضابطہ خان جیسے بچوں کی کوئی کمی نہیں۔ ہر گلی میں نہ جانے کتنے ضابطہ خان خاک اور دھول اڑاتے پھر رہے ہیں اور ہر موڑ پر کوئی رحمت خان کھڑا اُن کا استحصال کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا"۔

رحمت خان میں اب خان بابا کی باتیں سننے کا قطعاً حوصلہ نہ تھا۔ وہ مذید کچھ کہے سنے اٹھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ خان بابا بس اُسے پکارتے ہی رہ گئے۔ لیکن وہ کچھ یوں تیزی سے گم سم سا اُن کی کوٹھی سے نکل کھڑا ہوا کہ بقول فیض جیسے اپنے دونوں جہاں ہارنے کے بعد اب:۔

وہ جارہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

اراونڈ کراچی - ان ون ڈے

اراونڈ کراچی- ان ون ڈے- تحریر: امین صدرالدین بھایانی

۔"جی وہ۔۔۔۔۔۔۔۔،ابّو۔۔۔۔۔۔۔۔۔، وہ۔۔۔۔۔۔۔۔،اگلی گاڑی دوپہر بارہ بجے آئے گی" میں نے اپنے پُھولے ہوئے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

۔"اوہ اچھا، بس پھر تو کوئی فکر کی بات نہیں ابھی تو صرف دس ہی بجے ہیں" ابّو نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور ہاں بھئی اپنی امی سے کہہ دو کہ وہ اگلے ڈھیڑھ ایک گھنٹے میں ساری تیاریاں مکمل کرلیں، تاکہ ہمیں دیر نہ ہو جائے"۔

میں جلدی سے امی کی طرف بھاگا جو کہ کمرے کے ساتھ ہی لگے باورچی خانے میں کھڑیں قیمہ، پیاز، ثابت خُشک دھنیہ اور ہری مرچیں ملے باجرے کے آٹے کے کباب تل رہی تھیں۔ "ہاں ہاں بھئی۔۔۔۔۔۔!، سن لیا ہے میں نے، جاؤ اپنے ابّو سے کہوں کہ میں نے اپنی ساری تیاریاں کم وبیش مکمل کرلی ہیں۔ آلوؤں

کا خشک سالن اور تیکھی پوریاں کب کی تیار بھی ہوچکیں۔ اب میں تمھارے پسندیدہ کباب تل رہی ہوں اور پھر یہ سارا کچھ ٹفن کیریئر میں بھرنے کے بعد چائے بنا کر تھرماس بھی بھر لوں گی"۔

امی کی بات سن کر میرے منہ میں ڈھیر سارا پانی بھر آیا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ بس کسی طرح سے ہم سب جلد از جلد گاڑی میں سوار ہو جائیں اور پھر گاڑی چلنے کے ساتھ ہی میں ٹفن کیریئر کے خانے میں لبالب بھرے کبابوں پر اپنا ہاتھ صاف کرنا شروع کر دوں۔

کوئی دو گھنٹوں کے بعد امی، ابّو، اور چھوٹے بھائی کے ہمراہ میں کراچی پورٹ ٹرسٹ ریلوے اسٹیشن کے چھوٹے سے پلیٹ فارم کے شیڈ کے نیچے سمینٹ کے بینچ پر براجمان سامنے گزرتی ریل کی پٹریوں کے دونوں اطراف نظریں دوڑا رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر کچھ خاص بھیڑ نہ تھی۔ کچھ پانچ سات نفوس ہماری طرح سے اِدھر اُدھر بیٹھے ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد دور کہیں ٹرین کی سیٹی سنائی دی اور پھر ہلکی ہلکی چھک چھک کی آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔ سیٹی اور چھک چھک کی ملی جُلی آوازوں نے وہاں موجود لوگوں کو متحرک کر دیا اور سب اُس سمیت غور سے دیکھنے لگے جہاں

سے یہ آوازیں آ رہی تھیں۔ چند ہی لمحات میں دور سے ٹرین کا ہرا انجن سیاہ دھواں اڑاتا نظر آیا اور پھر اپنے پیچھے لگی بوگیوں کو لئے پلیٹ فارم پر آ کھڑا ہوا۔

ابّو نے ایک خالی سے ڈبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہم سب کو اُس میں سوار ہو جانے کا اشارہ کیا۔ ابھی ہم ریل گاڑی کی اُس لمبی چوڑی سی بوگی میں اپنی اپنی نشستوں پر ٹھیک سے بیٹھ بھی نہ پائے تھے کہ ٹرین کی الوداعی سیٹی سنائی دی اور پھر کچھ وقفے کے بعد ایک بار پھر سیٹی بجی اور ٹرین نے دھیرے دھیرے آگے کی جانب سرکنا شروع کر دیا۔ ٹرین اُس ریلوے اسٹیشن سے باہر آئی اور پھر ویسٹ وہارف روڈ کے ریلوے پھاٹک سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اب اُسے جی اے الانہ روڈ کے پُل سے گزرتے ہوئے اپنی منزل "وزیر منیشن" اور پھر اُس سے بھی مذید آگے جانا تھا۔

یہ 70ء کی دھائی کے اواخر کے سالوں کی بات ہے۔ ہم کراچی میں نواب مہابت خانجی روڈ پر واقع کے پی ٹی گراؤنڈ (موجودہ کے پی ٹی اسپورٹس کامپلیکس) کے عین سامنے کھارادر کے علاقے پنجابی کلب میں رہا کرتے تھے۔ ہمارے گھر کی بالکنی سے جہاں سامنے کے پی ٹی گراؤنڈ نظر آتا وہیں بائیں ہاتھ پر زرا ہی دور پورٹ ٹرسٹ ہالٹ نامی ایک بہت ہی چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن بھی دکھائی

دیتا، جہاں سے کراچی سرکلر ریلوے کی لوکل ٹرینیں گزرا کرتی تھیں۔
کراچی سرکلر ریلوے، جیسکہ نام سے ہی ظاہر ہے کراچی کے گرد ایک دائرہ بناتی ہوئی گزرتی تھی۔ اگر آپ کسی بھی اسٹیشن سے کسی بھی طرف کو جانے والی لوکل ٹرین پر سوار ہو جائیں تو وہ ٹرین آپ کو پورے کراچی کی سیر کرواتی ہوئی بلا آخر اُسی ریلوے اسٹیشن پر واپس لے آئے گی جہاں سے آپ اُس پر سوار ہوئے تھے۔
ابُو مرحوم کو ٹرین اور ٹرین کا سفر بہت پسند تھا۔ اِس بات کا اندازہ یوں لگائیں کہ وہ اکثر رات کے کھانے کے بعد مجھے اپنی لال رنگ کی ہنڈا ففٹی موٹر سائیکل پر سوار کروا کر گھر سے کچھ ہی دور واقع آئی آئی چندریگر روڈ پر حبیب بنک پلازہ کی عمارت کے عین سامنے قائم انگریزوں کے دور کے چٹانوں کے بڑے بڑے پتھر کاٹ کر بنائے گئے ریلوے پل پر لے جاتے اور پھر ہم دونوں باپ بیٹا اُس پُل سے کچھ ہی دور سٹی اسٹیشن کی تیز روشنیوں میں وہاں پر کھڑی ریل گاڑیوں اور ارد گرد کی پٹریوں پر ڈیزل اور موبل آئل کی تیز بُو والا سیاہ دھواں اُڑا کر شنٹنگ کرتے ریلوے انجنوں کو دیر تک دیکھا کرتے۔
ابّو مجھے ریل گاڑیوں، اُن کے انجنوں اور انگریز دور میں قائم کردہ ریلوے اسٹیشنوں اور نصب کردہ ریل کی پٹریوں کے بارے میں بتاتے جاتے۔ میں نے یہ

ہمیشہ محسوس کیا کہ وہ اپنے اس پسندیدہ موضوع پر متواتر بے تکان بولتے چلے جاتے اور اگر میں کبھی کوئی سوال کر لو جیسکہ "ابّو یہ انجن شنٹنگ کیوں کرتے ہیں؟" تو اس سوال کا جواب دیتے ہوئے اُن کی آنکھوں میں ایک بھرپور چمک دکھائی دیتی اور اُن کا چہرہ ان کے اندرونی جذبات کی بھرپور عکاسی کرتا محسوس ہوتا۔ بطورِ خاص وہ یہ بات تو مجھے ہر بار اور بار بار بتایا کرتے کہ اُن کے بچپن میں جب وہ ٹرین میں سفر کیا کرتے تو سب بچے مل کر ٹرین کی چھک چھک چھک کی تان پر کچھ یوں گایا کرتے:۔

چپل پور کے چھ چھ پیسے
چپل پور کے چھ چھ پیسے
چپل پور کے چھ چھ پیسے

ابّو مرحوم کو سیر سپاٹوں کا بھی بہت شوق تھا۔ جہاں فرصت میسر ہوئی وہ اپنی لال ہنڈا ففٹی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر کراچی کے گلی کوچوں اور بطورِ خاص ان علاقوں کی سیر کو نکل جاتے جہاں انہیں سڑک پر بچھے پرانی کتابوں کے پتھاروں کے ملنے کا امکان ہوتا۔ مجھے بہت اچھی طرح سے یاد ہے کہ وہ اس سلسلے میں ٹاور، بولٹن مارکیٹ، کھوری گارڈن، ریگل صدر، رنچھوڑ لین، پہلی چورنگی ناظم آباد، برکاتِ حیدری، حتیٰ کہ جبیب بنک سائیٹ، پاپوش نگر، بڑا

میدان، چھوٹا میدان، حسن اسکوائر چورنگی اور نہ معلوم کہاں کہاں تک جا کر وہاں موجود کتابوں کا کھنگالا کرتے۔ انہوں نے اس طرح کتابوں کا ایک ذخیرہ جمع کر لیا تھا جو کہ ذیادہ تر انگریزی میں ہوا کرتی تھیں۔

اکثر چھٹی والے دن جو اگر کہیں اور جانے کا موڈ نہ ہو رہا ہو تو پھر وہ مجھے صبح ہی صبح گھر کے سامنے والے پورٹ ٹرسٹ ہالٹ کے اسٹیشن دوڑا دیا کرتے کہ جاؤ اور ٹکٹ گھر سے معلوم کر کے آؤ کہ اگلی گاڑی کتنے بجے آئے گی اور آخری اسٹیشن کے ٹکٹ بھی خرید لینا۔ چونکہ خود مجھے بھی اُن کی طرح سے ٹرین اور ٹرین کے سفر سے بھرپور لگاؤ تھا، لہٰذا میں دوڑتا ہوا جاتا، دوڑتا ہوا آتا اور اپنے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ ٹوٹے پھوٹے لہجے میں اُنہیں اگلی گاڑی کے آنے کے وقت سے آگاہ کرتا۔

امی، ابو کا پروگرام سنتے ہی کھانے پینے کے لیے اتنا کچھ بنا لیتں کہ ہمیں اُس سارے سفر کے دروان باہر سے کچھ بھی لے کر کھانے کی ضرورت تک محسوس نہ ہوتی۔ ہم پورٹ ٹرسٹ ہالٹ کے اسٹیشن سے ریل گاڑی میں سوار ہوتے جو کراچی کے گرد دائرے میں سفر کرتی ہوئی پانچ چھ یا اُس سے بھی کچھ زائد گھنٹوں میں ہمیں واپس وہیں لے آتی کہ جہاں سے ہم سب اُس پر سوار ہوتے۔

مزے کی بات تو یہ تھی کہ اُس سارے سفر کے دوران ابّو کتاب پڑھتے رہتے اور گاہے بہ گاہے اپنی نظریں کتاب سے اٹھا کر ریل گاڑی کی کھڑکی کے باہر تیزی سے دوڑتے ہوئے مناظر پر ڈالتے جاتے۔ گو کہ میں بھی گھر سے اپنے ہمراہ دو تین من پسند کتابیں لے کر چلتا اور ابّو کی تقلید میں اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کتاب پڑھنے کے ساتھ ساتھ ٹرین کی کھلی کھڑکی سے دوڑتے بھاگتے نظاروں کو وقفے وقفے سے دیکھتا جاتا لیکن پھر جلد ہی اُکتا کر کتاب بند کر دیتا اور پوری یکسوئی کے ساتھ لوہے کی دو عمودی سلاخیں لگی بڑی سی کھلی کھڑکی پر اپنی ٹھوڑی ٹکا کر باہر نظر آتے والے مناظر کو بڑی ہی محویت کے ساتھ تکنے لگتا۔

ہوتا کچھ یوں تھا کہ ہم جیسے ہی اپنے مقامی اسٹیشن سے گاڑی میں سوار ہوتے تو آمنے سامنے نصب دو سیٹوں پر سب لوگ براجمان ہو جاتے۔ شاید بہت سے پڑھنے والوں کو یاد ہو کہ اُس دور میں کراچی کی لوکل ریل گاڑیوں میں لکڑی کی پٹیوں سے بنے بینچ نصب ہوا کرتے تھے جس میں ایک لکڑی کی پٹی کے بعد اتنی ہی جگہ خالی ہوا کرتی اور پھر خالی جگہ کے بعد لکڑی کی دوسری پٹی نصب ہوتی۔ جبکہ چند بوگیوں میں آمنے سامنے کشن والے سیاہ ریگزین سے آراستہ آرام دہ صوفے نما سیٹیں بھی ہوا کرتیں۔ ہم کوشش کر کے کوئی ایسی ہی بوگی تلاش کرتے اور پھر جیسے ہی ریل گاڑی چلتی تو امی گھر سے لایا ہوا اپنا عمرو عیار کی

زنبیل جیسا اسٹین لیس اسٹیل کا بڑا سا ٹفن کیریئر کھولتیں اور پھر اُس میں سے برآمد ہونے والی سوغاتیں ہم دورانِ سفر مسلسل تھرماس میں بھری چائے کے ہمراہ نوشِ جان کرتے جاتے اور امی کی ہاتھ کے ذائقے، ریل کے دلفریب و مسحور کن سفر اور شہر کراچی کے مضافاتی علاقوں کے حسین مناظر کی شان میں قصیدے پڑھتے جاتے۔

اکثر ایسا بھی ہوتا کہ ہماری طرح کا کوئی خاندان جو کہ چھٹی والے دن کا لطف اٹھانے کی غرض سے ریل گاڑی کے اُس "ٹور ڈی کراچی" میں ہمارا بوگی نشین ہوتا اور دیکھتے ہی دیکھتے جو معاملہ بچوں کے باہمی کھیل کود سے شروع ہوتا وہ خواتین کی باہمی گفتگو اور پھر مرد حضرات کی باہمی دلچسپی کے امور پر اظہار خیال سے ہوتا ہوا تبادلہِ اشیاء خورد و نوش تک جا پہنچتا اور پھر سب آپس میں یوں شیر و شکر ہو رہے ہوتے جیسے اُن خاندانوں کے مابین ہونے والی آج یہ کوئی اتفاقیہ ملاقات نہ ہو بلکہ برسوں کا دوستانہ رہا ہو۔

کیا بتاؤ صاحب۔۔۔۔۔!، کیا دلکش منظر ہوتا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!!۔

ریل گاڑی چھک چھک چھک کرتی بقول ابّو "چپل پور کے چھ چھ پیسے" کے مدھر

گیت کی تانیں اڑاتی ہوئی اپنی نپی تلی رفتار سے چلی جاری ہوتی۔ کھڑکیوں سے آتے بھیگی نم آلود ٹھنڈی ہواؤں کے دبیز جھونکے بوگی میں سوار افراد کے بالوں کو رقصاں رکھتے۔ ہم بچے بالے یا تو سیٹوں پر بیٹھے "اکڑ بکڑ بمبے بو"، لوڈو، تاش یا " کوا اڑا۔ بھینس اڑی" جیسے کھیلوں میں مگن ہیں۔ خواتین باہم گھریلو و امورِ خانہ داری نوعیت کی گفتگو میں مشغول ہیں۔ مرد حضرات میں موسمی تغیرات، ملکی سیاست، زیرِ نمائش نئی فلموں اور ان میں کام کرتے فنکاروں کے ماضی کی یادگار فلموں اور اُن کے شہاکار گیتوں پر بھرپور بحث و مباحثہ ہو رہا ہے۔ بوگی کے کسی کونے پر لگی نشست پر بیٹھے چند منچلے ٹرانزسٹر ریڈیو پر ریڈیو پاکستان کراچی سے نشر ہونے والے فلمی گیتوں سے دلپشوری کر رہے ہیں اور بوگی کی فضاء میں مہدی حسن مرحوم کی مدھر آواز گونج رہی ہے:۔

کیوں ہم سے خفا ہوگئے اے جانِ تمنا
بھیگے ہوئے موسم کا مزا کیوں نہیں لیتے

ملکی و سیاسی صورتحال پر ہونے والی اُن بحثوں میں ابّو اکثر اپنے مخالفین جو کہ ذرا سا بھی پاکستان یا پھر قیامِ پاکستان کی مخالفت میں کوئی ہلکی پھلکی سی بھی اختلافی بات کرتا یہ کہہ کر ہمیشہ ہی لاجواب کر دیا کرتے:۔

۔"ارے صاحب، بس آپ دیکھتے جائیں، ماشاءاللہ اس وقت بھی پاکستان اپنے تمام ہمسایہ ممالک کے مقابلے میں خوُشحال اور ترقی یافتہ ہے۔آنے والے وقتوں میں پاکستان اور مذید آگے جائے گا، حالات موجود صورتحال سے کہیں اور زیادہ بہتر ہوں گے اور انشاءاللہ ہم بہت ترقی کریں گے"۔

گو کہ ابو کی پیدائش 1942ء میں بھارتی ریاست گجرات کے شہر بھاؤنگر میں ہوئی تھی اور پھر وہ چھوٹی عمر میں اپنے والدین اور دیگر بہن بھائیوں کے ہمراہ ہجرت کرکے اولین شکارپور، سندھ چلے آئے اور بعدازاں وہاں سے کراچی کا رُخ کیا۔اپنی جنم بھومی ہونے کے اعتبار سے وہ اپنی جائے پیدائش کو اکثر یاد کیا کرتے لیکن انہیں بطورِ خاص کراچی سے بے حد لگاؤ تھا اور وہ اُس کے گوشے گوشے سے واقف تھے۔

بحر کیف، گاڑی جب کسی اسٹیشن پر رکتی تو وہاں موجود کنسیشن اسٹینڈس پر زور زور سے بجتے فلمی نغمات کی گونج ٹرین کی کھڑکیوں سے کبھی تیز اور کبھی مدھم ہوتی اندر داخل ہوتی۔گلوکار اے نئیر کا ایک گیت مجھے آج بھی یاد ہے جو میں نے پہلی بار ٹرین کی کھڑکی میں بیٹھ کر سُنا، جو کسی ریلوے اسٹیشن پر قائم چائے کے کھوکھے پر رکھے ٹرانزسٹر ریڈیو پر بج رہا تھا:۔

ملے دو ساتھی، کھلیں دو کلیاں
دیوانہ دل ہے، دیوانہ موسم
گاڑی کے رکتے ہی اُن گیتوں کے ساتھ در آنے والیں دیگر آوازیں کچھ یوں ہوا کرتی تھیں :۔

۔ "چائے والا، چائے والا، چائے والا"، "گجک کراری ہو رہی ہے"، "گرما گرم سموسے، آلو کے گرما گرم سموسے لے لو بھائی"، امرود لے لو، ملیر کا، لاڑکانہ کا، امرود لے لو" "، حکیمی منجن، ہلتے، دکھتے، پیلے اور پایوریا والے دانتوں کا اکسیر علاج، کمپنی کی مشہوری کے لیے صرف اس ٹرین میں رعایتی قیمت پر دستیاب ہے، ایک روپیہ، ایک روپیہ، ایک روپیہ، آواز دیکر طلب کریں"۔
چلیں دوستوں، تو پھر ہم سب اپنا ریل گاڑی کا سفر وہیں سے شروع کرتے ہیں جہاں ہم نے اُسے چھوڑا تھا۔
ہماری ریل گاڑی چھک چھک کرتی، سیٹی بجا بجا کر گاڑھا سیاہ دھواں اڑاتی پورٹ ٹرسٹ ہالٹ کے چھوٹے سے اسٹیشن کو دور پیچھے چھوڑتی ہوئی سائیٹ اور

ماری پور روڈ کو جانے والے جی الانہ روڈ کے پُل کے نیچے سے گزری ہوئی ماری پور روڈ کے متوازی چلتے ہوئے وزیر منیشن ریلوے اسٹیشن کی طرف رواں دواں ہے۔ کچھ دیر وہاں ستانے اور چند ایک مسافروں کو اتارنے اور سوار کرنے کے بعد ریل گاڑی دوبارہ حرکت میں آتی ہے اور دائیں ہاتھ پر متوازی چلتے ماری پور روڈ کی دوسری طرف قائم لیاری اسپورٹس گراؤنڈ (موجودہ پیپلز اسپورٹس کامپلیکس)، ماری پور ٹرک اسٹینڈ اور کراؤن سنیما کو پیچھے چھوڑتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ بچپن ہی سے چونکہ مجھے فلموں سے کچھ خاص لگاؤ رہا، لہٰذا میری پوری کوشش ہوتی کہ میں دیکھ سکوں کہ وہاں اُس وقت کس فلم کے پبلیسٹی بورڈ آویزاں ہیں۔ کچھ دیر چلنے کے بعد غلامانِ عباس اسکول کو پیچھے چھوڑتی ہوئی ریل گاڑی لیاری ندی پر بنے ہوئے ریلوے کے پُل پر آ پہنچتی ہے۔ اِس پُل کے نیچے سے لیاری ندی کا بدبو دار پانی گزرتا ہوا بائیں جانب کچھ ہی آگے بحرِ عرب کے سمندر میں جا گرتا ہے۔

مذکورہ مقام میرے لیے خصوصی دلچسپی کا باعث ہوتا اور میں بڑی مستعدی کے ساتھ سائیٹ ایریاء کی جانب بڑھتی ریل گاڑی کے بائیں جانب کی کسی نشست پر کھڑکی سے لگ کر بیٹھ جاتا اور بڑی ہی محویت کے ساتھ لیاری ندی کو دور بحرِ عرب کے نمکین پانیوں مدغم ہوتے دیکھتا۔ ریلوے پل کے عین نیچے لیاری ندی کے گندے بدبو دار پانیوں میں قریبی باڑوں کی انگنت بھینیس غُسل صحت لے رہی

ہوتیں۔ اُن بھینسوں کو لیاری ندی کے بدبودار اور گندے پانیوں میں یوں نہاتے دیکھ کر ہمیشہ مجھے خیال آتا کہ امی ہر صبح تاکید کے ساتھ جو "خالص"، "صحت افزاء" اور قوت بخش" دودھ ہم دونوں بھائیوں کو پلاتی ہیں اُس کا منبع حفظِ صحت کے تمام تر ملکی" وغیر ملکی اصولوں پر پلتیں یہی بھینسیں ہیں۔

ابّو بتایا کرتے تھے کہ ایک دور میں یہی لیاری ندی اور اُس کا پانی اِس قدر صاف ستھرا ہوا کرتا تھا کہ وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ یہاں نہانے آیا کرتے۔ پھر لوگوں نے اپنے سیوریج کے سارے نالوں کا رُخ لیاری ندی کی طرف کرکے بحرِ عرب کے پانیوں اور اُس میں لبستی مخلوق کو بھی آلودہ کردیا۔

ریل گاڑی لیاری کے علاقے کو پیچھے چھوڑتے ہوئے سائیٹ ایریاء میں قائم بلدیہ ریلوے اسٹیشن آ پہنچی ہے اور کچھ دیر وہاں رک کر آگے بڑھتی ہے۔ یہاں سے ریلوے لائن دو حصوں میں منقسم ہوتی ہے۔ سیدھی لائن ماری پور روڈ کے متوازی چلتی ہوئی وہاں قائم سمندری نمک کے کارخانوں اور پھر اُس سے بھی آگے تک جاتی ہے لیکن وہ ٹریک صرف مال گاڑیوں ہی کے لیے مخصوص ہے۔ جبکہ کراچی سرکلر ریلوے کا ٹریک ماری پور والے ٹریک سے جدا ہو کر دائیں طرف کے موڑ سے جو کہ سائیٹ روڈ کہلاتا تھا اور اب غالباً وہاں نادرن بائی پاس قائم ہوچکا ہے، سائیٹ ایریاء میں داخل ہو جاتا ہے۔

سائیٹ ایریاء میں داخل ہونے کے ساتھ ہی مجھے ہمیشہ ایک فیکٹری کے چھت پر نصب ایک بہت بڑا "ہونہار نپل، سودر اینڈ بے بی فیڈر" کا اشتہاری بورڈ نظر آتا جس میں مخصوص انداز میں شیشے کی بنی ہوئی دودھ کی بوتل دکھائی گئی ہوتی۔ اس کے علاوہ اب جب میں طاقِ نسیاں میں جھانک کر دیکھتا ہوں تو مجھے "ایکسائیڈ بیٹری" اور سب سے بڑھکر ایک مخصوص بُو جو کہ گوار پھلی سے بنائے جانے والے گوند کے کارخانے سے چھوٹا کرتی تھی، خوب یاد آتی ہے۔

سائیٹ ایریاء کی ایک اور سوغات ریلوے ٹریک کے دونوں اطرف قائم فیکٹریوں کی دیواروں پر لکھے کوچنگ سنیٹروں، حکیموں، نجومیوں، سنیاسی باواؤں، منجنوں، ہر بیماری کی واحد داوؤں، مقامی سنیماؤں میں نمائش پزیر فلموں کے اشتہارات، شہر بھی کی طلباء تنظمیوں اور صنعتی علاقہ ہونے کے سبب مزدور یونیوں کے ہتھوڑے اور درانتی سے مزین پیغامات کی بھرمار ہوا کرتی اور مجھے وہ سب دیواری اشہارات پڑھنا بہت ہی اچھا لگتا۔ جسکہ :۔ "اے ون کوچنگ سینٹر"، "نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن"، "جمیت طالبہِ اسلامی" اور چند اور مزرود تنظمیوں وغیرہ کے وہ دیواری اشتہارات میں بڑے ہی غور سے پڑھا کرتا۔ ویسے یہ دیواری اشتہارات تو سارے کے سارے ریلوے ٹریک پر ہی میری تفریح طبع کا سامان بنے رہتے۔

سائیٹ ایریاء سے گزرتے ٹریک کے دونوں اطراف قائم کارخانوں میں بڑی بڑی مشینیں اور کرنیں وغیرہ یوں ساکت کھڑیں نظر آتیں کہ جیسے وہ کبھی چلیں ہی نہ ہوں اور ان تمام فیکٹریوں میں کچھ یوں ہو کا سا عالم ہوتا کہ جیسے کسی جادوگر نے اپنی جادو کی چھڑی گھما کر انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پتھر کا کر دیا ہو۔

گاڑی شیر شاہ پُل کے نیچے سے گزرتی ہوئی شاہ عبدللطیف اسٹیشن کے بعد امریلی اسٹیل فیکٹری کے عقب سے ہوتی ہوئی سائیٹ ریلوے اسٹیشن پر قیام کے بعد پیپسی فیکٹری، منگوپیر روڈ، ہینو پاک موٹرز کی فیکٹری کے عقب سے گزرتی ہوئی منگوپیر اور جبیب بنک کے اسٹیشنوں پر رک کر اورنگی نالے کے ریلوے پُل سے گزرتی ہوئی اورنگی ریلوے اسٹیشن جو کہ دراصل ناظم آباد کے علاقے بڑا میدان میں ہے، پر آ کھڑی ہوتی۔

اب شروع ہوتا ہے ناظم آبار کا علاقہ۔ ٹرین ناظم آباد کے پُل سے ہوتی ہوئی نارتھ ناظم آباد ریلوے اسٹیشن جا پہنچتی ہے جو کہ مجاہد کالونی میں واقع ہے۔ ٹرین آگے موسیٰ گوٹھ، گجر نالہ، اپسرا اپارٹمینٹ اور اُس سے ملحقہ سراج لدولہ کالج کے پاس سے ہوتی ہوئی لیاقت آباد میں شاہراہِ پاکستان کو کراس

کرتی ہوئی گزرتی ہے۔ پھر ٹرین دائیں طرف الاعظم اسکوائر اور بائیں جانب کریم آباد کے علاقے میں موجود دہلی اسکول کے ساتھ ہی لیاقتِ آباد ریلوے اسٹیشن پر آکر رکتی ہے۔ اب ٹرین غریب آباد ریلوے کراسنگ سے گزر کر غریبِ آباد کے علاقے میں داخل ہوتی ہے۔ دائیں طرف غریبِ آباد کا علاقہ پڑتا ہے اور بائیں طرف گورنمینٹ دہلی کالج آتا ہے۔ ٹرین یاسین آباد ریلوے اسٹیشن، اسحٰق آباد کو پیچھے چھوڑتی ہوئی سر شاہ سلیمان روڈ پر موجود ریلوے پُل سے ہوتی ہوئی گلشنِ اقبال کے علاقے میں قائم گیلانی ریلوے اسٹیشن میں داخل ہوتی ہے۔ پھر ٹرین کچھ اور آگے چل کر یونیورسٹی روڈ کو کراس کرکے عزیز بھٹی شہید پارک اسٹیشن جا پہنچتی ہے۔

اکثر ہم لوگ اِس مقام پر پہنچ کر عزیز بھٹی شہید پارک پر اتر جایا کرتے اور پارک کی سیر کرکے دوبارہ اِسی جگہ سے واپسی کی ٹرین پکڑ کر گھر روانہ ہو جاتے۔ پارک سے ملحق موجودہ سندباد پارک والی جگہ کے عین سامنے سے ٹرین راشد منہاس روڈ کراس کرتی ہوئی کراچی یونیورسٹی ریلوے اسٹیشن جا پہنچتی ہے۔ یہ ریلوے اسٹیشن موجود الہ دین پارک کے عین سامنے واقع ہے۔ یہاں سے آگے ریل گاڑی گلستانِ جوہر کے علاقے میں داخل ہوتی ہے اور موجودہ روفی ڈرائیو لیک، ربعٰہ سٹی بلاک 2 اور 3، بائیں طرف ایئر فورس ہیڈ کوارٹرز اور دائیں آرمی آرڈیننس ڈپو کے عین درمیان سے گزرتی ہوئی ڈپو ہل جنکشن پر پہنچتی ہے۔ اِس

جگہ سے زرا سا ہی آگے غالباً ڈالمیاں سمینٹ فیکٹری کے پاس ہل پوائینٹ نام کا ایک چھوٹا سا اسٹیشن تھا اور وہاں سے گزرتے ہوئے ٹرین کراچی ایئرپورٹ کے رن وے کے عین عقب سے گزرتی۔ وہاں چند چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے عقب سے پی آئی اے کے طیارے کھڑے دکھائی دیا کرتے تھے۔ یہاں سے ہماری ریل ناتھا خان پُل کے نیچے سے گزرتی ہوئی بائیں طرف کو مڑ کر شاہراہِ فیصل کے متوازی ملیر کی جانب آگے بڑھنا شروع ہوتی ہے اور شاہ فیصل کالونی اور سعود آباد کے علاقوں کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی ملیر ہالٹ اسٹیشن پہنچے کر اس سفر کی آخری منزل ملیر کینٹ پہنچتی ہے۔

اگر جو میں بُھول نہیں رہا تو یہاں سے انجن ٹرین سے کٹ کر دوبارہ اُس کے پیچھے جا لگتا اور پھر یوں اُس کی واپسی کا سفر شروع ہوتا۔ ابو وہاں سے واپسی کا ٹکٹ خریدتے ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد ٹرین دوبارہ اس اسٹیشن سے روانہ ہو کر واپس شاہراہِ فیصل کے متوازی بلوچ کالونی کی طرف جاتے ہوئے پہلے ڈرگ روڈ ریلوے اسیٹشن پہنچتی۔ یہ مقام مجھے بے حد ذیادہ پسند تھا کیونکہ یہاں سے ریل جب شاہراہِ فصیل کے بالکل متوازی دوڑتی تو شاہراہِ فیصل اپنی دوڑتی بھاگتی ٹریفک کے ساتھ بہت ہی بھلی معلوم ہوتی۔ ٹرین یونہی اپنا سفر کرتی شاہراہ فیصل کے ریلوے اسٹیشنوں کارساز اور شیہد ملت روڈ ریلوے اسٹیشنوں پر رُکتی آخرکار چنیسر ہالٹ کے اسٹیشن اور کالاپل سے ہوئی کراچی کینٹ پہنچی۔

وہاں سے روانہ ہو کر شیخ سلطان ٹرسٹ بلڈنگ کے عقب، پی آئی ڈی سی پُل اور پھر آگے ڈان اخبار کے دفتر، پاور ہاؤس ایلنڈر روڈ، اخبار جنگ کے دفتر، نیشنل بنک ہیڈ آفس، آئی آئی چندریگر روڈ کے عقب سے ہوتی ہوئی کراچی سٹی اسٹیشن پہنچتی اور پھر یہاں سے ہمارا گھر صرف ایک اسٹینڈنگ دور رہ جاتا۔ کچھ ہی دیر میں ٹرین ٹاور کے عقب سے ہوتی ہوئی پہلے اولڈ اور پھر نیو کسٹم ہاؤس کے عقب سے گزرتی آخرکار ہماری منزلِ مقصود یعنی پورٹ ٹرسٹ اسٹیشن پر ہم سب کو اتار کر پھر سے آگے کو روانہ ہو جاتی۔

کہاں جاتا ہے کہ کراچی سرکلر ریلوے 1964ء کے ایوب خان دور میں اپنے قیام کے پہلے ہی برس میں فوری کامیابی کے ساتھ بھرپور منافع بخش اسکیم ثابت ہوئی۔ جبکہ 70 ء اور 80ء کی دھائی کے دوران یہ منصوبہ اپنے عروج پر تھا اور اُس وقت روزانہ کی بیناد پر کراچی بھر میں کل 104 ٹرینیں چلا کرتی تھیں۔ لیکن 1990ء کی دھائی کے دوران پرائیویٹ ٹرانسپورٹر فافیا، کراچی سرکلر ٹرین کے کرتا دھرتاؤں اور اسٹاف کو کرپشن میں ملوث کرکے ان کی ملی بھگت سے اُسے ناکام بنانے میں کامیاب رہا اور 1994ء سے یہ نفع بخش ادارہ مالی بدحالی کا شکار ہوا اور پھر آخرِکار اُن کی حسبِ منشاء 1999ء میں اُسے بند کر دیا گیا۔ یوں عوام اپنی ٹرانسپورٹ کی ضروریات کے لیے فقط نجی ٹراسپوٹروں کے رحم و کرم کے محتاج ہو کر رہ گئے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ ابّو مرحوم مجھے تو کراچی شہر کے حسین مناظر سے ٹرین کے اُس دلفریب و یادگار سفر کی صورت روشناس کرا گئے لیکن ہم اپنے بچوں کو بھلا کیسے اُس سفر کی لذت سے آشنا کر سکیں گے؟

ایک اور بات جو اکثر میرے دل میں آتی ہے اور سوچتا ہوں کہ اگر آج ابّو زندہ ہوتے تو میں اُن سے کہتا کہ آپ تو کہتے تھے کہ ہمارا ملک اور زیادہ ترقی کرے گا۔ اے کاش کہ آپ دیکھتے کہ آپ کا وہ زمانہ کتنا اچھا تھا اور کتنا اچھا ہوتا کہ آج بھی ہمارا شہر کراچی اور ہمارا وطن پاکستان آپ کے دور جیسا ہی ہوتا۔

لیکن میرا دل اب بھی یہ کہتا ہے کہ ابّو بالکل سچ اور درست کہا کرتے تھے کہ:۔

۔"آنے والے وقتوں میں پاکستان اور مزید آگے جائے گا، حالات موجود صورتحال سے کہیں اور زیادہ بہتر ہوں گے اور انشاءاللہ ہم بہت ترقی کریں گے"۔ (آمین)۔

ڈھائی سو رُوپلی کا مجاہد

۔"ارے بھئی شمشاد ذرا اِدھر تو آنا"۔

۔میں نے نیوز روم کے دروازے کے عین ساتھ اسٹول پر بیٹھے سینے سے سر لگا کر سوتے چپراسی کو زور سے آواز دیتے ہوئے کہا۔ میری آواز کی گھن گھرج سے بے چارے نے گھبرا کر ٹھوڑی اٹھائی اور نیند کے خُمار میں ڈوبی ہوئی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

۔"ارے بھئی شمشاد ذرا جلدی اِدھر آؤ"۔

میں نے ایک بار پھر اُسے اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا اور وہ ایک جھینپی ہوئی مسکراہٹ اپنے چہرے پر سجائے تیزی سے میری میز کی طرف دوڑا۔

۔"دیکھو یہ فولڈر فوری طور پر آفاقی صاحب کے پاس لے جاؤ اور اُن سے کہنا کہ اِس میں ایک خط ہے اور میں نے آخر میں اپنا نوٹ بھی درج کیا ہے، اُسے فوری طور پر پڑھ لیں۔ بہت اہم بات ہے"۔

شمشاد نے میرے ہاتھ سے فولڈر لیا اور خاموشی سے سر ہلاتا ہوا آفاقی کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازہ فوری طور پر اپنے خُودکار میکانیکی نظام کے زیرِاثر بند ہو گیا۔ میں مسلسل بند دروازے کو گھورے چلا جا رہا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ کاش میری آنکھوں کی بینائی اِس قدر تیز ہوتی کہ میں دروازے کے پار جھانک کر یہ دیکھ لیتا کہ اُس خط کو پڑھتے ہوئے آفاقی کے چہرے پر کیا تاثرات نمودار ہو رہے ہیں۔

ہمارے اخبار کے نیوز روم میں عین درمیان ایک بڑی سی بیضوی میز لگی ہوئی ہے جس کے گرد کوئی آٹھ دس کے قریب مختلف شعبہ جاتی نیوز ایڈیٹرز مقامی، اندرونِ ملک اور بیرونی ممالک کے نمائیندگان و نامہ نگاران کی ارسال کردہ خبروں اور رپورٹوں کی ایڈیٹنگ کرتے ہیں۔ نیوز روم کے اندر ہی ہارڈ بورڈ کی دیواریں کھڑی کر کے بنائے گئے دو کمروں میں سے ایک میں تو چیف نیوز ایڈیٹر شوکت آفندی اور دوسرے میں ادارتی صفحہ کا انچارج منہاج آفاقی بیٹھتا ہے۔ میری میز کونے میں قدرے الگ تھلگ سی ہے کیونکہ میں ادارتی صفحہ پر شائع ہونے والے کمپوز شدہ مضامین کی پروف ریڈنگ کے علاوہ ایڈیٹر کے نام خطوط اور اخبار کے ہفت روزہ میگزین کے لیے موصول ہونے والے مضامین کو پڑھنے کے بعد ضروری کانٹ چھانٹ کر کے اُنہیں اشاعت کے قابل بنا کر اپنے آگے رکھے آؤٹ

باکس میں ڈال دیا کرتا ہوں جسے کمپوزنگ سیکشن سے کوئی نہ کوئی آ کر لے جاتا ہے۔
اِس سارے دفتر میں آفاقی ہی تو ہے جس سے میں کھل کر بات چیت کر لیتا ہوں۔ گو کہ وہ عمر میں مجھ سے کوئی پندرہ بیس سال چھوٹا ہے لیکن نہ صرف عہدے میں سینئر ہے بلکہ جب آج سے دس سال پہلے میں اپنی فوج کی نوکری سے رٹائیرڈ ہونے کے بعد اِسی اخبار میں نوکری کا اشتہار پڑھ کر انٹرویو دینے کی غرض سے آیا تھا تو میرا انٹرویو خود منہاج آفاقی ہی نے لیا تھا۔ جب اس نے یہ سُنا کہ میں فوج سے رٹائیرڈ ہوا ہوں تو پہلے تو وہ بڑا حیران ہوا اور پھر بولا:۔

۔"بھلا کہاں فوج اور کہاں اخبار کے شعبۂ ادارت کی ملازمت۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟"۔

۔"دراصل مجھے اُردو ادب اور صحافت سے بے حد گہری و دیرینہ دلچسپی ہے"۔

میرا جواب سُن کر آفاقی کے چہرے پر ایک ہلکی سے مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ اپنی عینک کے شیشوں کے پیچھے سے میری آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا:۔

۔"چلیں تو پھر ایسا کیئے لیتے ہیں کہ آپ ایک عدد مضمون یہاں میرے دفتر میں ہی لکھ کر دکھائیں۔ عنوان ہوگا:۔ 'پاکستانی ادب و صحافت کا ایک مختصر جائزہ'۔ اس طرح سے نہ صرف آپ کی اُردو کی جانچ ہو جائے گی بلکہ یہ بھی پتہ لگ جائے کہ آپ اِس ملازمت کے لیے موزوں امیدوار ہیں کہ نہیں۔ آپ کے پاس اس کام کے لیے تین گھنٹے ہیں"۔
خیر صاحب، مجھے اِس دفتر میں کام کرتا دیکھ آپ سمجھ تو گئے ہی ہوں گے کہ میرا لکھا وہ مضمون نہ صرف آفاقی کو پسند آیا اور اُس نے فوری طور پر میری تقرری کا خط جاری کروا دیا بلکہ میرا وہ مضمون اخبار کے مگیزین کی اگلی اشاعت میں اہتمام کے ساتھ شائع بھی کر دیا۔
میں آفاقی کی عزت محض اس لیے نہیں کرتا کہ اُس نے مجھے اِس عہدہ کے لیے منتخب کیا تھا۔ دراصل اِس کا سبب اِس کی غیر معمولی قابلیت اور اُردو ادب اور فنِ صحافت سے اِس کا غیر معمولی لگاؤ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اِن دس سالوں میں، میں نے آفاقی سے شعبۂ صحافت کے بارے میں بہت کچھ سیکھا ہے۔
میری نظریں ابھی تک دروازے پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ اچانک دروازہ کھلا اور میری توقع کے عین مطابق شمشاد سیدھا میری میز کی طرف آیا اور بولا:۔

۔"نجمی صاحب آپ کو صاحب بلا رہے ہیں"۔
۔"یار کتنی بار سمجھایا ہے کہ میرا نام نجمی نہیں ہے، نجم رحمانی ہے لیکن مجال ہے کہ تم نے کبھی میرا نام درست پکارا ہو"۔
میری شکایت سُن کر وہ حسبِ معمول اپنے دانت نکال کر نہ جانے کیابُڑبُڑانا شروع ہو گیا۔ میں اُسے یونہی بُڑبُڑاتا چھوڑ کر آفاقی کے کمرے کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چل دیا۔
۔"جی نجم صاحب آئیں، تشریف رکھیں"۔
آفاقی نے مجھے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر کہا۔
۔"یہ خط کہاں سے آیا ہے؟"۔آفاقی نے خط ہوا میں لہراتے ہوئے دریافت کیا۔
۔"جی یہ آج کی ڈاک سے موصول ہوا ہے"۔

۔"لیکن انجم صاحب، یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک مقتول جو کہ اب اِس دنیا میں موجود ہی نہیں، خط لکھے۔ یہ تو کسی کی شرارت معلوم ہوتی ہے"۔

۔"خیر اب اِسے شرارت تو نہ کہیں آپ۔ یہ خط ایک بے حد گھمبیر داستان بیان کر رہا ہے۔ میرے خیال سے ہماری بھرپور توجہ کا متقاضی بھی ہے۔آپ نے میرا نوٹ تو پڑھ ہی لیا ہوگا۔ یہ ایڈیٹر کے نام موصول ہوا ہے۔ ویسے تو آپ نے ہی میری صوابدید ٹھہرائی ہے کہ میں جس خط کو چاہے شائع کروں لیکن اِس خط کی غیر معمولی نوعیت کے سبب میں نے آپ سے اِسے ایڈیٹر کی ڈاک میں شائع کرنے کی اجازت طلب کی ہے"۔

۔"لیکن بھلا اِسے کیسے شائع کیا جا سکتا ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ کسی نے مقتول کا نام استعمال کر کے یہ خط لکھا ہے"۔

۔"جی آپ درست فرما رہے ہیں۔ لیکن یہ بھی تو دیکھیں نا کہ اِس خط کے مندرجات کس قدر اہم ہیں اور اِس میں اٹھائے گئے نکات کتنے بامعنی اور وزن دار ہیں"۔

۔"لیکن کیا اِس کی اشاعت سے شور نہیں مچے گا؟ ایسا خط جس کا لکھنے والا کب

کا قتل کیا جا چکا ہو اور بناء یہ جانے کہ اِسے کس نے لکھا ہے، اِس کی اشاعت سے اخبار کی ساکھ پر منفی اثر نہ پڑے گا؟"۔

۔"میں نہیں سمجھتا کہ ایسا کچھ ہوگا۔ بلکہ اِس کی اشاعت سے تو ہمارے قارئین پر یہ واضح ہو جائے گا کہ صرف ہمارے اخبار کا نام ہی انصاف کی آواز نہیں بلکہ ہم انصاف کا ساتھ دینے والوں میں سے بھی ہیں۔ ویسے آپ نے بغور اسے پڑھ تو لیا ہے نا؟"۔ میں نے آفاقی کے سامنے پڑے خط کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

۔"ہاں پڑھ تو لیا ہے لیکن ایسا کریں کہ آپ اِسے ایک بار آوازِ بلند پڑھیں اور پھر ہم اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ مقتول سے منسوب کرکے اِسے ہمارے اخبار کو ارسال کرنے کا آخر مقصد کیا ہو سکتا ہے؟"۔

آفاقی کے کہنے پر میں نے خط کو قدرے بلند آواز میں پڑھنا شروع کر دیا:۔

جناب ایڈیٹر صاحب

روزنامہ انصاف کی آواز

میرا نام شاہ زیب ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!!۔

جی ہاں، وہی شاہ زیب خان جس کا قاتل "وڈیرے کا بیٹا"، چھوٹا وڈیرا سائیں اُسے بے گناہ قتل کردینے کی پاداش میں اپنی سزا کے اعلان والے دن فخریہ انداز میں مسکراتے ہوئے اپنی انگلیوں سے وکٹری کا نشان بناتا ہوا کمرہ عدالت سے برآمد ہوا۔

جی ہاں، وہی شاہ زیب خان جس کے قاتل کا چہرے سزا کے اعلان پر یوں دمک رہا تھا کہ جیسے اُسے عدالت نے سزائے موت نہیں بلکہ تمغۂ شجاعت سے نوازا ہو۔

جی ہاں، وہی شاہ زیب خان جس کے قاتل کا بھائی "منجھلا وڈیرا سائیں" احاطۂ عدالت میں اچھل اچھل کر یہ نعرے لگا رہا تھا کہ: "ہم جیت گئے، ہم جیت گئے، ہم جیت گئے"۔

جی ہاں، وہی شاہ زیب خان جس کے قاتل کو اُس کا باپ "بڑا وڈیرا سائیں"، احاطۂ عدالت میں یوں گلے لگا کر اُس کا ماتھا چوم رہا تھا جیسے وہ حج کرکے یا سرحدوں پر دشمنانِ وطن کو جہنم واصل کرکے غازی بن کر لوٹا ہو۔

عین انصاف کے گھر میں اور انصاف فراہم کرنے کے زمہ داران کے نرغے میں یہ

دلخراش مناظر ملک بھر کے بچے بچے نے براہ راست دیکھے۔۔۔۔۔۔۔۔!۔
احاطۂ عدالت میں میرے قاتل کی شرشاریاں، محافظانِ قانون کی دلداریاں، اُس کے چہرے کی سرخیاں، فخر واطیمان اور لواحقین کے رعونت ذدہ چہروں سے ہی خلقِ خدا نے تواِسی لمحے انصاف کی بولی اور اُس بُولی سے کھلیی جانے والی ہولی کی بُو سونگھ لی تھی۔
معزز عدلیہ، انصاف فراہم کرنے والے عزت مآب جج صاحبان اور خود انصاف کی سرعام توہین پر اُسی وقت سوموٹوایکشن لے لیا جاتا تو شاید آج نوبت یہاں تک نا پہنچتی کہ لوگ کہتے کہ میرے خُون کی بولی لگا کر اُس کا سودا کر دیا گیا۔
محترم ایڈیٹر صاحب، اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ معزز عدلیہ چاہے تو اب بھی سوموٹوایکشن لیا جاسکتا ہے۔
چھوٹی چھوٹی بے وقعت باتوں پر سپریم کورٹ میں پٹیشن دائر کرنے والے سماجی، سیہاسی، مذہبی اور عوامی راھنمااِس معاملے پر آخر کوئی پٹیشن کیوں دائر نہیں کرتے؟

یاد رکھیں اگر آج یہ معاملہ معافی تلافی کرکے یونہی رفع دفع کر دیا گیا تو گزرے کل۔۔
۔۔۔۔، میں۔۔۔۔۔۔، شاہ زیب خان قتل ہوا تھا۔ آنے والے کل گھر گھر شاہ
زیب قتل ہوگا اور ہر قتل ہوتے شاہ زیب کے ساتھ ساتھ اُس کا خُون اس قدر ارزاں
ہوتا چلا جائے گا کہ قصاص میں کروڑ تو کیا شاید ہزار بھی نہ ملیں۔
اِس امید کے ساتھ کہ میرا یہ خط آپ اپنے اخبار میں ضرور شائع کریں گے۔
مقتول

شاہ زیب خان

خط پڑھ کر میں نے ایک گہری سانس لی اور پھر آفاقی کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھنے
لگا۔

۔" ایسا کرتے ہیں کہ آپ یہ خط میرے پاس ہی چھوڑ جائیں۔ میں زرا سوچ لوں پھر
دیکھتے ہیں کہ اِس کا کیا کرنا ہے"۔

آفاقی کی بات سُن کر میں کرسی سے اٹھا اور مڑ کر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

اچانک پیچھے سے آفاقی کی اجنبی لہجے میں قدرے دھیمی سی آواز سنائی دی۔

۔"نجم صاحب، زرا سُنیئے گا۔۔۔۔۔۔۔۔!"۔

میں ابھی ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولنے ہی والا تھا کہ آفاقی کی آواز سُن کر چونکا اور پلٹ کر اُس کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھنے لگا۔

۔"نجم صاحب، اگر بُرا نا مانیں تو ایک بات کہوں"۔

۔"جی ضرور"۔

۔"نجم رحمانی صاحب، آپ تو فوج میں رہے ہیں، آپ اتنے بزدل کب سے ہو گئے کہ آپ کو اپنی بات کہنے کے لیے ایک جعلی خط کا سہارا لینا پڑ گیا؟"۔

آفاقی کی دھیمے لہجے میں کہی بات میرے حواس پر تیر کی طرح لگی۔ کچھ دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کو بس خاموشی سے تکتے رہے۔

۔"تو آپ کو پتہ لگ گیا کہ یہ خط میرا ہی تحریر کردہ ہے"۔

۔"نجم صاحب۔۔۔۔۔۔۔۔! میں آپ کو پچھلے دس سالوں سے جانتا ہوں۔آپ کے خیالات اور سوچ سے بھی بخوبی آگاہ ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اتنی سی بات سمجھ نہ پاؤں۔ ویسے تو مجھے اِسے پڑھتے ہی شک سا ہوگیا تھا اور میں نے آپ کو اِسی لئے اِسے پڑھنے کو کہا تھا۔اِسے پڑھتے ہوئے آپ کی آنکھوں کی نمی، لہجے کی کسک اور چہرے کی سُرخی نے ساری بات عیاں کر دی"۔

۔" جی میں نے کسی خوف یا ڈر کے سبب ایسا نہیں کیا بلکہ میرا خیال تھا کہ اگر یہ خط مقتول کے نام سے ہی شائع ہو جائے تو شاید زیادہ اثرانگیز ثابت ہو"۔

۔"تو آپ بھی اُن لوگوں میں شامل ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ صلح نامہ انصاف کا قتل ہے"۔

۔"جی ہاں بات کچھ ایسی ہی ہے"۔

۔"لیکن کیوں؟"۔

۔"آفاقی۔۔۔۔۔۔۔۔"، میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اپنی بات کا آغاز کیا:۔ "میں آج سے لگ بھگ چالیس سال پہلے فوج میں بطور سپاہی ڈھائی سو روپے ماہوار کی تنخواہ پر بھرتی ہوا تھا۔ بھرتی ہونے کے فوری بعد میری پوسٹنگ ایک ایسی سرحدی چوکی پر ہو گئی جہاں ہر وقت سرحد پار سے بلااشتعال گولہ باری ہوتی۔ ایک روز رات کے وقت دشمن کی طرف سے اچانک داغے جانے والا گولہ عین ہماری چوکی پر آن گرا۔ اُس وقت وہاں مجھ سمیت چار سپاہی متعین تھے، سب شدید زخمی ہوئے۔ ہسپتال پہنچتے پہنچتے دو سپاہی شہید ہو گئے۔ صرف میں اور ایک دوسرا سپاہی جانبر ہو سکے۔ لیکن ہم اس قدر زخمی ہو گئے تھے کہ کئی ماہ تک ہسپتال میں ہی پڑے رہے اور پھر کسی قدر صحتیاب ہونے پر چھ ماہ کی رخصت پر بھیج دیا گیا"۔

۔"اوہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔آپ نے پہلے کبھی زکر نہیں کیا"۔

۔" آج بھی نہ کرتا بس یوں سمجھ لیں کہ ضرورتا کر رہا ہوں"۔

۔"ضرورتاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟"۔

۔"جی ہاں ضرور تا۔۔۔۔۔۔۔۔!۔جب میں کچھ دن بعد اِس قابل ہوا کہ تھوڑا اِدھر اُدھر چل پھر سکوں اور گھر میں پڑے پڑے اُکتانے لگا تا تو پٹیوں میں لپٹے جسم کو بے ساکھیوں کی مدد سے گھسیٹ گھسیٹ کر گھر سے باہر نکل آتا۔یوں تو لوگ فوجی اور سرحدوں پر زخمی ہونے کی وجہ سے میرا احترام کرتے لیکن کئی لوگ مجھ پر آوازے اور پھبتیاں بھی کستے"۔

۔"آوازے اور پھبتیاں کستے۔۔۔۔۔۔۔۔!۔مگر وہ کیوں؟"۔

۔"اُن کا خیال تھا کہ میں نرا اُچغد ہوں کہ محض ڈھائی سو روپے کی نوکری کی خاطر اپنی جان جوکھوں میں ڈال رکھی ہے اور میرے پیچھے مجھ پر آوازے کستے۔ان میں چند شرارتی لڑکے تو مجھے دیکھتے ہی نعرہ بازی کرنے لگتے کہ دیکھو وہ جا رہا ہے ڈھائی سو رُوپلی کا مجاہد"۔

۔"آپ کو تو اِن باتوں پر بہت غصہ آتا ہو گا؟"۔

۔"شروع شروع میں تو ان باتوں کو نظر انداز کرتا رہا لیکن ایک دن میرے صبر کا پیمانہ بس چھلک ہی پڑا اور پلٹ کر اُن سے چلا کر کہا کہ اگر میں اور مجھ جیسے ڈھائی سو روپلی کے مجاہد اور ڈھائی سو روپلی کے شہید سرحدوں پر زخمی

نہ ہوں یا اپنی جان نا دیں تو یاد رکھو کہ تم اور ملک بھر کے لوگوں، اُن کی اولادیں، ماں، بہن اور بیٹیاں اپنے اپنے گھروں میں سکون کی نیند کے ایک ایک پل کو ترسیں"۔

۔"واہ کیا سولہ آنے کھری بات کہی آپ نے"۔

۔"ہاں۔۔۔۔۔۔۔ !"۔ میں ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے دور خلاؤں میں گھورتا ہوا بولا:۔ "میری کہی ہوئی وہ بات اُس وقت تو ضرور سولہ آنے درست تھی لیکن نہیں جانتا کہ اب یہ بات سولہ تو کیا دو آنے بھی درست ہے یا نہیں؟"۔

۔"کیا مطلب۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ؟"۔

۔"مطلب تو صاف ظاہر ہے۔ آپ کے خیال میں ہم لوگوں نے وہاں سرحد پر فقط اُن ڈھائی سو رُوپلی کی خاطر گولے کھائے تھے یا آج کی تاریخ میں سرحد پر متعین سپاہی چند ہزار کی نوکری کی خاطر اپنی کروڑوں کی جان دشمن کی ڈھائی رُوپلی کی گولی کھا کر دے دیتا ہے؟"۔

۔"نہیں خیر اب ایسی بھی بات نہیں"۔

۔"بات اصل یہ ہے کہ ہر اِنسان کو اپنی جان پیاری ہوتی ہے۔ جان کی قمیت ڈھائی سو روپلی تو کیا ڈھائی ہزار، ڈھائی لاکھ بلکہ ڈھائی کروڑ سے بھی کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن فقط ڈھائی رُوپلی کی وہ حقیر سی گولی سپاہی اِس آس میں کھاتا ہے کہ یہ گولی کھا کر نہ جانے کتنے ہی معصوم و بے گناہ ہم وطنوں کی قیمتی جانیں دشمن کی ہزاروں اور لاکھوں گولیوں سے محفوظ رہ سکے گیں"۔

۔"بیشک، درست کہہ رہے ہیں آپ"۔

۔"کیا خاک درست کہہ رہا ہوں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ میں شاید واقعی چُغد تھا کہ محض ڈھائی سو رُوپلی کی خاطر سرحد پر دشمن کا گولہ کھا کر لوگوں کی پھبتیاں سہی اور ڈھائی سو روپلی کا مجاہد کہلایا۔ میرے وہ ساتھی جو شہید ہوئے وہ بھی شاید ڈھائی سو رُوپلی ہی کے شہید تھے۔ اُن کی جانیں محض ڈھائی سو رُوپلی کی خاطر رائیگاں چلی گئیں"۔ یہ کہتے کہتے میری آواز شدتِ جذبات سے بھرّا گئی اور میری آنکھیں جو کہ آنسوؤں سے بھر آئی تھیں، اُن کا بوجھ مذید سہار نہ سکیں اور چھلک پڑیں۔

میری یہ حالت دیکھ کر آفاقی تیزی سے اپنی کرسی سے اٹھا اور میز پر رکھا

پانی کا گلاس لے کر میری طرف بڑھا اور گلاس مجھے پکڑا دیا جسے میں نے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ خالی گلاس میرے ہاتھ سے لے کر اِس نے نے مجھے کرسی پر بٹھایا اور بولا:۔

۔"ارے نجم صاحب، آپ تو جذباتی ہو گئے"۔

۔"جذباتی۔۔۔۔۔۔۔۔ !جذباتی نہ ہوں تو کیا کروں۔ کیا میں نے سرحدوں پر گولے کھا کر اپنا تن بدن اِس لیے چھلنی کیا تھا؟ کیا میرے ساتھیوں نے جامِ شہادت اِس لیے نوش کیا تھا کہ وہ "وڈیرے کا بیٹا"، چھوٹا وڈیرا سائیں اپنی سزائے موت کے حکم پر وکٹری کے نشان بنا بنا کر ملک و قوم، اِس کے قانوں دان و قانون پسند بانی، بابائے قوم قائدِ اعظم محمد علی جناح، ملک کے آئین و دستور، قانون و عدلیہ کے رکھوالوں اور ملکی قوانین پر عمل کرنے والی عوام کے منہ پر مسلسل تھوکتا چلا جائے؟ اُس کی مذموم اور قابلِ نفرت حرکات پر اُسے روکنے والے کوئی محض اِس لیے نہ ہو کہ وہ ایک کروڑ پتی وڈیرے سائیں کا بیٹا ہے جس کا اثر و رسوخ حکومت کے اعلیٰ سے اعلیٰ ایوانوں تک ہے۔ اب تو اِسے مقتول کے والدین کی طرف سے معافی نامہ بھی مل گیا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اِس واقعہ کے بعد ملک کے لیے گولی کھا کر جان دینے والا ہر سپاہی خواہ وہ میری طرح ڈھائی سو روپلی کی اوقات والا سپاہی ہو یا پھر چند ہزار

والا، اپنی اپنی لحد میں ضرور تڑپ گیا ہوگا اور اپنی قیمتی جان کو اس قدر سستے میں گنوانے پر ضرور افسوس کر رہا ہوگا"۔ اتنا کہنے کے بعد میں خود پر قابو نہ رکھ سکا اور پُھوٹ پُھوٹ کر رو پڑا۔

۔"ارے آپ مایوس کیوں ہوتے ہیں؟" آفاقی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے دھیرے سے ہوئے کہا۔

۔"مایوس۔۔۔۔۔۔۔ ! آج ہر وہ سپاہی مایوس ہوگا جس نے محض اِس آس میں وہ ڈھائی روپلی کی گولی کھا کر جان دی کہ میری ایک جان کے بدلے انگنت جانیں محفوظ ہو گئی ہیں۔ اگر جو یہ خُونی درندہ باہر نکل آیا تو یہ اور اِس قبیل کے سارے جنگلی درندوں کو معصوم و بےگناہ لوگوں کی جانوں سے کھلینے کا لائسنس مل جائے گا۔ ہاں مگر دوسرے لائسنسوں کی طرح انہیں اِس لائسنس کی کچھ قمیت چکانا ہوگی۔ جس کی ان کے پاس کوئی کمی نہیں"۔

۔"جی ہاں کہتے تو سچ ہیں آپ"۔

۔"ایک سچ اور بھی سن لو کہ آج ہر شہید کو کہ جس نے ملک و قوم کے لیے جان دی، اپنی قربانی ضائع ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی ہوگی اور وہ یہ سوچنے پر

مجبور ہوگا کہ اُس نے تو اپنی جان اِس لیے دی تھی کہ اِس ملک کے سارے شاہ زیبوں کی جانیں محفوظ ہو جائیں۔ لیکن آج اگر مر رہا ہے تو وہی معصوم شاہ زیب خان اور اگر کوئی زندہ ہے اور شاید زندہ بھی رہے گا تو اُس کا قاتل "وڈیرے کا بیٹا"، چھوٹا وڈیرا سائیں اور اِسی قماش کے دیگر لوگ"۔

۔"بس نجم صاحب اب اس بات کو جانے دیں، دیکھیں آپ کے حواس پر بھی اِس کا بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ انشاء اللہ و تعالیٰ، اللہ بہتر کرے گا۔ اور ہاں ایسا کریں کہ یہ خط دو کالمی سُرخی میں اِس کیپشن کے ساتھ کہ یہ جس نے بھی تحریر کیا ہے ادارہ اس کے مندرجات سے متفق ہے، کل کی اشاعت میں ادارتی صفحے پر نمایاں طور پر شائع کرنے کے لیے فوری طور پر کمپوزنگ کے لیے بھیج دیں"۔

یہ کہتے ہوئے آفاقی نے وہ خط مجھے پکڑا دیا۔

چاکِ زندگی کا رفُوگر

ہسپتال کے برامدے میں لگے بینچ پر بیٹھے دونوں پولیس اہلکاروں کی نظریں مسلسل برنز وارڈ کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں پچھلے ایک گھنٹے سے وہاں بیٹھے بے چینی سے اندر گئی لیڈی شوشل ورکر کنیز فاطمہ کا انتظار کر رہے تھے۔ مذید آدھ گھنٹہ گزرنے کے بعد اُنہیں وارڈ کے دروازے سے کنیز فاطمہ تھکے تھکے قدموں سے چلتی دروازے سے برآمد ہوتی نظر آئی۔

دونوں تیزی کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئےاور تیر کی طرح سے اُس کی طرف بڑھے۔ اُنہیں اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر کنیز فاطمہ کے چہرے پر ایک خفیف سی اداس مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

۔"میڈم پھر کچھ بتایا اُس نے؟"۔

اُن میں سے ایک پولس والا جو کہ اپنی وردی پر لگے پھُول کی مناسبت سے سب انسپکٹر تھا، آگے بڑھ کر کنیز فاطمہ سے مخاطب ہوا۔ جواباً اُس نے ایک گہری سانس بھرتے ہوئے اپنے ہونٹوں کو سختی کے ساتھ بھینچ لیا اور اپنی ناکامی کے

اظہار میں نظریں جھکاتے ہوئے دھیرے سے اپنا سر نفی میں ہلا دیا۔

۔"آپ ہی ہماری آخری امید تھیں میڈم"۔ سب انسپکٹر تاسف بھرے لہجے میں بولنا شروع ہوا۔ "آج پندرہ دن ہو گئے ہیں اِس لڑکی کو ہسپتال کے برنز وارڈ میں پڑے اور ہمیں پورا یقین ہے کہ اِسے اِس کے شوہر اور سسرال والوں ہی نے جلایا ہے"۔

۔"جی میرا بھی یہی خیال ہے اور میں پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے بہلا پُھسلا کر حقیقت جاننے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ تو بس مسلسل اصرار کئے جا رہی ہے کہ اچانک چولہہ پھٹ جانے کے سبب وہ جل گئی اور اُس وقت گھر میں وہ اکیلی ہی تھی"۔ کنیز فاطمہ تھکے تھکے سے لہجہ میں دھیرے سے بولی۔

۔"جی ایسا ہی ہوتا ہے ہمیشہ۔ جل کر مرنے سے بچ جانے والی ہر لڑکی اپنے شوہر اور سسرالیوں کو بچانے کی خاطر ایسے ہی بیانات دیتی ہے اور اگر جو لڑکی وقوعے پر ہی چل بسے تو پھر اُس کا شوہر اور دیگر لوگ بھی کوئی ایسا ہی بیان دے کر سارا معاملہ چولہے کے پھٹنے پر ڈال کر بری الزمہ ہو جاتے ہیں"۔ سب انسپکٹر سے ساتھ کھڑا پولیس کانسٹیبل افسردہ لہجے میں بولا۔

۔"پھر عوام اور میڈیا پُلس پر لعن تعن کرتا ہے کہ جی پُلس کچھ نہیں کرتی۔

مگر جب تک مظلوم خود ہماری مدد نہ کرے بھلا ہم اُس کی مدد کیسے کر سکتے ہیں؟"۔ سب انسپکٹر مایوس لہجے میں بولا: "اسی لیے تو ہم ایسے کیسوں کو سلجھانے کے لیے آپ کے ادارے انجمنِ تحفظِ نسواں کی مدد لیتے ہیں اور ماضی میں بھی آپ ایسی کئی لڑکیوں کو سمجھا بجھا کر اپنے خاوندوں اور سسرالیوں کے خلاف گواہی دینے پر آمادہ کر چکی ہیں"۔

۔"ہاں، لیکن یہ لڑکی تو ٹس سے مس ہونے کو تیار نہیں۔ میں نے اِسے بہتیرا سمجھایا، ہر قسم کے تحافظ کی یقین دھانی کروائی لیکن وہ تو بس مسلسل اِسی بات پر ڈٹی ہوئی ہے کہ میرا شوہر مجھ سے بہت پیار کرتا ہے وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ میں نے تو اُسے یہ تک کہا کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!، ارے یہ سامنے والی بینچ پر جو شخص بیٹھا ہے وہ کون ہے؟" اچانک کنیز فاطمہ کی نظر سامنے بینچ پر بیٹھے ایک شخص پر پڑی، جس کے چہرے سے پریشانی مترشح تھی اور وہ نہ جانے کیا سوچتے ہوئے دُور خلاؤں میں گھورے چلا جا رہا تھا۔

۔"جی یہی تو ہے اُس بد نصیب لڑکی کا کمینہ شوہر جس پر ہمیں شک ہے کہ یہ سب اِسی کا کیا دھرا ہے۔ ہم نے اپنا ہر حربہ آزما لیا۔ کم بخت بڑی ڈھیٹ ہڈی کا بنا ہے کچھ اگلتا ہی نہیں اور اِس نے یہ سارا کام اِس ہوشیاری کے ساتھ کیا

ہے کہ کوئی ثبوت تک نہیں چھوڑا۔ دراصل یہ لڑکی ایک چھوٹے سے قصبہ کے رہائشی غریب والدین کی بیٹی ہے۔ جہیز شہیز تو کیا لانا تھا اِس نے، بے چاری شادی کے کوئی سات سال بعد بھی ماں نہ بن سکی تو اِس خبیث نے سوچا کہ چلو زرا اِس کا قصہ یوں ہی پاک کر دیا جائے"۔ سب انسپکٹر غصے سے بولا۔

۔"کیا میں اس کیس کی فائل دیکھ سکتی ہوں؟" کنیز فاطمہ سب انسپکٹر کی بات پر کوئی خاص توجہ دیئے بغیر بولی اور سب انسپکٹر نے بناء کچھ کہے فوراً اپنے ہاتھ میں تھامی پیلے رنگ کی ایک پتلی بوسیدہ سی فائل اُس کے ہاتھ میں تھما دی۔ کچھ دیر کنیز فاطمہ فائل میں لگے چند کاغذات اُلٹ پلٹ کر دیکھتی رہی اور پھر فائل واپس کرتے ہوئے بولی: سب انسپکٹر صاحب، آپ فکر نہ کریں، انشاء اللہ اب آپ کا کام ہو جائے گا" یہ کہتے ہوئے وہ پلٹی اور وارڈ کے کھلے دروازے سے اندر چلی گئی۔ گو کہ اِس بار اُس کی آواز کہیں دُور کسی کنویں سے آتی محسوس ہوئی تھی لیکن اُس کی چال کا والہانہ پن اُس کے اندر اُٹھتے کسی طوفان کا غماز تھا۔

کنیز فاطمہ تیز تیز چلتی ہوئی اُس دس بستروں کے وارڈ کے بیڈ نمبر تین پر جا کر رُک گئی۔ بیڈ پر ایک لڑکی تکیئے پر سر ڈالے اپنی آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ گردن سے نیچے تک کا تمام حصّہ، بیڈ سے قدرے بلند نصف دائرہ بناتے، سفید

چادر سے ڈھکے جالی دار مچھر دانی نما کور کے اندر یوں پڑا تھا کہ اُس کا بُری طرح سے جھلسا ہوا جسم کسی بھی شئے کو نہ چھوئے۔ ڈرپ کی بوتل سے نکلتی تار اُس کور کے اندر جا کر کہیں گم ہو گئی تھی اور یقیناً اُس کی سوئی لڑکی کے ہاتھ ہی میں پیوست ہو گی جو کہ جھلسے ہونے سے سبب اندر ہی تھا اور نظر نہ آتا تھا۔

کنیز فاطمہ کے کھنکھارنے پر اُس لڑکی نے دھیرے دھیرے اپنی پلکیں اٹھا کر دواؤں کے خمار میں ڈوبی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔ "آپ۔۔۔۔۔۔، آپ پھر واپس آ گئیں۔۔۔۔۔۔ کتنی بار آپ کو بتاؤں؟۔۔۔۔۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔ میرے۔۔۔۔۔ شوہر۔۔۔۔۔ نے نہیں۔۔۔۔۔ جلایا ہے!" لڑکی کمزور لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بولی۔

۔"نہیں نازو۔۔۔۔۔۔، اب کی بار میں تم سے کچھ پوچھنے نہیں۔۔۔۔۔۔۔! کچھ بتانے آئی ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔!، اپنی کہانی سنانے آئی ہوں۔۔۔۔۔۔!!!"۔ کنیز فاطمہ کی آواز بدستور کسی اندھے کنویں سے آتی سنائی دی۔

۔"کہانی۔۔۔۔۔۔۔؟ کیسی کہانی۔۔۔۔۔۔۔؟"۔ نازو نے نحیف سی آواز میں پوچھا۔

۔"میری کہانی۔۔۔۔۔۔۔! کنیز فاطمہ کی کہانی۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!!" وہ خُود کلامی کے انداز میں بولی۔

۔"مجھے کوئی کہانی نہیں سننی۔۔۔۔۔۔۔، آپ میرا یقین کیوں نہیں کرتیں کہ میں چولہہ پھٹ جانے سے ہی جلی ہوں"۔

۔"سنو نازو، اب مجھے اِس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ تم خُود جلی یا تمھیں جلایا گیا۔ لیکن اگر تم اپنی زندگی کے چاک دامن کے اصل رفُوگر کو پانا چاہتی ہوں تو تم کو میری کہانی سننا ہی ہوگی" کنیز فاطمہ کی نگاہیں بظاہر تو نازو کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کہیں دُور خلاؤں میں گھور رہی ہوں اور نازو نے اُس کی بات کو کچھ یوں سُنا جیسے اُسے کچھ سمجھ ہی نہ آیا ہو۔

۔"میں کنیز فاطمہ، عمر پچیس برس، قد پانچ فٹ چھے انچ، وزن 110 پاؤنڈ، رنگ گورا، خوش شکل، تعلیم ایم اے، پابندِ صوم و صلاۃ کے لیے ایک مناسب بر کی تلاش ہے، والدین لڑکی کو زیادہ جہیز دینے سے قاصر ہیں۔ نازو۔۔۔۔۔۔۔، یہ تھے وہ حالات جن میں میرے والدین میرے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر میں مبتلا

تھے"۔ کنیز فاطمہ میکانیکی انداز میں سپاٹ چہرے کے ساتھ بولنا شروع ہوئی۔
۔"کافی کوششوں کے بعد آخر میرے والدین میرا رشتہ ایک ایسے خاندان میں کرنے میں کامیاب ہو گئے جن کی شرافت کا ایک زمانہ گُن گاتا اور اُن کا شمار کھاتے پیتے لوگوں میں تھا۔ میرے والدین کو یقین تھا کہ وہ لوگ یہ رشتہ محض میری شکل وصُورت اور اِس سے بھی بڑھ کر میرے کردار، چال چلن، اچھے اخلاق، تعلیم اور صوم و صلاۃ کی پابندی کے سبب کر رہے ہیں۔ لیکن یہ محض اُن کی خام خیالی ہی ثابت ہوئی۔ پہلے پہل تو وہ باتوں میں لپیٹ لپیٹ کر محض اشاروں و کنایوں میں جہیز میں مطلوب اشیاء گنواتے رہے۔ پھر جیسے جیسے شادی کا وقت قریب آتا گیا مطالبات کا برملا اظہار ہونے لگا۔ آخر میرے والدین کو وہی تلخ گھونٹ اپنے حلق سے اتارنا ہی پڑا جس سے وہ بچنا چاہتے تھے۔ انہوں نے میری شادی کے لیے اپنی زندگی بھر کی کمائی، اپنے بڑھاپے کا سہارا اور اپنے سر کی اکلوتی چھت فروخت کر کے ان کے مطالبات پورے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اپنے والدین کو بہت سمجھایا کہ لڑکے والے شرافت کی چادر میں لپٹے وہ بھیڑیئے ہیں جو آج تو جہیز کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن کل شادی کے بعد کسی ایسے ہی مطالبے کے پورے نہ ہونے پر آپ کی بیٹی کا خُون پینے سے بھی گریز نہ کریں گے۔ لیکن میرے والدین مجھے یہی سمجھاتے رہے کہ ایسے رشتے روز روز نہیں آیا کرتے۔ تم جہیز کی فکر مت کرو۔ چاہے ہمیں خُود کو ہی کیوں نہ بیچنا پڑے مگر ہم ایک

ایک چیز کا بندوبست کرلیں گے"۔

۔"میری شادی کو سن کر ایک روز میری کالج اور یونیورسٹی کی کلاس فیلو اور دوست فرزانہ جو کہ مقامی اخبار میں کام کرتی تھی، ملنے آئی۔ اُس نے جب میرا اداس چہرہ دیکھا تو مجھ سے پوچھا کہ کیا میری شادی زبردستی کی جارہی ہے۔ جس پر میں نے اُسے ساری کہانی کہہ سنائی۔ میری کہانی سن کر کچھ دیر تو وہ سوچ میں پڑ گئی، پھر بولی:۔

۔"اگر تم میں ھمت ہے تو تم کوئی ایسا قدم اٹھاؤ جو اِن جیسے لالچی لڑکے والوں کو سارے معاشرے میں بے نقاب کردے۔اِس طرح سے نہ صرف تم ایک لالچی انسان اور اُس کے لالچی گھر والوں سے خود کو بچا لو گی بلکہ اِس بات سے سبق لے کر نہ جانے کتنی لڑکیاں اور اُن کے غریب والدین دوسرے لڑکوں کے لالچی والدین کے جال میں آنے سے محفوظ رہ پائیں گے"۔

۔"پھر اُس نے مجھے ایک ایسا راستہ بتایا جو کہ میرے لیے کٹھن بھی تھا اور اُس میں میری بدنامی کے بھی امکانات تھے لیکن میں نے بھی ٹھان لی تھی کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے میں اپنے بوڑھے غریب والدین کی عمر بھر کی کمائی، اُن کے سر کی چھت کو اِن لالچی لوگوں کے لالچ پر ہرگز قربان نہ ہونے دوں گی۔

اگلے روز فرزانہ کے اخبار کے صفحۂ اول پر میری منگنی کی تصویر جس میں میرا ہونے والا دولہا بھی نمایاں تھا، مکمل حقائق کے ساتھ شائع ہو گئی۔ اُس تصویر اور خبر کے شائع ہوتے ہی شہر بھر میں ہاہاکار مچ گئی۔ لوگوں بطورِ خاص شہر بھر کے متعمد افراد و عمائدین شہر، فلاحی اداروں اور حقوقِ نسواں کی تمام ترتنظیمیں کمر باندھ کر میدان میں کود پڑیں۔ سب نے میری بھرپور حوصلہ افزائی کرتے ہوئے نہ صرف میرے حق میں آواز بلند کی بلکہ مجھے حقوقِ نسواں کا چمپیئن قرار دے دیا گیا۔ میرے نام اور تصاویر کے پلے کارڈز لے کر مختلیف فلاحی اور حقوقِ نسواں کی تنظیموں نے میرے حق میں جلسے جلوس نکالنا شروع کر دیئے۔ یہ صورتحال دیکھ کر لڑکے والوں اور خُود اُس لالچی لڑکے کے تو جیسے ہوش ہی ٹھکانے آ گئے ہو۔ وہ دوڑے دوڑے میرے والدین کے پاس پہنچے اور بات معافی تلافی تک جا پہنچی۔ میرے والدین نے مجھے بہت سمجھایا کہ اب اِنہیں عقل آ گئی ہے اور یہ اپنے کئے پر پشیمان ہیں۔ لیکن میں نے اُس لالچی خاندان میں شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ یہاں تک کہ لڑکے والے شہر کے چند شرفاء کی سفارش بھی لے آئے جس پر میرے والدین نے مجھے ایک بار پھر بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن میرا کہنا صرف یہ تھا کہ:۔

۔"آج تو یہ لوگ اپنی بدنامی کے خُوف سے مجھے جہیز کے بغیر ہی اپنانے کو تیار ہو گئے ہیں لیکن اِن کی لالچی فطرت کو کبھی نہیں بدل سکتی۔۔۔۔۔

۔۔!!!"۔

۔"تو کیا باجی آپ نے اُس لڑکے سے شادی نہ کی؟" نازو جو اتنی دیر سے بت بنی یہ ساری کہانی سن رہی تھی، کنیز فاطمہ کے سانس لینے پر اچانک بول پڑی۔

۔"ہاں میں نے اُس رشتے کو ٹھکرا دیا۔ مجھے اپنے اُس فیصلے پر فخر تو تھا ہی لیکن آج احساس ہوا ہے کہ میرا وہ فیصلہ کس قدر درست تھا"۔

۔"وہ کیسے باجی۔۔۔۔۔۔۔۔؟"۔ نازو نے قدرے حیرت سے دریافت کیا۔

۔"سنو نازو۔۔۔۔۔۔!، ہر انسان کو اپنی زندگی کے چاک کو خُود ہی سینا پڑتا ہے اور تمھیں بھی اپنی زندگی کے چاک چاک دامن کو خُود ہی سینا ہوگا۔۔۔۔۔۔!۔ جانتی ہو نازو۔۔۔۔۔! اگر میں اپنے چاکِ زندگی کی از خُود رفُو گر نہ بنتی اور اپنے والدین اور لوگوں کے کہنے پر اُس لالچی انسان سے شادی کر لیتی تو آج اِس ہسپتال کے برنز وارڈ کے جس بیڈ پر تم لیٹی ہو، میں لیٹی ہوتی"۔

۔"مگر باجی وہ کیسے۔۔۔۔۔۔۔؟"۔ اب کی بار نازو کی آواز میں زمانے

بھر کی حیرت تھی۔

۔"وہ اِس لیے کہ تمھارا شوہر عاصم ہی میرا منگیتر تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!!"۔

کنیز فاطمہ کی بات سُن کر نازو کے چہرے پر ویرانی سی چھا گئی۔اُس کی کٹوروں سی وحشت زدہ آنکھیں لحضہ بھر کو پھیلیں اور پھر وہ نین کٹورے موٹے موٹے آنسوؤں سے جل تھل ہو گئے۔ضبط کا دامن چاک ہوا اور نین دریا پر بندھے سارے بند ٹوٹ گئے۔

دل ایسے شہر کے پامال ہو جانے کا منظر

وہ تیرہ چودہ سالہ بچہ نجانے کب سے اُن اندھیری اور ویران تنگ گلیوں میں بھٹک رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ کچھ تلاش کر رہا ہو۔ کبھی وہ ایک گلی میں جاتا اور سر اٹھا کر اُن تنگ و تاریک گلیوں میں بھُوت کی طرح سے سر اٹھائے کھڑی عمارتوں کو غور سے دیکھتا۔ جیسے وہ کچھ پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ جب مایوس ہو جاتا تو تیزی سے دوڑتا ہوا اگلی گلی میں داخل ہو جاتا۔ اپنا سر اٹھا کر اردگرد کھڑی عمارتوں کو اندھیرے میں پہنچاننے کی کوشش کرتا۔ ناکامی پر اُس کا چہرہ روہانسا ہو جاتا اور پھر وہ بے اختیار آگے دوڑ پڑتا۔

اُس کی سمجھ میں تو جیسے کچھ آ ہی نہ رہا تھا۔ آخر وہ سب گلیاں اُس کی ہر روز کی گزرگاہیں ہی تو تھیں۔ جہاں وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ شام دیر گئے تک کھیلا کودا کرتا۔ لیکن آج اُسے کھیلتے کھیلتے وقت کا کچھ ہوش ہی نہ رہا۔ کب سورج ڈھل گیا اور رات کی سیاہی نے اُس کے اردگرد اپنا جال بُن لیا۔ نہ جانے کھیلتے کھیلتے وہ گھر سے کتنی دور نکل آیا تھا۔ اُس کے سنگی ساتھی بھی کہیں پیچھے رہ گئے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ رات بہت بیت گئی ہو۔ پہلے تو ایسا

کبھی نہ ہوا تھا۔ آج اُسے وہ سارے راستے اور وہ سارے گلیاں انجان اور اجنبی سی لگ رہی تھیں۔

جاڑوں کا موسم تھا۔ لوگ باگ اپنے کاموں کو نمٹا کر جلد از جلد اپنے گھروں کو روانہ ہو چکے تھے۔ وہ جس بھی گلی میں جاتا اُسے کوئی زی روح دکھائی نہ دیتا۔ انسان تو انسان کتے یا بلی کا بچہ تک نظر نہ آ رہا تھا۔ میونسپلٹی کے تمام تر کھمبے بھی تاریک پڑے ہوئے تھے۔ ہلکے ہلکے کہرے نے تنگ و تاریک گلیوں میں کھڑی چھوٹی بڑی عمارتوں کو لپیٹ رکھا تھا۔ عمارتوں کی کھڑکیاں بند تھیں اور اندر سے بھی دبیز پردے اُنہیں یوں ڈھانپے ہوئے تھے کہ بمشکل تمام ہی کہیں کہیں درزوں سے اندر کمروں میں جلتے زرد بلبلوں کی روشنی کہرے کی چادر سے جھانکتی دکھائی دیتی۔ وہ کہرے میں لپٹی روشنی کی اُنہی مدھم مدھم کرنوں کے سہارے اُس عمارت کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا جہاں اُس کا گھر تھا۔ وہ بے حد فکرمند تھا کیونکہ امی ابو اُس کے اتنی دیر گئے تک گھر واپس نہ آنے کے سبب بے حد پریشان ہوں گے۔ یہ فکر اُس کی بوکھلاہٹ میں اضافہ کئے دے رہی تھی۔ سردی کی شدت سے اُس کا سارا جسم کپکپا رہا تھا۔ حالانکہ اُس نے گرم سوئیٹر بھی پہن رکھا تھا لیکن وہ اُس کڑاکے کی سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے ناکافی

تھا۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی بغلوں میں دے رکھے تھے اور اِسی حالت میں تیزی کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا وہ اپنے گھر والی عمارت تلاش کر رہا تھا۔

اچانک کہرے میں لپٹی ہوئی ایک چار منزلہ چھوٹی سی عمارت نظر آئی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اِسی عمارت میں ہی اِس کا گھر ہے۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا عمارت کے قریب پہنچا۔ عجب ہو کا سا عالم تھا۔ آدم نہ آدم زاد۔ تاریکی اور کہرے کی چادر چہار سو تنی ہوئی تھی۔ عمارت کی کھڑکیوں کے پیچھے لگے پردوں کی درزوں سے چھن کر آتی ہوئی روشنی اُس چادر میں شگاف ڈالنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ قریب آ کر لڑکا عمارت کے داخلی راستے پر بنے قدمچے چڑھ کر ایک چھوٹے سے چبوترے پر آ گیا اور ذرا آگے بڑھکر داخلی راہداری پر نصب آہنی جالیوں کو اندر کی جانب دھکیلا۔ رات کے سناٹے اور تاریکی میں جالیاں ایک سماع خراش سی چوووووں کی آواز نکالتی ہوئی اندھیری راہداری میں گم ہو گئیں۔

لڑکا اُس چھوٹی سی تاریک سرنگ نما راہداری میں ڈرتے ڈرتے داخل ہوا۔ اُس چھتی ہوئی راہداری میں گھپ اندھیرا تھا البتہ دیوار کے ایک طرف لگے بجلی کے میٹروں میں ہلکی سی سُرخ روشنی ہو رہی تھی۔ راہداری عبور کر کے وہ عمارت کے

کھلی چھت والے کمپاؤنڈ میں داخل ہو گیا۔ کمپاونڈ کا پتھریلا فرش طے کر کے وہ آگے بڑھکر سمینٹ کے بنے زینوں پر چڑھنے لگا۔ تیزی کے ساتھ دوڑتا ہوا زینے طے کرتا دوسری منزل پر آن پہنچا۔ وہاں چالی نما برآمدے میں کل تین گھر تھے اور عین بیچ والا گھر اُس کا تھا۔ وہ گھر کے دروازے کے قریب آیا جہاں انگریزی میں لکھے نمبر 5 کو دیکھ کر اُسے اطمینان ہو گیا کہ یہ گھر اُسی کا ہے۔ لیکن اُسے یہ سوچ کر پھر حیرت ہونے لگی کہ اتنی رات گئے وہ گھر سے باہر ہے لیکن اُس کے گھر والے اطمینان سے گھر کا دروازہ بند کئے بیٹھے ہیں۔ آس پڑوس کے دونوں گھروں کے دروازے بھی بند تھے۔ دروازوں کے عین اوپر اندھے شیشے کے روشن دان نصب تھے اور تعجب کی بات تو یہ تھی کہ اُن تمام شیشوں سے بھی سیاہ تاریکی ہی جھلک رہی تھی۔

اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو زور زور سے دروازے پر مارنا شروع کر دیا۔ کافی دیر تک دروازہ مسلسل دھڑ دھڑانے کے باوجود بھی نہ تو دروازہ ہی کھلا اور نہ ہی روشندان کے شیشوں سے اندر گھر میں روشنی ہی ہوتی نظر آئی۔ ایک بار پھر اُس کے حواس اُس کا ساتھ چھوڑنے لگے۔ اب اُس نے دروازہ دھڑ دھڑانے کے ساتھ ساتھ زور زور سے صدائیں بھی لگانا شروع کر دیں:۔

۔"امی، امی، دروازہ کھولیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دروازہ کھولیں امی۔۔۔

۔۔۔۔۔ مجھے بہت سردی لگ رہی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ دروازہ کھولیں۔۔۔۔۔۔۔۔
۔ دروازہ کیوں نہیں کھول رہی امی۔۔۔۔۔۔۔۔ امی۔۔۔ امی میں ہوں آپ کا بیٹا
عرفان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔امی پلیز دروازہ کھولیں۔۔۔۔۔۔ امی دروازہ کھولیں پیلیز
مجھے بہت سردی لگ رہی ہے اور مجھے بہت بُھوک بھی لگ رہی ہے اور نیند بھی آ رہی
ہے۔۔۔۔۔۔۔ !!!"۔

یہ کہتے کہتے وہ شدتِ خوف سے رو پڑا اور روتے روتے اُس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔
بُھوک اور تھکن سے وہ پہلے ہی نڈھال سا ہو رہا تھا اور اب یوں رو رو کر چیخ و پکار
کرنے کے سبب اُس پر غشی سی طاری ہونے ہی کو تھی کہ اچانک دروازے کے اوپر لگے
روشندان میں سے روشنی ہوتی نظر آئی۔ روشنی ہوتے دیکھ کر کسی حد تک اُس کے
ہوش ٹھکانے آئے۔ پھر دروازے کی دوسری طرف کسی کے قدموں کی آواز دور سے
بتدریج قریب آتی سنائی دی۔ پھر دروازے کی کنڈی کھلنے کی آواز کے ساتھ یکدم
دروازہ کھل گیا۔ لیکن یہ کیا۔۔۔۔۔۔۔ ! سامنے کھڑی عورت کا چہرہ تو یکسر اجنبی
تھا۔۔۔۔۔!!! وہ اُس عورت کے سپاٹ چہرے کو دیکھ کر گھبرا سا گیا اور لڑکھڑاتے
لہجہ میں بولا"۔

۔"مم م م میری امی کہاں ہیں؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔یہ۔۔۔۔یہ۔۔۔۔۔یہ تو میرا گھر ہے۔آپ کون ہیں؟ میرے امی ابو کہاں ہیں؟"۔اتنا کہہ کر اُس نے عورت کے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی گھر کے اندر داخل ہونے کی کوشش کی لیکن درمیان میں حائل عورت کے سبب جب وہ اندر داخل نہ ہوسکا تو وہیں کھڑے کھڑے گھر کے اندر جھانکتے ہوئے اُس نے روتے ہوئے زور زور صدائیں لگانا شروع کردیں:۔

۔"امی۔۔۔۔۔۔ابو۔۔۔۔۔۔۔آپ لوگ کہاں ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔دیکھیں میں آپ کا بیٹا عرفان آگیا ہوں۔ یہ عورت نہ جانے کون ہے، مجھے اندر گھر میں آنے ہی نہیں دے رہی۔۔۔۔۔۔!!!"۔

۔"کون عرفان، یہاں کوئی عرفان نہیں رہتا اور تمھارے امی ابو بھی یہاں نہیں رہتے۔ جاؤ بھاگ جاؤ۔ چلو نکلو یہاں سے۔۔۔۔۔!!!"۔اتنا کہہ کر اُس عورت نے لڑکے کو دھکا دے کر زور سے دروازہ بند کردیا۔

لڑکا اس عورت کے دھکے سے گر پڑا اور چوٹ لگنے کی وجہ سے سارے بدن میں درد کی لہر سی دوڑ گئی۔

۔"نہیں، نہیں، یہ میرا گھر ہے۔۔۔۔! تم کون ہوتی ہو مجھے دھکا دینے والی۔۔۔۔
۔! میرے امی ابو کہاں ہیں۔۔۔۔! بلاؤ اُنہیں۔۔۔۔۔! اُن سے کہو اُن کا بیٹا عرفان
آیا ہے۔۔۔۔!!!"۔لڑکا زمین پر گرا اپنے ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے زور زور سے
چلایا۔

عرفان ہوش کرو، کیا ہوگیا ہے تمھیں، کہیں کوئی ڈراونا خواب تو نہیں دیکھ رہے۔ اٹھو
ہوش کرو۔ رات کے تین بج رہے ہیں تم اسقدر زور زور سے کیوں چلا رہے ہو؟"۔

عرفان تیزی سے اپنے بستر سے اٹھ بیٹھا۔ اُس کا سارا جسم پسینے سے بھیگ رہا تھا اور ماتھے
پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے رواں تھے۔ کچھ دیر وہ خالی خالی نگاہوں سے چاروں
طرف دیکھتا رہا۔ اُس کی بیوی سدرا نے اُسے پانی کا گلاس پکڑایا جسے فوراً ایک ہی گھونٹ
میں پی گیا۔ پانی کا خالی گلاس سدرا کو واپس کرتے ہوئے اُس نے اپنے بند ہونٹوں کو
ایک ہلکی سی تشکر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ پھیلاتے ہوئے اُسے دیکھا اور بولا:۔

۔"ہاں وہ میں شاید خواب میں ڈر گیا تھا لیکن اب ٹھیک ہوں۔ تم اطمینان سے سو
جاؤ"۔اتنا کہہ کر وہ تکیئے پر سر رکھ کر سیدھا لیٹ گیا اور سدرا کے سائیڈ

لیمپ بجھا دینے کی وجہ سے کمرے میں پھیل جانے والے اندھیرے کو گھورنے لگا۔

۔"یہ تو بالکل وہی خواب تھا جو میں نے آج سے تیس برس پہلے اُس وقت دیکھا تھا جب ہم لوگ اپنے اُس محلے جہاں میں اپنی پیدائش سے لیکر کوئی چودہ برس کی عمر تک رہا تھا سے نکل کر ایک دوسرے محلّہ میں آباد ہو گئے تھے۔ نئے گھر میں پہلی رات جب میں امی کے پہلو میں سو رہا تھا تو یہ خواب آیا اور میں زور سے چیخ مار کر اٹھ بیٹھا تھا۔ امی نے مجھے اپنے سینے سے لگا کر کہا تھا۔

۔"ہائے ماں واری، ماں صدقے، کیا ہوا میرے پتر، خواب میں ڈر گیا تھا"۔ پھر انھوں نے بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے درود شریف اور نادِ علی پڑھ کر میرے چہرے پر پُھونک ماری تھی۔

حالانکہ وہ خُواب اُس دن کے بعد پھر اُسے کبھی نظر نہ آیا تھا لیکن اُس خواب کی ایک ایک بات اُسے آج بھی روزِ اول ہی کی طرح سے یاد تھی۔ خواب میں نظر آنے والی گلیاں، عمارتیں اور وہ 5 نمبر کا گھر سب دراصل وہی اُن کے پرانے محلے والے ہی تو تھے جہاں اُس نے اپنے بچپن کے اولین چودہ سال گزارے

تھے۔ وہ خاموش پڑا مسلسل سوچے چلا جارہا تھا کہ آخر تیس سال بعد چوالیس سال کی عمر میں اُسے وہ چودہ سال کی عمر والا خواب اب پھر دوبارہ کیوں نظر آیا تھا۔

وہ رات کو کافی دیر سے سویا تھا لیکن اُس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ سدرا تو نہ جانے کب کی دوبارہ نیند کی آغوش میں جاچکی تھی۔ وہ دیر گئے تک اپنے دوست مسعود جو کہ اُس کے لڑکپن کا دوست اور کلاس فیلو تھا کے گھر جو کہ ساتھ والی گلی ہی میں تھا میں بیٹھا باتیں کرتا رہا تھا۔ اگلے روز اتوار کا دن تھا لہٰذا وہ دونوں ساتھ ہی تھے جو کہ اُن کا معمول تھا۔

۔"یار عرفان آخر یہ تم نے کیا روز روز کی بے مقصد سی رٹ لگا رکھی ہے کہ مجھے پاکستان واپس جانا ہے"۔

۔"نہیں مسعود یہ بے مقصد کی رٹ نہیں"۔

۔"اچھا اگر یہ بے مقصد کی رٹ نہیں تو پھر کیا ہے بھلا۔ وہاں پاکستان میں لوگ امریکہ آنے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں اور تم ہو کہ گرین کارڈ ہولڈر ہوتے ہوئے بھی ہر وقت واپس جانے کی باتیں کرتے ہو۔ ناں تم مجھے یہ تو

بتاؤ کہ تم وہاں جا کر کرو گے کیا؟"۔

۔"یہ تو خود مجھے نہیں پتہ کہ میں کیا کروں گا"۔

۔"ویسے اب دس برس یہاں امریکہ میں رہ کر تم اِس لائق بھی نہیں رہے کہ وہاں جا کر کچھ بھی کر سکو اور ویسے بھی میں تمھارے مزاج سے بخوبی واقف ہوں۔ تمھارا گزارا تو وہاں اُس وقت بھی مشکل تھا جب تم امریکہ نہیں آئے تھے اور اب آج کے حالات میں تم وہاں کسی طرح سے بھی نہیں رہ سکتے"۔

۔"ناں کیوں نہیں رہ سکتا میں پاکستان میں"، عرفان تنک کر مسعود کی طرف دیکھتے ہوئے بولا " میں وہاں پیدا ہوا ہوں، وہیں پلا بڑا ہوں اور یہاں تو میں اُس وقت آیا جب میری عمر تیس برس سے بھی زائد تھی"۔

۔"ہاں یہ سب باتیں میں بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں"، مسعود کی آواز میں طنز عیاں تھا۔ "تم تو اِس وقت بھی جب تمھارے پاس وہاں کچھ نہیں تھا وہاں کے سسٹم، طریقہ کار کے سخت خلاف تھے۔ اپنے جائز کام کے لیے بھی تم سے رشوت نہ دی جاتی تھی۔ کوئی خلافِ قانون کام تم سے نہ ہوتا تھا۔ سفارش تمھارے پاس نہ تھی، بینک بیلنس، جائیداد تمھارے پلے نہ تھی۔ ہاں ایک بڑی پرائیویٹ فرم میں

تم امپورٹ ایکسپورٹ ڈیپارٹمنٹ کے منیجر ضرور تھے لیکن اپنی غیر ضروری ایمانداری کے سبب اُس پوسٹ پر جہاں یار لوگ کسٹم کے کرتا دھرتاوں کے ساتھ ساز باز کرکے لاکھوں کی اُوپر کی آمدنی بنا لیا کرتے ہیں تم محض اپنی سوکھی سڑی سی تنخواہ میں گزارا کیا کرتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ تمھارے پاس نہ اپنا گھر تھا نہ اپنی گاڑی۔ کرائے کا گھر اور دفتر کی گاڑی ہی وہاں ہمیشہ تمھارا مقدر رہی"۔

۔"یہ سب باتیں میرے مزاج کے خلاف ہیں۔ میری نظر میں رشوت دینے اور لینے والے دوں وں ہی جہنمی ہیں۔ سفارش کسی حقدار کا حق لوٹنے کا دوسرا نام ہے۔ بدعنوانی کرکے کمایا ہوا پیسہ اور اُس پیسہ سے خریدا گیا رزق اولاد میں فساد کا سبب بنتا ہے"۔

۔"تو پھر میرے بھائی تم خود ہی بتاؤ، وہاں اِن سب باتوں کے بغیر تم جی سکتے ہو؟ کیا رشوت دئے بغیر وہاں تمھارا کوئی معمولی سا کام بھی ہو سکتا ہے؟ کیا سفارش کروائے بناء تم کوئی اچھی جاب حاصل کر سکتے ہو۔ کیا کرپشن کیئے بناء تم اتنا کما سکتے ہو کہ اپنے گھر والوں کو خوش رکھ سکو؟"۔

۔"تو میں کوئی کاروبار وغیرہ کرلوں گا۔۔۔۔!"۔

۔"اول تو تم میں کاروباری حس سرے سے ہے ہی نہیں اور اب تو ویسے بھی وہاں کاروبار کرنے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ ہر دوسرے روز تمھیں بھتے کی پرچیاں ملیں گی اور جو اگر بھتہ نہ دیا نا میرے یار تو آدھ چھٹانک کی ایک گولی کسی نہ معلوم شخص کے پستول سے نکل کر تمھارے سینے میں پیوست ہو جائے گی۔ اگلے دن کے اخبار میں دیگر درجنوں مقتولین کے ہمراہ کسی کونے میں تمھارا نام بھی لکھا ہوا ہوگا جسے کوئی پڑھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کریگا اور جو اگر اِس گولی سے بچ گئے تو کسی ایسے خُود کش حملہ آور کا شکار ہو جاؤ گے جو ستر حوروں کے چکر میں تمھیں تمھاری اکلوتی زمینی حور سے بھی محروم کر دیگا"۔

۔"ہاں یہ سب باتیں میں بخوبی جانتا ہوں،اِسی لئے تو تذبذب کو شکار ہوں کہ کیا کروں اور کیا نا کروں"۔

۔"تم نے کبھی سدرا بھابی سے اِس موضوع پر کوئی بات کی؟"۔

۔"ہاں وہ تو روز ہی ہوتی ہے"۔

۔"تو وہ تمھیں کچھ کہتی نہیں تمھاری ان احمقانہ باتوں پر"۔

۔"ارے نہیں یار۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ ہم نے اپنی شادی شدہ زندگی کا یہ سترہ اٹھارہ برس کا عرصہ ایک دوسرے کے مشورے سے ہی گزارا ہے۔ ویسے وہ میری توجہ وہاں کے دگرگوں حالات کی طرف دلواتی تو ضرور ہے لیکن ہمیشہ یہی کہتی ہے کہ اگر تم پھر بھی واپس جانے پر بضد ہی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے"۔

۔"ہاں میں سدرا بھابھی کو اچھی طرح سے جانتا ہوں وہ اُن عورتوں میں سے ہیں ہر قدم ہر اپنے شوہروں کا ساتھ دیتی ہیں"۔

۔"ہاں یار یہ بات تو سولہ آنے سچ ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں شادی اور اُس کے پہلے پانچ سالوں تک تو کچھ بھی نہ تھا۔ لیکن میری بیوی نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا اور ہم باہمی اتفاق اور جدوجہد سے آج یہاں تک پہنچ سکے ہیں۔

۔"ہاں یہ بات تو ہے۔ اللہ نے تمھیں ماشاءاللہ اچھی بیوی اور اچھی اولاد سے نوازا ہے"۔

۔"ہاں شکر الحمداللہ اور تم جانتے تو ہو ہی کہ میری خواہش تھی کہ اللہ

مجھے پہلی بار اولاد کی نعمت سے نوازے تو وہ ایک بیٹی ہو کیونکہ میری کوئی بہن نہ تھی۔

۔"ہاں مجھے معلوم ہے کہ تمھیں بہن کی کتنی چاہ تھی تبھی تو تم نے میری بہن شہنار کو اپنی منہ بولی بہن بنا رکھا تھا"۔

۔"ہاں بس یہی وجہ تھی کہ میں چاہتا تھا کہ میری پہلی اولاد بیٹی ہو اور خدا نے میری سُن لی۔ لیکن بیٹی کا باپ بن جانے کے بعد میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ جو میرے معاشی حالات ہیں اُس میں رہتے ہوئے میں اپنی بیٹی کے لیے کیا کر سکوں گا اور پھر ایک روز میں نے امریکہ جانے کی ٹھان لی"۔

۔"اور آج اِسی امریکہ نے تمھیں کسی قابل بنا دیا ہے تو تم پھر اُنہی مسائل کا شکار ہونا چاہتے ہو جن سے بچ کر یہاں آئے تھے؟"۔

۔"ہاں تو میں نے کب انکار کیا ہے اِن سب باتوں سے۔ میں تو خود ہی بیانگِ دہل کہتا ہوں کہ پاکستان نے ماں کی طرح سے مجھے اپنی کوکھ سے جنم دیا، پال پوس کر بڑا کیا اور امریکہ نے ایک شفیق باپ کی طرح سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سکھایا۔ لیکن اُس ماں کا بھی تو مجھ پر کچھ حق ہے یا نہیں جس نے مجھے

جنم یاد اور جس دیار کے گلی کوچوں میں، میں نے اپنی زندگی کی تیس سے ذائد بہاریں دیکھیں، اُن در و دیوار سے جو میرا رشتہ ہے یہاں آ جانے سے ختم تو نہیں ہو سکتا نا"۔

۔"عرفان، عرفان، عرفان۔۔۔۔۔۔۔۔! یہ سب جذباتی باتیں ہیں اور اِن میں کچھ نہیں رکھا۔ تمھارا پیٹ بھرا ہوا ہے، سر پر اپنی چھت ہے۔ چلانے کو گاڑی ہے۔ بچے دنیا کے سب سے بڑے ملک کی سب سے بہترین اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں۔ تم سمیت اُن کو یہ خُوف نہیں کہ کوئی انہیں اغوا کر کے لے جائیگا، کوئی خُود کش مجاہد اپنے سمیت اُن کے جسموں کے ٹکڑے اڑا دیگا۔ اِسی لیئے اب تمھارے دل و دماغ میں وطن کی محبت کے مروڑ اٹھ رہے ہیں"۔

۔"نہیں مسعود یہ بات نہیں ہے"۔

۔"تو پھر اور کیا بات ہو سکتی ہے؟"۔

۔"تم تو جانتے ہی ہو کہ جب میں یہاں یہ ارادہ باندھ کر آیا تھا کہ خود کو معاشی طور پر مضبوط کر کے پھر اپنی دھرتی ماں کی طرف واپس لوٹ جاؤں گا۔ جب ہم ایک عشرہ قبل یہاں آئے تھے تو وہاں وہ صورتحال تو ہرگز نہ تھی جو آج ہے۔

میں تمھیں آج ایک بات بتاتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔"۔

۔"ہاں بولو، بولتے بولتے رک کیوں گئے؟"۔

۔"جانتے ہو کہ میری امی اور ابو دونوں ہی اپنے خاندان کے وہ پہلے فرد تھے جو کہ پیدائشی مسلمان تھے"۔۔"کیا مطلب"، مسعود کے چہرے اور لہجے میں زمانے بھر کی حیرت تھی۔

۔"دراصل میرے دادا اور نانا دونوں ہی پیدائشی ہندو تھے اور پھر اسلام قبول کیا۔ میرے دادا کے بڑے بھائی یعنیٰ میرے والد صاحب کے تایا ابا سوامی نرائن مندر کے پروہت تھے۔ میری امی اور ابو دونوں اُن کے سلام قبول کرنے کے بعد پیدا ہوئے تو وہ اپنے خاندان کے اولین پیدائشی مسلمان ہوئے کہ نہیں"۔

۔"یار اِس بات کا تم نے پہلے کبھی زکر نہیں کیا"۔

۔"ہاں ویسے ہی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی"۔

۔"پھر"۔ مسعود نے جو کہ اِس سارے قصے میں کھو سا گیا تھا لطف لیتے ہوئے

پوچھا۔

۔"پھر جب پاکستان بنا تو اُس وقت میرے دادا اور نانا دونوں ہی بھارتی ریاست گجرات میں کاروبار کیا کرتے تھے اور بڑی متمول زندگیاں بسر کر رہے تھے۔ وہ وہیں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تھے اِس کے باوجود انہوں نے پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ میری امی اور ابو دونوں کی پیدائش قیامِ پاکستان سے قبل ہندوستانی ریاست گجرات کی تھی اور میں امی ابو کے خاندان کا وہ پہلا فرد ہوں جو پیدائشی پاکستانی ہے"۔

۔"تو دیکھ لو نا، تمھارے دادا، نانا، امی اور ابو سب اپنی جنم بھومیاں تیاگ کر اپنے بہتر مستقبل کی خاطر پاکستان چلے گئے تھے نا تو اسی طرح سے تم بھی اپنے اور اپنی آئیندہ نسل کے بہتر مستقبل ہی کی خاطر یہاں منتقل ہوئے ہو تو پھر آخر اس میں برائی ہی کیا ہے۔ ویسے بھی یہ ساری زمین یہ سارا جہاں اللہ ہی کا تو ہے اور اِسی نے کہا ہے کہ تم میرے فضل کی تلاش میں زمین پر پھیل جاؤ"۔ مسعود سمجھانے والے انداز میں بولا۔

۔"تم بالکل درست کہہ رہے ہو۔ لیکن اُن میں اور مجھ میں بہت فرق ہے"۔

۔" کوئی فرق نہیں، انہوں نے بھی اپنے بہتر مستقبل کے لے ہجرت کی اور تم نے بھی
۔"

۔" نہیں ایسا نہیے ہے۔ انہوں نے نظریات کی خاطر اپنی جنم بھومی تیاگ کر ہجرت کی تھی اور میں نے اپنے معاشی حالات بدلنے کے لیے"۔

۔" میرے بھائی یہ تم کن چکروں میں پڑ گئے ہو۔ کچھ معلوم بھی ہے جب تک معاشیات درست رہتی ہے اُس وقت تک نظریات بھی درست رہتے ہیں اور جہاں معاشیات بگڑی وہاں نظریات دماغ کی کسی کھلی کھڑکی سے یوں راہِ فرار اختیار کر لیتے ہیں کہ اُن کا پتہ نشان بھی نہیں ملتا"۔

۔"تم نہیں سمجھ سکتے یہ سب باتیں"۔ یہ کہہ کر عرفان نے آنکھیں بند کر کے اپنی انگلیوں سے پیشانی کو رگڑنا شروع کر دیا"۔

۔"چلو تو پھر تم ہی مجھے کچھ سمجھا دو"۔۔"مسعود کی بات سن کر عرفان نے آنکھیں کھول کر اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اُس کے چہرے پر ایک اداس سی مسکراہٹ تھی۔

۔"جیسے یہ بھی ایک شہر ہے نا جہاں ہم اور تم رہتے ہیں ویسا ہی ایک شہر ہمارے دلوں میں بھی تو آباد ہوتا ہے۔اب میں کیا کروں کہ میرے شہرِ دل میں جو میلہ لگا ہے اُس کی ہر آواز ہر صدا، ہر نغمہ، ہر گیت، ہر ساز، ہر لے، اُس میں بستا ہر مکین، پر پُھول، ہر خُوشبو، ہر پرندہ، ہر کُوک، ہر درخت، ہر ڈالی، ہر نہر، ہر ندی، ہر سمندر، ہر کنارہ ہر ساحل، ہر گلی، ہر راستہ اور ہر پگڈنڈی کا رُخ اُسی طرف ہے جسے ہم تم سوہنی دھرتی کہتے ہیں"۔

۔"لیکن اب وہ تمھاری سوھنی دھرتی، اتنی سوھنی نہیں رہی جتنی کہ تم چھوڑ آئے تھے۔ .برا نا منانا اب تم اُس سوھنی دھرتی کے لیے اور تمھاری وہ سوھنی دھرتی ایک دوسرے کے لیے مس فٹ ہو چکے ہیں"۔ مسعود قدرے کھردرے لہجے میں بولا

۔"میں بھی یہ بات اچھی طرح سے جانتا ہوں"۔ عرفان کی آواز دور کہیں کسی گہرے اور تاریک کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

۔ "اور یہی بات تو مجھے بے کل رکھتی ہے۔ مجھ سے دل ایسے شہر کے پامال ہو جانے کا یہ منظر دیکھا نہیں جاتا۔ تم کیا جانو جب دل کا شہر پامال ہوتا ہے تو کتنا درد، کتنی تکلیف ہوتی ہے۔اپنے ہی خوابوں کی کرچیاں اپنے ہی دل کے

گوشے گوشے میں جب کھُب جاتی ہیں تو اُس کا درد اور وہ بھی ایسا کہ دل چاہیے کہ کوئی دل ہی کاٹ کر پھینک دے۔ مگر یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہمارے خوابوں ہی کی یہ کرچیاں درد کا سبب ہیں، سدا اُن کرچیوں کو یونہی دل میں پیوست ہی رہنے دیتے ہیں"۔

۔"یار عرفان یہ سب شاعرانہ باتیں ہیں اور شاعری ہی میں اچھی لگتی ہیں"۔

۔" نہیں مسعود یہ شاعرانہ باتیں نہیں یہ سب سچ ہے۔۔۔ ! ایک کڑوا سچ۔۔۔۔۔۔ !

۔ میرے ابو مجھ سے کہا کرتے تھے کہ جب وہ اپنے ابو کی انگلی پکڑ کر پاکستان آئے تو اُن کے ابو نے اُن سے کہا تھا کہ دیکھنا بیٹا ایک دن ہمارا یہ پاکستان کتنا آگے جائے گا کتنا ترقی کریگا اور پھر یہی بات میرے ابو مجھے ساری زندگی کہتے رہے لیکن آج میرے دادا اور ابو دونوں ہی کی ساری امیدیں، اُن کے خواب، اُن کا دل ایسا شہر پامال ہو رہا ہے اور کوئی اِس پامالی کو روکنے والا تک نہیں۔ شاید اچھا ہی ہے کہ اب وہ دونوں ہی اِس دنیا میں نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!!"۔

عرفان کی سُرخ ہوتی آنکھوں سے آنسو یوں بہے چلے جا رہے تھے جسے آنسو نہ ہوں شہر دل کے پامال ہوجانے کا ماتم ہو جو اُس کی آنکھیں آنسوؤں کی شکل میں

کر رہی ہوں۔

اتنا کہہ کر وہ مذید کچھ کہے بغیر ہی وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا اور باہر نکل آیا۔ رات کے ساڑھے بارہ کے قریب کا عمل رہا ہوگا۔ ماہ اکتوبر کے وسط کی گلابی سردی اور ہلکے ہلکے کہرے نے گلیوں اور اُس کے دونوں اطراف بنے ہوئے ایک سے مکانات کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں ہالووین کا تہوار آنے والا تھا۔ لوگوں کے مکانات کے دروازوں پر نارنجی پمکین (کدو) جنھیں اندر سے کھو کھلا کر کے اندر چھوٹے چھوٹے بلب نصب کر دیئے گئے تھے اُن کی روشنی چاقوں کی مدد سے بنائی گئ آنکھوں، ناک اور منہ سے چھن چھن کر باہر آ رہی تھی، عجب ھیبتناک سا ماحول پیش کر رہی تھیں۔

یہ سب دیکھ کر اُسے اپنے بچپن کا وہی خواب یاد آنے لگا جس میں وہ ایسی ہی کہرے میں لپٹی ایک تاریک اور ویران رات میں گلیوں میں دوڑ دوڑ کر اپنا گھر تلاش کر رہا ہوتا ہے۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے خُواب میں تو وہ صرف اپنے بچھڑے ہوئے محلے میں کھو گیا تھا لیکن اب کی بار تو وہ زندگی کے وسیع و عریض محلے کی پُر پیچ گلیوں اور اُن کی بھلبھلیوں میں کچھ ایسا کھو گیا ہے کہ اُسے معلوم بھی ہے کہ اُس کا گھر کہاں ہے لیکن وہ چاہتے ہوئے بھی وہاں جا نہیں سکتا۔

عرفان تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے گھر پہنچا۔ اندر داخل ہونے کے بعد وہ اپنی اسٹڈی کی طرف چلا پڑا۔ اُس کی آنکھوں میں نیند کا کوئی سایہ تک نہ تھا۔ اسٹڈی میں جا کر کتابوں والی الماری میں سے اُس نے ایک کتاب نکالی اور اُس کے صفحات پلٹنے لگا۔ پھر ایک جگہ پر رک کر اپنی آرام کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔ کتاب کے اُس صفحے پر اُس کی نظریں افتخار عارف کی نظم پر جمی ہوئی تھی۔

ابھی کچھ دن لگیں گے

ابھی کچھ دن لگیں گے

دل ایسے شہر کے پامال ہو جانے کا منظر بھولنے میں

ابھی کچھ دن لگیں گے

جہان رنگ کے سارے خس و خاشاک

سب سرو صنوبر بھولنے میں

ابھی کچھ دن لگیں گے

تھکے ہارے ہوئے خوابوں کے ساحل پر

کہیں امید کا چھوٹا سا اک گھر بنتے بنتے رہ گیا ہے

وہ اک گھر بھولنے میں

ابھی کچھ دن لگیں گے
اُسے نظم کی آخری چار سطور تو بہت ہی اچھی لگتی تھیں۔ کیونکہ خُود اُس نے اور اُس کی بیوی سدرا نے بھی تو بڑی محبت بھری آس سے اپنے
آبائی شہر کے سب سے خوبصورت علاقے میں جو انُہیں اپنے تھکے ہارے خُوابوں کا ساحل ہی تو لگتا تھا، اِس امید پر ایک چھوٹا سے گھر بنایا اور خُود اُسے اپنے ہاتھوں سے سجایا تھا کہ ایک روز وہ اپنی حسین امیدوں کے اِس گھر میں ہنسی، خوشی، سکھ اور اطمینان کے ساتھ رہیں گے۔ لیکن اُن کی امیدوں کا وہ حسین گھر بن کر بھی بن نا سکا اور اُس گھر کے ہوتے ہوئے بھی وہ کبھی اُس میں رھنے کے لیے واپس نہ جا سکے۔
کچھ دیر وہ یونہی اپنی نظریں کتاب پر جمائے آرام کرسی پر پڑا سوچتا رہا۔ پھر کتاب کو وہیں زمین پر چھوڑ کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے بیڈ روم تک آیا جہاں اُس کی بیوی سدرا گہری نیند میں ڈوبی سو رہی تھی۔ شبِ خوابی کا لباس پہن کر وہ لیٹا تو اُسے نیند آ گئی اور پھر سدرا نے ہی اُسے خواب میں چیختے چلاتے ہوئے جگایا تھا۔
اب وہ پچھلے ایک گھنٹے سے یونہی لیٹا اپنی اور مسعود کے درمیان ہونے والی

باتوں کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔

اُس نے سوچا کہ اِسے اپنی امیدوں کا وہ چھوٹا سا گھر جو بنتے بنتے رہ گیا تھا بُھولنے میں کتنے کچھ دن لگیں گے۔۔۔۔۔۔۔؟

شاید ابھی کچھ اور دن لگیں گے۔۔۔۔۔!!!۔

ہاں شاید افتخارف عارف صاحب نے درست ہی کہا ہے کہ:۔

۔"ابھی کچھ دن لگیں گے"۔

اُس کے چہرے پر ایک اداس دھیمی سی مسکراہٹ جھلملائی کیونکہ شاید اُسے اِس بات کا کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ واقعی اُسے وہ ایک گھر جو بنتے بنتے رہ گیا۔۔۔۔۔۔! بھولنے میں کچھ دن تو ضرور لگیں گے۔۔۔۔! اب یہ اور بات ہے کہ وہ کچھ دن آتے آتے شاید اُس کی زندگی ہی کا آخری دن آ جائے۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!!۔

آخر کب تک؟

۔"او کی ہویا نی کڑیئے۔۔۔۔۔۔؟"۔

جیسے ہی اُس نے آنکھیں کھولی، اسٹریچر کے قریب کھڑے پولیس کے سپاہیوں میں سے ایک آگے بڑھ کر اُس پر قدرے جھکتے ہوئے بولا۔ مگر وہ اپنی خالی خالی آنکھوں کے بڑے بڑے ڈیلوں کو اِدھر اُدھر یوں گردش دے رہی تھی جیسے وہ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ وہ ہے کہاں اور یہ جو اِس کے گرد گھیرا لگائے کھڑے ہیں، سب کون ہیں؟۔

۔"او کا کی تُوں دسدی کیُوں نئیں، آخر ہویا کی سی۔۔۔۔۔؟"۔

سپاہی نے اپنی بات کا جواب نہ پا کر اس بار قدرے بلند آواز میں سوال کیا۔

اپنی آنکھوں کی گردش کرتی پتلیوں کو یک لخت روک کر وہ خالی خالی آنکھوں اور سپاٹ چہرے کے ساتھ سپاہی کو گھورنے لگی۔ چند لمحات تک یونہی دیکھتی رہی اور پھر لاتعلّقی سے نگاہیں پھیر لیں جیسے نہ تو اِسے سوال سمجھ آیا ہو اور نہ

ہی وہ خود اپنی یہاں موجودگی کا کوئی جواز ہی ڈھونڈ پائی ہو۔ اُس نے کسی نہ معلوم صدمہ کے سبب سوجھی اپنی بڑی بڑی آنکھیں جن میں تیرتی سُرخی کو باآسانی دیکھا جا سکتا تھا، بند کرکے اُنہیں بھینچ لیا۔ کچھ دیر یونہی بے جس و حرکت پڑی رہی پھر اچانک آنکھیں کھول کر چھت پر نصب ہلکی سی بے ڈھنگی رفتار سے چلتے پرانی وضع کے پنکھے کی طرف ٹکر ٹکر دیکھنے لگی۔ اُس کی آنکھوں کا خالی پن اب بھی یونہی عیاں تھا۔

اچانک اِس کی آنکھیں کسی اندرونی جذبے کے تحت یوں پھیلیں جیسے اُسے کچھ یاد آ رہا ہو اور پھر اُس کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑ سی گئیں اور اُن میں زمانے بھر کا خوف جھلکنے لگا۔

اُس نے ایک بار پھر اپنی آنکھوں کے ڈیلوں کو گردش دے دے کر اِرد گرد کھڑے لوگوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا جیسے وہ اُن میں سے کسی اپنے کو تلاش کر رہی ہو۔ اِس کوشش میں ناکام ہونے پر اُس کی موٹی موٹی دہشت زدہ آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں اور وہ یک لخت اسٹریچر سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں چلاتی ہوئی زور سے چلائی:۔

۔"پینو۔۔۔۔۔۔۔۔۔!، شیداں۔۔۔۔۔۔۔۔۔!، سکینہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

صغراں۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!!۔،

کوئی جواب نہ پا کر اُس کی آنکھوں سے پُھوٹی وحشت، شدتِ جذبات سے سُرخ ہوتے چہرے پر ٹپکنے لگی۔ آنسو آنکھوں سے گر گر کر رُخسار کو بھگونے لگے۔ ہونٹ پہلے تو کسی مرغِ بسمل کی مانند پھڑکے لیکن اُس نے اُنہیں آپس میں یوں بھینچ لیا جیسے وہ اپنے لبوں سے کسی بھی لمحہ برآمد ہوتی آہ وزاریاں مُقفل کر دینا چاہتی ہو۔ لیکن اِس کوشش نے اُس کے دل و دماغ میں بپاء کشمکش کو اُس کے چہرے پر مذید عیاں کر دیا۔ اپنے ہونٹ اُس نے بھلے ہی بھینچ لئے ہوں لیکن اُس کی آنکھوں سمیت چہرے کا ایک ایک حصہ غم و الم کی شدت سے نوحا کناں تھا۔

اچانک وہ اٹھی اور تیزی سے اپنے اسٹریچر کے دائیں جانب ایک دوسرے سے لگ کر کھڑے تین چار سپاہیوں، جن کے عین عقب میں مذید کچھ اور اسٹریچروں کی جھلک نظر آ رہی تھی، کو دھکا دیتے ہوئے اُن کے درمیان سے گزر گئی۔ پہلے چار اسٹریچروں پر سر سے پاؤں تک سفید چادریں اوڑھے کوئی لیٹا ہوا تھا۔ اُس نے دوڑ کر تیزی سے ایک ایک چادر کو نوچ ڈالا۔ وہ چار نوجوان لڑکیوں کی نعشیں تھی۔ اُن کی گردن سے سر تک حائل سفید پٹیاں اور ناک کے دھانوں میں دھنسی روئی کے سفید پھاہے اِن کے مردہ ہونے کی تصدیق کر رہے تھے۔

اُن کے سفید کورے لٹھے جیسے چہرے دیکھ کر ایک لحظہ جیسے اُس پر سکتہ سا طاری ہو گیا ہو۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اپنے تن من کا ہوش گنوا کر اسٹریچروں کے درمیان دوڑتی ہوئی اُن چاروں نعشوں کو جنھجوڑ جنھجوڑ کر جگانے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن مجال ہے کہ اُن چاروں اسٹریچروں پر پڑی نعشوں میں سے کسی ایک پر بھی اُس کی آہ و بکا اور جنھجوڑے جانے کا کوئی اثر پڑا ہو یا اُن کی حالتوں میں چنداں کوئی فرق آیا ہو۔

اُن نعشوں کو یونہی بے حس و حرکت پڑا دیکھ کر اُس کی چیخ و پکار اور آہ وزاریاں زور پکڑنے لگیں۔ اُس نے اپنے سر، چہرے اور سینے پر ہتھڑ مار مار کر زور زور سے روتے ہوئے بین کرنا شروع کر دیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں اور لبوں سے غم والم میں ڈوبی چیخیں برآمد ہو رہی تھیں۔ وہ اپنے سامنے اسٹریچروں پر پڑی ایک ایک نعش کے پاس جا جا کر اُس کا نام لے لے کر پکار رہی تھی:۔

۔" پینو۔۔۔۔۔۔، نی پنیو۔۔۔۔، مینوں وی اپنڑے نال لے چل نی"۔

۔" مینوں کلّم کلّی چھڈ کے کتھے ٹُر چلیں ایں توں۔۔۔۔۔۔ شیداں"۔

۔"سکینہ توں تے کیہا سی کہ ابا ساڈی ڈولیاں نیئں ٹور سکدا۔۔۔۔، تے اِسی آپے ای دریا وچ ٹُور جانڑا سی"۔

۔"نی صغراں، تو تے اتے دی سب توں لاڈلی دھی سی۔۔۔۔۔۔۔۔، ابا آکھے گا کہ ہائے او ربا کتھے گئی اے، میری صغراں۔۔۔۔۔۔۔۔، وے دس نی تے میں اونُوں کی کیہواں گی

ہچکیوں کی شدت سے اُس سے بولا نہ جارہا تھا۔ ہر ہر لفظ کے بعد وہ کئی کئی طویل ہچکیاں لیتی۔

۔"ہن مینوں تے دسدی جا۔۔۔۔، میں کی کراں۔۔۔۔۔۔۔، ابا کیویں میرا ویاہ کرائے گا۔۔۔۔۔۔، اودھے کول تے کجھ وی نئیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔، تسی ساریاں نے میرے نال دغا کیتا اے۔۔۔۔۔۔۔، میں کیہنی آں۔۔۔۔۔۔، مینوں وی اپنڑے نال لے چل۔۔۔۔۔۔۔۔، ساڈا غریب پیو کتھوں میرے ویاہ لئی داج لیہاوے گا"

۔مسلسل رونے، آہ وزاری اور سینہ کوبی کرنے کے سبب اُس پر غش پر غش پڑنے لگے اور پھر یک لخت لہرائی اور فرش پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔

۔"ناظرین۔۔۔۔۔، اِس وقت ہم یہاں لاہور سے 346 میل دُور صوبہ پنجاب کے ضلع وہاڑی کی تحصیل میلسی کے گورنمینٹ ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں موجود ہیں۔ ابھی آپ سب نے اپنے ٹی وی اسکرینوں پر ہماری خصوصی بریکنگ نیوز میں جو دردناک مناظر براہ راست ملاحظہ کیئے ہیں وہ میلسی کے نواحی علاقے کی رہائشی بیس سالہ معصوم بچی کے تھے جس نے اپنی دیگر چار بہنوں کے ہمراہ مقامی نہر میں اِس لیے خودکشی کی نیت سے چھلانگ لگائی تھی کہ اِس کے غریب و مفلس باپ کے پاس اِن کی شادی کے لیے طلب کئے جانے والے جہیز کے پیسے نہ تھے۔ وہ لڑکے والوں کی طرف سے طلب کئے جانے والے بیش بہا جہیز کا بندوبست کرنے سے قاصر تھا۔ لہٰذا اِن کی شادیاں نہیں ہو پا رہی تھیں۔ اِس وجہ سے اِن کا بوڑھا باپ بے حد پریشان رہتا تھا۔ اپنے بوڑھے باپ کو اِس روز روز کی پریشانی میں گھلتا دیکھ کر اِن پانچوں بہنوں نے فیصلہ کیا کہ وہ خودکشی کر کے اپنے باپ کو اِس پریشانی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات دلوا دیں گی۔ گذشتہ رات یہ پانچوں بہنیں خود کو سیاہ چادروں میں لپیٹ کر رات کی تاریکی میں گھر سے نکل کر مقامی نہر پر اجتماعی خودکشی کی نیت سے پہنچیں اور نہر میں کود کر جان دینے کی کوشش کی۔ نہر کا تیز بہاؤ اِن سب کو اپنے ساتھ کافی دور تک بہا کر لے گیا۔ وہاں موجود چند مقامی لوگوں نے اپنی جان پر کھیل کر اِنہیں بچانے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن نہر میں پانی کے غیر معمولی بہاؤ نے اُنہیں

کامیاب نہ ہونے دیا۔ جب ان پانچوں کو نہر سے نکالا گیا تو اُس وقت تک چار بہنیں اپنی زندگی کی بازی ہار چکی تھیں جبکہ ایک بہن بشیراں کو اکھڑی اکھڑی سانسیں لیتا دیکھ کر فوری طور پر یہاں ہسپتال پہنچایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے اُس کے پیٹ میں داخل ہونے والی پانی کو نکال کر اِس کی جان بچالی"۔

اِن چاروں بہنوں کی لاشیں اور بچ جانے والی بہن کی آہ و بکا ہم سب اور ہمارے معاشرے سے یہ سوال کر رہی ہیں کہ آخر کب تک ہمارے معاشرے میں جہیز کا عفریت غریب والدین کے دن رات کا چین اور اُن کی معصوم و بے گناہ بیٹوں کی قربانی لیتا رہے گا۔

رپورٹر جلیل حسن، کیمرہ مین رفیق اختر کے ساتھ، آخر کب تک نیوز، میلسی"۔

۔"او کاکا۔۔۔۔۔۔۔۔ اوے آخر کب تک نیوز۔۔۔۔۔ چلو جلدی سے وارڈ خالی کرو۔ ۔۔۔۔۔۔ ویکھدے نیئں اے کاکی بے ہوش ہو گئی اے۔۔۔۔۔۔۔ یہ ہسپتال ہے کوئی تمھارا ٹی وی سٹوڈیو نیئں۔۔۔۔۔۔۔۔۔!" وہی سپاہی جس نے نذیراں کے ہوش میں آنے پر اُس سے سوال کیا تھا، رپورٹر کی جانب آتے ہوئے بولا۔

۔"شاہ جی، آپ کا بہت بہت شکریہ"۔ رپورٹر سپاہی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر اُسے ایک کونے میں لے جاتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے بولا: "شاہ جی آپ کی وجہ سے تو آج ہمارے ٹی وی چینل پر یہ نیوز سب سے پہلے بریک ہوئی ہے۔ اگر جو آپ مجھے فون کر کے وقوعے کی اطلاع دے کر وارڈ میں آنے کی اجازت نہ دیتے تو یہ بھلا یہ سب کچھ ممکن تھا؟۔ اتنا کہہ کر رپورٹر نے اپنی بند مٹھی سے سپاہی کے ہاتھ میں کچھ منتقل کر دیا جیسے اِس نے فوراً اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اپنی پتلون کی آگے والی جیب میں ڈال دیا۔

۔"اچھا اب تم سب لوگوں اپنا بوریا بستر یہاں سے سمیٹو۔ ہمیں ابھی اِس کاکی کے ابے کا بیان شیان وی لینا ہے۔ معلوم تو ہو کہ آخر اندر کی بات کیا تھی۔ ویسے یہ معاملہ اتنا سیدھا معلوم نہیں ہوتا جتنا نظر آ رہا ہے۔ ابھی تو اِس کے ابے سے ہمیں ان کے آشناؤں کے نام بھی تو اگلوانے ہیں"۔ سپاہی نے دھیرے سے اپنی آنکھ کو دبایا اور بڑے ہی مکروہ انداز میں اپنے دانت نکالتا ہوا بولا۔

۔"ہاں ہاں۔۔۔۔۔۔۔!، کیوں نہیں کیوں نہیں۔۔۔۔۔۔اور اگر جو کچھ اندر کی بات ہاتھ لگ جائے تو آپ نے پہلے کی طرح ہمارے چینل کو نہیں بھولنا۔ مجھے ہی فون کرنا ہے آپ نے۔ ویسے آپ کے پاس میرا موبائل نمبر تو

ہیں نا؟ قسم اللہ کی ایسی رپورٹ چلاؤں گا اگر کاندھے پر افسرانِ بالا دو ایک پھُول لگانے پر مجبور نہ ہو جائیں تو بے شک میرا نام خلیل سے زلیل رکھ دینا"۔ رپورٹر نے بھی سپاہی کو آنکھ مار کر اپنے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

اِسی وقت وارڈ میں نرس کی آواز گونجی:۔ "ڈاکٹر صاحب، نذیراں کو ہوش آ رہا ہے"۔

نذیراں جسے بے ہوش ہونے کے بعد پیرامیڈیکٹ اسٹاف نے فرش سے اٹھا کر اِسٹریچر پر لیٹا دیا تھا۔ اپنی آنکھوں کو بھینچ کر کسمسا رہی تھی۔ اِس کی یہ حالت دیکھ کر رپورٹر نے اپنی کیمرہ ٹیم تو اشارہ کیا۔ اِشارہ پاتے ہی کیمرہ اور لائٹ میں مستعد ہو گئے۔ لائٹ آن ہوتے ہی کیمرہ میں نے رپورٹر کو اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی رپورٹر ایک بار بڑے ہی غمناک انداز میں بولنے لگا:۔

۔"ناظرین! ایک بار پھر ہم آپ سے اُسی ہسپتال کے ایمرجنسی روم سے مخاطب ہیں جہاں کل رات کو وقوع پذیر ہونے والے دردناک واقعے جس نے سارے قصبے کی فضاء کو سوگوار بنا دیا ہے اور ہر صاحبِ اولاد اور صاحبِ دل کی آنکھیں اِشکبار ہیں۔ وہ پانچ بدنصیب بہنیں جن میں سے چار جان بحق ہو چکی ہیں اور واحد بچ جانے والی بہن نذیراں کو اب دھیرے دھیرے ہوش آ رہا ہے۔ آپ یہ درناک مناظر

اپنی ٹی وی اسکرین پر براہ راست دیکھ رہیں ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!"۔

یراں اپنی آنکھیں کھولے حسرت ویاس بھری نگاہوں سے چھت پر لگے پنکھے کو گھور رہی تھی۔

خلا (افسانہ)۔

۔"اکرام۔۔۔۔۔۔!، زرا جلدی سے میرے کمرے میں آؤ"۔ شاہکار جیولرز کے مینیجر احسانی نے اتنا کہہ کر انٹرکام رکھ دیا اور اپنی نشست سے پُشت ٹکا کر شیشے کے کیبن کے پار منتظر نظروں سے دیکھنے لگا۔

اکرام کے آتے ہی احسانی بناء توقف بولا۔ "ابھی بیگم منیبہ شوکت کا فون آیا تھا۔ وہ ساڑھے بارہ بجے تک ڈائمنڈ رِنگز دیکھنے آرہی ہے۔ کل سوئیزرلینڈ سے جو نئی کھیپ آئی ہے، اُس میں سے کوئی دس ایک کے قریب بہت ہی خُوبصورت اور قیمتی انگوٹھیاں چمکوا کر کسی اچھے سے ڈسپلے میں سجا کر تیار کرلو"۔

اکرام کی آنکھوں میں بےزاری کے تاثرات نمودار ہوئے۔ چہرے پر چھائی ہچکچاہٹ سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ اپنی بات کہنے کے لئے مناسب الفاظ کا متلاشی ہے۔اِس سے قبل وہ کچھ کہتا احسانی بول پڑا۔ "کیا بات ہے کچھ کہنا چاہتے ہو؟"۔

۔"جی۔۔۔۔وہ۔۔۔۔بس۔۔۔۔احسانی صاحب کیا عرض کروں۔۔۔۔۔۔۔!" اکرام قدرے جھجھکتا ہوا بولا۔ "آپ تو جانتے ہی ہیں بیگم منیبہ شوکت کتنی

بد تمیز اور منہ پھٹ ہے۔ جب بھی آتی ہے سارے اسٹاف کے سامنے کھڑے بے عزتی کر دیتی ہے۔ اِتنی بد تمیزی سے بات کرتی ہے جیسے میں کوئی اُس کا زر خرید غلام ہوں"۔

احسانی کے چہرے پر ایک گہری مسکراہٹ آئی۔ "ہاں مجھے پتہ ہے۔ لیکن منہ مانگے دام بھی تو دے جاتی ہے۔ یاد نہیں ہے پچھلی بار ڈائمنڈ نیکلیس کے بھاؤ تاؤ کیئے بغیر ہی دس لاکھ دے گئی جو اُسے ہم سات آٹھ لاکھ میں بھی دے دیتے"۔

اکرام کے چہرے پر ایک اداس سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "جی احسانی صاحب، درست کہہ رہے ہیں آپ۔ گلے میں نیکلیس پہن کر شیشے میں دیکھ کر اتراتے ہوئے مسلسل کہے جا رہی تھی کہ جب میں اِسے اپنے ڈیزائینر ڈریس کے ساتھ پہنوں گی تو کتنی خوبصورت لگوں گی"۔ اکرام کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ اب قدرے طنزیہ سی ہو چلی تھی۔

۔"ہاں دیکھو بھلا، اُسے بناء حدود و قیود کے پھیلا اپنا جسم نظر نہیں آتا کیا۔۔۔۔

۔؟"۔ احسانی کا لہجہ طنز سے بھرا تھا۔

۔"وہی تو۔۔۔۔!، جب وہ یہ بات کہہ رہی تھی میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا

کہ بھلا اِس نیکلیس میں ایسا کونسا سُرخاب کا پر جڑا ہے جو اُسے حسین و جمیل بنا دے گا۔ اِس سے بہتر تو یہ ہے کہ وہ کوئی اچھا سا فٹنیس سینٹر جوائن کر لے۔ دو تین سو پاونڈ کم ہو جائیں تو شاید کچھ بہتر بھی لگنے لگے"۔

احسانی کے حلق سے بے اختیار قہقہہ اُبل پڑا مگر اُس نے فوراً اُس کا گلا گھونٹتے ہوئے کہا۔ دیکھو یہ تمھارا مسئلہ نہیں کہ وہ حسین لگتی ہے یا نہیں۔ تم تو بس اُس کی ایسی ایسی" تعریفیں کرنا کہ اب کی بار وہ پہلے سے بھی مہنگی انگوٹھی خرید کر لے جائے"۔

۔" میری تو سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ وہ اپنی دن بدن پھیلتی صحت کی طرف کیوں توجہ نہیں دیتی۔ اُسے کس بات کی کمی ہے۔ شاید اُسے خود بھی معلوم نہ ہو کہ اُس کے پاس کتنی دولت ہے۔ اگر کوئی اچھا سلمنگ سنیٹر جوائن کر لے تو چند ماہ میں کچھ کی کچھ نظر آنے لگے"۔ اکرام احسانی کی بات سُنی ان سُنی کرتے ہوئے بولا۔

۔" میرے سامنے تو تم نے یہ بات کر دی ہے۔۔۔۔۔۔ خبردار! اُس کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات نہ کر بیٹھنا۔ اگر جو ناراض ہو گئی تو خوامخواہ ہم سونے کا انڈہ دینے والی مرغی سے محروم ہو جائیں گے"۔ احسانی کا لہجہ قدرے تلخ

تھا۔ "چلو بس اب جاؤ۔ مجھے کسی قسم کی کوئی شکایت نہ ملے۔۔۔۔۔!، سمجھے۔۔۔۔

۔!!!"۔

اکرام کیبن کا دروازہ کھول ہی رہا تھا کہ پیچھے سے احسانی کی قدرے بلند آواز سنائی دی۔

اور ہاں۔۔۔۔۔۔، تمھارا لنچ بریک ایک بجے ہوتا ہے نا۔ اگر وہ کچھ لیٹ شیٹ" ہو تو لنچ پر نہ نکل جانا۔ میں چاہتا ہوں کہ جب وہ آئے تو تم وہاں موجود رہو۔ یہ دوسرے سیلز پرسن اُسے ہینڈل نہ کر سکیں گے"۔اکرام نے دروازے کھول کر باہر نکلتے ہوئے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

احسانی کی ہدایات کے عین موجب سیف سے سوئیزرلینڈ سے آئی ہوئیں ہیرے کی انگوٹھیوں کا ڈبہ نکالا۔ ایک ایک انگوٹھی کو اپنے گریبان میں لٹکتے ہیرا جانچنے کے مخصوص چھوٹے محدب عدسے کو آنکھ پر لگا کر بغور دیکھنے کے بعد کوئی دس بارہ انگوٹھیاں علیحیدہ کرلیں۔ ایک سیلز پرسن کو ہدایت کی وہ یہ سب انگھوٹھیاں احتیاط کے ساتھ ورکشاپ میں کاریگر سے پالش کروالے اور کسی بہت ہی اچھے ڈسپلے باکس پر لگا کر شوکیس میں سجا دے۔

ابھی ساڑھے بارہ بجنے میں کوئی گھنٹہ بھر تھا۔ وہ کاموں میں ایسا الجھا کہ

وقت کا احساس اُس وقت ہوا جب اُس کے زیرِ نگرانی کام کرنے والے سیلز پرسنز نے لنچ بریک پر جانے کی اجازت طلب کی۔ اُس نے شو روم کی دیوار پر لگے کلاک پر نظر ڈالی تو ایک بج رہا تھا۔ بیگم منیبہ کا دور دور تک کوئی پتہ نا تھا۔ خُود اکرام کی آنتیں بھی مارے بُھوک کے قُل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔

دوپہر کے دو بج گئے۔ پہلے دو سیلز پرسنز کے بعد دوسری دو خواتین سیلز پرسنز بھی اپنا اپنا لنچ بریک کر کے واپس آچکی تھیں۔ اکرام دل ہی دل میں بیگم منیبہ کو سلواتیں سُنا رہا تھا۔ جی تو چاہ رہا تھا کہ اگر سامنے آجائے تو وہ کھری کھری سنائے کہ اُس کے ہوش ٹھکانے آجائیں۔ مگر وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ محض اُس کی سوچ کا زرا سا بھی اندازہ ہو جائے تو وہ احسانی سے کہہ کر اُسے کھڑے کھڑے نوکری سے نکلوا دے۔۔۔۔۔۔ ۔اور وہ احسانی۔۔۔۔۔!، بیگم منیبہ کو دیکھتے ہی خوشامدی ٹٹو بن کر بیگم صاحبہ بیگم صاحبہ کہتا ہوا اِدھر اُدھر اپنی دم ہلاتا پھرتا ہے۔ اپنی وقعت.بڑھانے کے چکر میں اُسے نوکری سے فارغ کرنے میں لمحہ بھر کا بھی تامل نہ کرے۔

اچانک شو روم کے صدر دروازے سے بیگم مبینہ شوکت بھاری بھرکم وجود سنبھالے دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اندر داخل ہوتی دکھائی دی۔ اُس پر نظر پڑتے ہی اکرام اپنی بھوک اور انتظار کی کوفت بھول گیا اور اُس کی جگہ ایک عجب سی بے

چھینی نے لے لی۔

اِس سے پہلے کہ اکرام اپنے سیکشن سے باہر آ کر شور روم کے دروازے پر بیگم منیبہ کو خوش آمدید کہتا، احسانی اپنے شیشے کے کیبن سے تیزی سے دوڑتا ہوا آیا اور پوری بتیسی نکال کر بولا۔ "زہِ نصیب۔۔۔۔۔۔!، بیگم صاحبہ، آپ کی آمد ہمارے شو روم کے لئے کسی اعزاز سے ہرگز کم نہیں، خوش آمدید، خوش آمدید"۔

بیگم منیبہ نے محض اپنے ہونٹوں کو بھینچ کر اُس کی ایک کان سے دوسرے کان تک پھیلی ہوئی مسکراہٹ کا مختصراً جواب دیا اور کم و بیش اُسے نظرانداز کرنے والے رویہ کے ساتھ شو روم کے اُس گوشے کی جانب دھیرے دھیرے چل دی جہاں شوکیسوں میں سجے ہیرے جواہرت جڑے زیورات کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔

احسانی کی نظر بیگم منیبہ کے عقب سے نمودار ہونے والے ایک مرد پر پڑی۔ ایک بار پھر اپنے چہرے پر ایک کان سے دوسرے کان کو چھُوتی ہوئی مسکراہٹ سجا کر پُرجوش لہجہ میں بولا۔ اخاہ۔۔۔۔۔۔!، تو آج شوکت زمان صاحب بھی بنفسِ نفیس تشریف لائے ہیں۔ ارے صاحب آپ کے دیکھنے کو تو ہماری آنکھیں ہی ترس

گئیں"۔

احسانی کی بات سُن کر اکرام چونکا۔ "شوکت زمان۔۔۔۔۔!، اوہ تو یہ صاحب ہیں بیگم منیبہ کے شوہرِ نامدار"۔ منیبہ بیگم کو اپنی جانب آتے دیکھ کر آگے بڑھا اور اپنے چہرے پر خیر مقدمی مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ "مزاج بخیر، بیگم صاحبہ۔ میں تو کب سے آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا"۔

اکرام کی بات شاید اُسے ناگوار گزری۔ چہرے کا بدلتا رنگ دیکھ کر احسانی تیزی سے آگے بڑھا اور چہرے پر خوشامدی مسکراہٹ ثبت کرتے ہوئے بولا۔ "جی جی ہم سب ہی آپ کا بے تابی کے ساتھ انتظار کر رہے تھے بیگم صاحبہ۔ آپ کی شخصیت ہی کچھ ایسی باغ و بہار ہے، ماشاء اللہ۔ آپ کی آمد سے ہمارے شوروم میں رونق آ گئی ہے"۔

احسانی نے بات کچھ ایسے لچھے دار انداز میں کی کہ بیگم منیبہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دی۔ احسانی نے فوراً اکرام کی طرف دیکھتے ہوئے اُسے اپنی آنکھ کا گوشہ بھینچ کر متنبہ کیا کہ وہ کوئی ایسی ویسی بات نہ کرے جس سے بیگم صاحبہ کا موڈ آف ہو جائے۔ فوراً ہی اُس نے ہیرے کی انگوٹھیوں والے ایک بڑے شوکیس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا:۔ ارے بھئی، اکرام۔۔۔۔۔!، بیگم صاحبہ کو

وہ ڈائمنڈ رِنگز دکھاؤ جو ہم نے بطورِ خاص اُن کے لئے چند روز قبل ہی سوئیزرلینڈ سے منگوائی ہیں"۔

احسانی مڑا اور شوکت زمان کی جانب متوجہ ہوا جو ہال میں لگے ایک انتہائی نفیس اور آرام دہ مخملی صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔ "ارے صاحب، آپ یہاں کہاں آن بیٹھے؟ کیا رِنگ پسند کرنے میں بیگم صاحبہ کی کوئی مدد نہ کیجئے گا؟"۔

شوکت زمان میز پر سے کوئی رسالہ اٹھا کر اُسے پڑھنے کا آغاز کرنے ہی والا تھا یکدم چونکا۔ پھر انتہائی نفیس انداز میں مسکراتے ہوئے قدرے دھیرے سے بولا۔ "احسانی صاحب، آپ تو جانتے ہی ہیں۔۔۔۔۔۔، مجھے نا تو ہیرے جواہرات سے کوئی دلچسپی ہے، نا ہی اِس بارے میں کسی قسم کی کوئی معلومات۔۔۔۔۔۔۔ اب بھلا میں اُس کی مدد کرتا کیا اچھا لگوں گا جو دن رات ہیرے جواہرات سے ہی کھیلتے ہوئے بڑی ہوئی ہو"۔ اتنا کہہ کر وہ پھر اپنا سر جھکا کر رسالہ میں گم ہو گیا۔

۔" چلیں تو پھر میں آپ اور بیگم صاحبہ کے لئے کولڈ ڈرنکس بھجواتا ہوں"۔ اتنا کہہ کر احسانی تیز تیز چلتا ہوا اپنے کیبن میں داخل ہوا اور انٹر کام اٹھا کر ہدایات جاری کرنے لگا۔

اکرام بیگم منیبہ کو ہیرے کی انگوٹھیاں دکھا رہا تھا۔ وہ مسلسل اپنی ناک بُھوں یوں اتار چڑھا رہی تھی کہ جیسے اُسے کچھ پسند ہی نا آ رہا ہو۔ اکرام کن انکھیوں سے صوفے پر بیٹھے شوکت زمان کو دیکھے جا رہا تھا۔ اُسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اِس بدمزاج، اکھڑ اور پہاڑ سی عورت کا شوہر اِس قدر نفیس، میتن اور سلجھا ہوا بھی ہو سکتا ہے۔
شوکت زمان بظاہر دیکھنے میں کوئی چالیس پینتالیس کا نظر آتا تھا۔ قدرے لمبا قد، ستواں جسم، نفاست سے سنوارے گئے گھنے چمکدار سیاہ بال جن میں کن پٹیوں اور قلموں میں کہیں کہیں سفید بال اپنی جھلک دکھا رہے تھے۔ انتہائی صاف رنگت، چوڑی پیشانی پر گہری سیاہ بھوئیں، سوچ میں ڈوبی روشن سیاہ بڑی بڑی آنکھیں، ستواں ناک اور پتلے پتلے سرُخ ہونٹوں کے درمیان گھنی پُر وقار مونچھیں جن میں کہیں کہیں سے جھلکتے سفید بال اُس کی شخصیت کے وقار میں مذید اضافے کا باعث بن رہے تھے۔ گالوں پر شیو کی تازگی اور صاف رنگت کے سبب جھلکتی ہلکی سی سبزی شخصیت کو مذید نکھار رہی تھی۔ قدرے گول اور آگے سے خم کھاتی ٹھوڑی کو اُس نے اپنے بائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے تھام کر دوسرے ہاتھ سے رسالہ پکڑے ایسا پوز بنا رکھا تھا کہ دیکھنے والا اُسے کوئی انٹلیکچول سمجھ بیٹھے۔ وہ اعلیٰ تراش خراش کے ایک انتہائی

نفیس سے بے داغ سفید شلوار قمیض میں ملبوس تھا۔ پاؤں میں سیاہ چمکدار چرمی پیشاوری چپل۔ یہ پیراہن نہ صرف اُس کی دلکش شخصیت سے میل کھاتا ہوا تھا بلکہ بحیثیتِ مجموعی اُس کی شخصیت کے وقار میں کماحقہ اضافے کا موجب بھی بن رہا تھا۔

۔"ارے یہ سب کیا گھٹیا چیزیں دکھا رہے ہو"۔ بیگم منیبہ کی اکھڑی ہوئی آواز نے اکرام کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔

۔"جی بیگم صاحبہ۔۔۔۔۔۔، ارے۔۔۔۔، حیرت ہے۔۔۔۔۔۔، آپ کو یہ انگوٹھیاں پسند نہ آئیں۔ یہ سوئیزرلینڈ کی سب سے بڑی ڈائمنڈ جیولری بنانے والی کمپنی سے منگوائی گئی ہیں۔ اِن کی کوالٹی، ڈیزائن اور مہارت کی تو دنیا بھر میں مثالیں دی جاتی ہیں" اکرام نے اُسے قائل کرنے کی خاطر پیشہ ورانہ انداز میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔

۔"تو تمھارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مجھے۔۔۔۔۔۔۔ یعنی بیگم مبینہ شوکت کو اچھی اور بری ڈائمنڈ جیولری کا فرق ہی نہیں پتہ۔۔۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔۔، ایک معمولی سیلز پرسن۔۔۔۔۔ تم ہو کن ہواؤں میں۔۔۔۔۔۔۔۔، میں ساری زندگی ہیروں سے ایسے کی کھیلتی رہی ہوں ویسے تو شاید تم نے

کبھی کنچے بھی نہ کھیلے ہوں"۔ بیگم منیبہ غصے سے لال پیلی ہوتے ہوئے گرج کر بولی۔
۔"ارے بیگم صاحبہ، آپ تو خوامخواہ ناراض ہو رہی ہیں۔ میں نے محض ایک بات ہی تو کہی تھی"۔ اکرام اُسے اِس قدر غصہ ہوتے دیکھ گھگیاتے ہوئے بولا۔
۔"تو اب تم مجھ پر الزام بھی لگاؤگے کہ میں خوامخواہ تم پر ناراض ہو رہی ہوں۔ اُس نے خوامخواہ پر خاص زور دیتے ہوئے کہا۔
اکرام اُس کے بگڑے تیور دیکھ کر گھبرا گیا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اِس بدمست عورت کو قابو کرے۔"بیگم۔۔۔۔۔۔ صاحبہ۔۔۔۔۔۔۔۔جی وہ۔۔۔۔۔ میرے کہنے کا ہرگز وہ مقصد نہیں تھا جو آپ سمجھ رہی ہیں"۔
مجھے اِس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ تمھارے کہنے کا مقصد کیا تھا اور کیا نہیں۔ میں تو تمھاری بدتمیزی پر اپ سیٹ ہو رہی ہوں کہ تم نے پہلے مجھے نا سمجھ کہا۔۔۔۔۔ پھر دھڑلے سے خوامخواہ غصہ دکھانے کا الزام بھی عائد کر دیا۔۔۔۔۔۔۔اور اب تو تم نے حد ہی کر دی۔ میں اتنی نا سمجھ ہوں کہ تمھاری بکواس کو سمجھ ہی نہیں سکتی۔ میں پوچھتی ہو تمھاری جرأت کیسے ہوئی

کہ تم بیگم منیبہ شوکت کے سامنے یوں بڑھ چڑھ کر باتیں بگھارو"۔ اب کی بار اُس کا غصہ اپنے عروج پر تھا اور گول پھُولا ہوا بھاری بھر کم چہرہ غصے کی شدت سے سُرخ ہو رہا تھا۔

شوکت زمان صوفے سے اٹھ کر دھیرے دھیرے چلتا ہوا اُس کی طرف آیا اور ہلکی آواز میں اُس سے مخاطب ہوا۔ "کیا بات ہے بیگم، اِس بے چارے سے ایسی کیا خطا ہو گئی جو تم اتنا بگڑ رہی ہو؟"۔

۔"دیکھو شوکت۔۔۔۔۔۔۔۔!" اُس کی آواز میں غُراہٹ تھی۔ "تم میرے معاملے میں ٹانگ نہ اڑاو۔ یہ دو ٹکے کا سیلزمین خود کو سمجھتا کیا ہے۔ مجھے سمجھانے چلا ہے۔ اگر آج میں نے اِس کے ہوش ٹھکانے نہ لگا دیئے تو میرا نام بھی منیبہ بیگم نہیں"۔ وہ تو جیسے کسی کو خاطر میں لانے ہی کو تیار نہ ہو۔ شوکت زمان مذید کچھ کہے بغیر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا دوبارہ صوفے پر جا بیٹھا اور اِس سارے معاملے سے لا تعلق سا ہو کر رسالے میں گم ہو گیا۔

اکرام کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اپنے زیرِ نگرانی سیلز پرسن لڑکے لڑکیوں کے چہروں کی دبی دبی مسکراہٹیں دیکھ کر بے عزتی کا احساس مذید دو چند ہو رہا تھا۔

شور سُن کر احسانی اپنے کمرے سے نکلا۔ اکرام کے چہرے پر اُڑتی ہوائیوں اور بیگم منیبہ کا لال سُرخ چہرہ دیکھ کر معاملے کی نوعیت کا کچھ کچھ اندازہ تو ہو ہی گیا۔ موقعہ کی نزاکت بھانپتے ہوئے تحکمانہ لہجہ میں اکرام سے مخاطب ہوا۔ اکرام۔۔۔۔۔۔!، کیا معاملہ ہے؟ یہ بیگم صاحبہ اِس قدر ناراض کیوں ہو رہی ہیں؟"۔

۔"ارے یہ کیا بتائے گا۔ میں بتاتی ہوں احسانی تم کو۔ یہ تم نے کیسا گھٹیا سیلزمین رکھ لیا ہے؟ جسے ہائی سوسائٹی سے تعلق رکھنے والے ہم جیسے معزز کسٹمرز سے بات کرنے تک کی تمیز نہیں۔ پچھلی بار بھی اِس نے مجھ سے بد تمیزی کی تھی۔ وہ تو اُس روز میں زرا جلدی میں تھی، اِس کی ٹھیک سے خبر نہ لے سکی۔ آج پہلے مجھے اچھی اور بری ڈائمنڈ جیولری پر لیکچر پلا رہا تھا۔ میں نے کچھ کہا تو لگا الٹا مجھ ہی پہ الزام لگانے کہ میں لاٹ صاحب پر خوامخواہ الزام لگا رہی ہوں اور مجھے اتنی بھی عقل نہیں کہ میں اُس گھامڑ کی بکواس سمجھ سکوں"۔

اِس سے پہلے کہ اکرام اپنی صفائی میں کچھ بولتا، احسانی لجاجت بھرے لہجہ میں بولا۔

ارے بیگم صاحبہ، لعنت بھیجیں اِس پر۔ آپ میرے کمرے میں تشریف"

لے چلیں۔ میں آپ کے شایانِ شان اعلیٰ ترین ڈائمنڈ رِنگز خود ذاتی طور پر دکھاؤں گا۔ اِس کم ظرف کی طرف سے میں آپ سے معذرت خواہ ہوں"۔

پھر مڑ کر شعلہ بار نگاہوں اور کڑکتے لہجے میں اکرام سے مخاطب ہوا۔ "جانتے بھی ہو تم کس سے بات کر رہے ہو۔ تمھیں زرا تمیز نہیں کہ بیگم صاحبہ جیسی معزز ہستی سے کیسے بات کی جاتی ہے۔ فوراً معافی مانگو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے تمھیں ابھی کھڑے کھڑے نوکری سے ہی نکال دینا پڑے"۔

ایک لحظہ تو اکرام کا جی چاہا کہ وہ اِسی وقت نوکری احسانی کے منہ پر دے مارے اور اُن دونوں پر لعنت بھیج کر وہاں سے روانہ ہو جائے۔ لیکن فوراً ہی اُسے اپنے بیوی بچوں کا خیال آیا۔ اُسے یاد آیا کہ کتنی مشکلوں کے بعد تو اُسے یہ نوکری ملی تھی۔ اُسے اپنی پُرکشش تنخواہ اور کمیشن یاد آیا۔ ناچار آگے بڑھا تو اُس کا سامنا بیگم منیبہ کی حقارت بھری نظروں سے ہوا۔ "میں معذرت چاہتا ہوں بیگم صاحبہ اگر میری کوئی بات آپ کو ناگوار گزری ہو"۔

بیگم منیبہ نے اپنا سر جھٹک کر اُس پر ایک آخری اُچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ ہونٹوں پر قہر آلود مسکراہٹ کے ساتھ ایک ہلکی سی ہونہہ کی آواز برآمد ہوئی اور احسانی کے ہمراہ دھیرے دھیرے اُس کے کمرے کی جانب چل دی۔

ایک خاتون سیلز پرسن کی مدد سے اکرام ٹرالی میں انگوٹھیوں کے ڈبے باکس سجا کراُسے دھکیلتا احسانی کے کمرے تک لے گیا۔ دونوں نے ٹرالی سے سارے ڈبے ایک ایک کر کے احسانی کی بڑی سی میز پر سجا دیئے۔

۔"اکرام تم یہاں میرے پاس ٹھہرو۔۔۔۔۔۔ سجیلا تم جا کر بیگم صاحبہ کے لئے اُن کی پسند کے دو لارج تندوری پیزا فوراً پیزا ہٹ سے منگوا لو اور ہاں جاتے جاتے شوکت زمان صاحب سے بھی کہہ دو کہ وہ بھی اندر ہی آ جائیں"۔ احسانی حسبِ عادت اپنی پوری بتیسی کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔

۔"رہنے دو احسانی۔ بھلا وہ یہاں آ کر کیا کرے گا۔ اُسے نہ تو اِن چیزوں کی کوئی سمجھ ہے اور نہ ہی کوئی ذوق۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اُسے وہیں بیٹھے رہنے دو۔ وہ وہیں ٹھیک ہے۔۔۔ ۔۔۔۔!" بیگم مبینہ نے لاپروائی کے ساتھ کہا اور پھر سامنے رکھے ڈبے سے ایک انگوٹھی نکال کر انگلی میں پہن کر دیکھنے لگی۔

اکرام نے سوچا کہ شاید شوکت زمان کی حیثیت اپنی مال دار بیوی کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اُس نے دولت کی لالچ میں اِسے ایک موٹی آسامی

جانتے ہوئے شادی کی ہو۔ ورنہ اُسے کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ اتنی پُر کشش شخصیت اور مردانہ وجاہت کا مالک ہوتے ہوئے اِس دس من کی دھوبن سے بیاہ رچاتا۔

اکرام کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب احسانی نے ڈھیر سارے چھوٹے.بڑے ہیرے جڑی ایک بھدی اور موٹی انگوٹھی بیگم منیبہ کو پکڑائی اور بولا۔ "یہ انگوٹھی دیکھیں۔۔۔۔۔۔ جیسے صرف اور صرف آپ کی پُروقار شخصیت ہی کو تو مدِ نظر رکھتے ہوئے بنائی گئی ہو۔ بخدا آپ پر بہت جچے گی"۔

بیگم منیبہ نے جیسے ہی انگوٹھی اپنی انگلی میں ڈالی، احسانی نے اُس کی شان میں وہ وہ قصیدے پڑھنا شروع کیئے کہ اکرام تو بس دم بخود کھڑا سُنتا ہی رہ گیا۔ "میں نا کہتا تھا کہ یہ انگوٹھی تو جیسے محض آپ کی دلکش شخصیت ہی کو دیکھ کر بنائی گئی ہو۔ زرا دیکھیں تو سہی ماشاء اللہ آپ کی پہلے سے ہی پُررونق شخصیت پر اِس انگوٹھی سے کیا بھرپور نکھار آ گیا ہے۔ واللہ آپ کی حسین انگلیوں میں کیسی سج رہی ہے۔ سبحان اللہ ! سارے شہر میں اگر اچھی جیولری کو کوئی پرکھ سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف بیگم منیبہ ہی ہیں"۔

کچھ ہی دیر بعد بیگم منیبہ اپنے بھاری بھر کم قیمتی ڈیزائنر ہینڈ بیگ سے چیک

بک نکال کر احسانی کی بتائی ہوئی رقم کا اندراج کر رہی تھی جو کہ حسبِ معمول کئی گنا زائد تھی۔ چیک کاٹ کر احسانی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "خیر میرا ارادہ تو کوئی بہت ہی مہنگی انگوٹھی خریدنے کا تھا لیکن کہتے تم سچ ہی ہو۔ یہ انگوٹھی میری شاندار پرسنیلیٹی سے بہت میچ کر رہی ہے اور تم نے قیمت بھی اتنی کم بتائی کہ مجھ سے نا نہیں کہا گیا"۔

احسانی نے چیک پکڑتے ہوئے ایک بار اُسے غور سے دیکھا اور پھر ایک گہری کاروباری مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے بولا۔ "جی بس ہماری تو یہی کوشش ہوتی ہے کہ ہم آپ جیسے معزز کسٹمرز کو اُن کے ذوق، معیار اور پسند کی جیولری مناسب داموں پر فراہم کریں"۔

احسانی ابھی اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور چپراسی ٹرالی دھکیلتا اندر داخل ہوا۔ ٹرالی میں رکھا بھاپ اڑاتا پیزا اور دیگر لوازمات دیکھ کر احسانی نے فوراً اکرام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بھئی یہ سب ڈبلے پلے یہاں سے اٹھاؤ اور میز خالی کرو"۔

اکرام نے چپراسی کی مدد سے سارے ڈبے ٹرالی میں بھرنا شروع کر دیے۔ کمرہ گرما گرم پیزا کی اشتہا انگیز خوشبو سے مہک اٹھا تھا۔ اکرام کو یاد آیا

کہ اُس نے تو ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا۔ بے اختیار اُس کی نظر گھڑی کی طرف اٹھ گئی۔ وال کلاک پر ساڑھے چار بجے کا وقت بتاتی سوئیاں اُس کا منہ چڑا رہی تھیں۔ گو کہ اِس سارے تماشے میں اُس کی بھوک تو نہ جانے کب کی مر چکی تھی البتہ پیزا کی مہک نے ناک کے رستے پیٹ میں ایک غبار سا بھر دیا۔ وہ انگوٹھیوں والی ٹرالی دھکیل کر تیز تیز چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ ہال سے گزرتے ہوئے اُس کی نظر شوکت زمان پر پڑی۔ وہ ابھی تک اپنے رسالے میں ہی گم تھا۔ اکرام اُس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "ارے شوکت صاحب آپ یہیں تشریف فرما ہیں۔ وہاں احسانی صاحب نے بیگم صاحبہ اور آپ کے لئے بطورِ خاص تندوری چکن پیزا منگوایا ہوا ہے"۔

اکرام کی بات کے جواب میں شوکت زمان کچھ بولا تو نہیں البتہ اُس کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ جھلملائی اور اُس نے بناء کچھ کہے اپنا سر نفی میں ہلا دیا اور پھر اپنے رسالے میں گم ہو گیا۔ اکرام کو وہ مسکراہٹ کچھ ایسی ہی محسوس ہوئی جیسے کوئی دیرینہ دوست اپنے سنگی ساتھی کی تکلیف اور دکھ کو محسوس کرتے ہوئے ازراہِ ہمدردی مسکرا دے۔

کچھ دیر بعد بیگم منیبہ کمرے سے اپنا منہ ٹشو پیپر سے پونچھتی ہوئی احسانی کے ساتھ برآمد ہوئی اور شوکت زمان کی طرف دیکھے بناء ہی خارجی دروازے کی طرف

دھیرے دھیرے بڑھنے لگی۔ احسانی نے اپنے مخصوص لچھے دار انداز میں اُسے الوداع کہا۔ شوکت زمان بھی اُس کے پیچھے دروازے سے باہر نکل گیا۔

اکرام کا جی اب کچھ کھانے کو بالکل بھی نا چاہ رہا تھا۔ اُس نے اپنے لئے ایک کپ چائے منگوائی اور بادل نخواستہ آنے والے گاہکوں کو ماتحت سیلز پرسنز کی مدد سے نبٹاتا رہا۔

ساڑھے سات بجے شو روم بند ہونے کا وقت ہوتے ہی سارا سامان سیف میں بند کروانے کے بعد تیر کی طرح وہاں سے باہر نکلا۔

شوم روم کی حبس ذدہ فضاء سے باہر آتے ہی اُس نے اپنی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی اور کالر کا بٹن کھول کر چند گہرے گہرے سانس لیئے۔ ابھی چند قدم ہی چل پایا ہوگا کہ سامنے والی فٹ پاتھ سے لگی ایک نئے ماڈل کی سیاہ لمبی سی گاڑی جس کے شیشے بھی سیاہ ہو رہے تھے کی ھیڈ لائٹس ہائی بیم پر دو تین بار جلی اور بجھیں۔ اکرام نے سوچا کہ کہیں یہ اشارے اُس کے لئے تو نہیں۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا سڑک پار کر کے گاڑی تک پہنچا تو ڈرائیور کی جانب والی کھڑکی کا خودکار شیشہ نیچے اترنے لگا۔ اکرام یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شخص کوئی اور نہیں شوکت زمان تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!!

۔

۔"اندر آ جاؤ"۔ شوکت زمان نے محض اتنا کہہ کر بٹن دبا دیا۔ اِس سے پہلے کے

اکرام کچھ کہہ پاتا شیشہ مکمل طور پر بند ہو چکا تھا۔ وہ گھوم کر آیا، دھیرے سے دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا اور گاڑی چل پڑی۔

۔"پہلے تم مجھے اپنے گھر کا پتہ بتاؤ تاکہ میں تمھیں گھر ڈراپ کر دوں اور راستے میں باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔ سر دست میں تم سے اپنی بیوی کی جانب سے کی گئی تمام تر بدتمیزیوں کی معذرت چاہتا ہوں"۔ شوکت زمان گاڑی کے ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتا ہوا قدرے نیچی مگر واضع آواز میں بولا۔ "مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میری یہ معافی تلافی تمھارے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا مداوا نہیں ہو سکتی۔ ہاں البتہ اتنا ضرور ہے کہ شاید اِس سے ہم دونوں کے دل کا کچھ بوجھ ہی ہلکا ہو جائے"۔

اکرام نے اپنے گھر کا راستہ سمجھایا اور بولا۔ "ارے شوکت صاحب، بھلا اِس کی کیا ضرورت تھی"۔

۔"ضرورت!۔۔۔۔۔۔۔ ہوں ںہ۔۔۔۔!!!"۔ شوکت زمان نے پہلے ضرورت پر زور دیا اور پھر ایک زہر خند مسکراہٹ کے ساتھ اُس کے ہونٹوں سے ایک ہلکی سی طنزیہ آواز برآمد ہوئی۔ "یہ سب ضرورتوں ہی کا تو کیا دھرا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔! چلو تم ہی بتاؤ بھلا تمھیں کیا ضرورت پڑی تھی جو تم منیبہ اور

احسانی کی وہ بیہودہ گفتگو یوں سر جھکائے خاموشی سے برداشت کرتے رہے۔۔۔۔۔۔۔ میرے دوست۔۔۔۔۔۔۔، یہ سب ضرورتوں کا رچایا ہوا کھیل ہی تو ہے۔۔۔۔۔۔!" وہ ایک لمحہ کو رُکا اور ایک گہری سانس لینے کے بعد اُسے دھیرے دھیرے اپنی ناک سے خارج کرتے ہوئے بولا۔ "پہلے ضرورتوں سے ہماری شخصیت میں خلا جنم لیتا ہے۔ اُس خلا کو ہم ضرورتوں سے پُر کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جوں جوں ہم اُس خلا کو پُر کرتے جاتے ہیں وہ اور مذید وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے!۔ تمھیں ایک بہت مزے کی بات بتاؤ۔ جن چیزوں سے ہم اُس خلا کو پر کرنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں، کون جانے وہ ضرورتیں ہوتی بھی ہیں یا محض دل کا بہلاوا۔۔۔۔!!!"۔ اکرام ہونقوں کی طرح سے شوکت زمان کو بس دیکھے چلا جارہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا۔ بے ارادہ اُس کے ہونٹوں سے نکلا۔ "شوکت صاحب بخدا آپ کیا کہہ رہے ہیں، میری تو کچھ بھی سمجھ نہیں آرہا"۔

۔"چلو میں تمھیں بہت آسان انداز میں سمجھائے دیتا ہوں"۔ شوکت زمان نے ایک ہلکے سے تبسم کے ساتھ لمحہ بھر اکرام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم اور احسانی کیا سمجھتے ہو!، منیبہ جانتی نہیں کہ تم لوگ جیولری کی دوگنی تگنی قیمت وصول کرتے ہو؟"۔

۔"اوہ۔۔۔۔!"۔ اکرام ایک زہنی دھچکے سے دوچار ہوا۔ کچھ دیر توقف کے بعد بولا:
لیکن وہ تو کبھی اِس بات کی شکایت نہیں کرتیں اور پھر دوبارہ واپس آ کر پہلے سے بھی" مہنگی جیولری کیوں خریدتی ہیں؟"۔

۔"اپنے اُسی خلا کو پُر کرنے کے لیئے"۔ شوکت زمان کے چہرے پر ایک پُراسرایت سی تھی۔۔"یہ آپ بار بار کس خلا کا زکر کر رہے ہیں۔۔۔۔؟"۔ اکرام کے لہجے اور چہرے پر حیرت تھی۔

۔"دیکھو اکرام، یہ منیبہ جیسے لوگ اپنی شخصیت کا کھوکھلا پن، اُس کا خلا، قیمتی اشیاء مہنگے داموں خرید اپنی امارت کا ڈھنڈورا پیٹ کر، تو کبھی اپنے مرتبے، عہدے، علم، فن اور ہنر سے دوسروں کو بے عزت کرکے، اُن کو کمتر ظاہر کرکے، اُنھیں نیچا دکھا کر اور اُن کے منہ سے اپنے لیئے تعریفی کلمات سُن کر پُر کرنے کو کوشش کرتے ہیں۔ مہنگی چیزیں، احسانی کا خوشامدی لہجہ، شوگر کوٹڈ باتیں، اپنی تعریفیں اور تمھاری بے عزتی کرکے اُسے زہنی آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ اور ایسی فضول شاپینگز تو وہ روز کیا کرتی ہے۔ اُس کی سنگھار میز کی درازوں میں رکھے جیولری باکسوں میں انگنت قیمتی زیوارت اور وسیع وارڈراب میں بیش قمیت ڈائیزائینر ملبوسات، میچنگ پرس اور جوتوں کا ایک انبار لگا ہے

کہ جنھیں شاید ایک بار بھی استعمال نا کیا گیا ہو"۔

۔"کیا واقعی۔۔۔۔۔۔ ؟"۔ شوکت زمان جیسا ہی وقفہ لینے کے لئے رکا اکرام بولا پڑا۔

۔"ہاں۔۔۔۔۔۔۔ ! جنھیں بغیر ہاتھ پیر ہلائے، بناء کچھ کیئے، بناء کسی قابلیت و اہلیت کے باپ کا اربوں کا کاروبار، روپیہ پیسہ، بنک بیلنس اور جائیداد حاصل ہو جائے۔ جن کے پاس کرنے کو کوئی مثبت و تعمیری سرگرمی نہ ہو۔ جن کی سوچ سطحی سی ہو، تو بھلا وہ یہ نہ کریں تو اور کریں بھی کیا؟"۔

۔"تو پھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آپ نے۔۔۔۔۔۔۔ منیبہ بیگم سے شادی۔۔۔۔۔۔ ؟"۔ اکرام نے جھجھکتے ہوئے سوال ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

۔"اپنی ذات کے ایک بہت بڑے خلا کو پُر کرنے کے لئے کی تھی"۔

۔"کیا مطلب ؟"۔

۔"مطلب۔۔۔۔۔۔ ! "مطلب ہی کے تو سارے رشتے ہیں یہ دوست۔۔۔۔۔

۔!!!۔

میں آج سے کوئی بیس برس پہلے منیبہ کے باپ گردیزی گروپ آف انڈسٹریز کے مالک عشرت گردیزی مرحوم کا پرائیوٹ سکریٹری ہوا کرتا تھا۔ منیبہ عشرت گردیزی کی اکلوتی اولاد تھی۔ اکلوتی ہونے کے سبب وہ گردیزی صاحب کی لاڈلی اور منہ چڑھی بھی تھی۔ اُس کے آگے پیچھے نوکروں کی ایک فوج ظفر موج مستعد رہا کرتی۔ لاڈ پیار نے اُسے اِس قدر بگاڑ دیا تھا کہ وہ اسکول تک جانا گوارا نا کرتی۔ گردیزی صاحب نے شہر کے نامور تعلیمی ماہرین کو بڑے بڑے مشاہروں پر گھر آ کر اُسے پڑھانے پر معمور کر رکھا تھا۔ لیکن منیبہ کو پڑھنے لکھنے سے تو جیسے اللہ واسطے کا ہی بیر تھا۔ سو اُس نے اپنی تعلیم بھی ادھوری ہی چھوڑ دی۔ وہ اگر گھر سے باہر نکلتی بھی تو صرف شاپنگ کرنے "۔۔"تو پھر۔۔۔۔۔۔آپ دونوں کی شادی۔۔۔۔۔؟" اکرام اُس کے سانس لیتے ہی بول پڑا۔

۔" سمجھوتے کی شادی تھی"۔

۔"۔ سمجھوتا، کیسا سمجھوتا۔۔۔۔۔؟"۔

۔"دولت کی تو گردیزی صاحب کے پاس کوئی کمی نا تھی۔ اعلیٰ ترین حکومتی ایوانوں میں اپنے اثر و رسوخ کے سبب اُن کا گروپ ہر بڑا منصوبہ اور ٹینڈر ایک اشارہِ ابرو پر حاصل کرلیا کرتا۔ اُن کا بے جا لاڈ پیار اور نوکروں کی فوج

منیبہ کو ایک تنکا تک اٹھانے نا دیتی۔ اِس چیز نے اِسے حد درجے کاہل اور آرام پسند بنا دیا۔ جس کے نتائج اُس کے جسم پر ظاہر ہونا شروع ہو گئے۔ لیکن اِس بات کی نہ تو کبھی منیبہ اور نہ ہی خود گردیزی صاحب نے کوئی پرواہ کی۔ حال یہ ہو گیا کہ منیبہ گوشت کے ایک پہاڑ کی شکل اختیار کر گئی۔ ایک روز گردیزی صاحب نے مجھے اپنے گھر چھٹی والے دن بلوایا۔ میں حیران تھا کہ چھٹی والے روز انھوں نے مجھے کیوں بلوایا ہے۔ اپنے معمول کے مطابق وہ چھٹی کا دن آرام اور سیر سپاٹے کے علاوہ کوئی دوسرا کام کرنا ہرگز پسند نہیں کرتے تھے۔ بہر حال جب میں وہاں پہنچا تو وہ اپنی اسٹڈی میں میرے منتظر تھے۔ مجھے اپنے سامنے بیٹھا کر مخاطب ہوئے۔ " تمھاری تینوں بہنوں کی شادی کا معاملہ کہاں تک پہنچا؟"۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نا تھا کہ وہ مجھ سے یہ بات کرنے والے ہیں۔ میں نے اُنہیں اپنی معاشی دگرگوں صورتحال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ منہ مانگے جہیز کا بندوبست نہ کر سکنے کے سبب اُن کی شادیاں کرنے سے قاصر ہوں۔ میری بات سُن کر کافی دیر تک وہ خلاؤں میں گھورتے ہوئے کچھ سوچتے رہے پھر بولے۔ دیکھو شوکت میں تمھاری تینوں بہنوں کی شادیاں نہایت ہی شاندار طور پر کروادینے" کا وعدہ کرتا ہوں اگر تم میری بیٹی منیبہ سے شادی کرلو۔۔۔۔۔۔! کچھ دیر تو مجھے سمجھ ہی نا آیا کہ آخر گردیزی صاحب کہہ کیا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد میرے ذہن میں یہ بات واضح ہوئی کہ شاید خدا نے گردیزی صاحب کی شکل میں میری مشکلات کے حل کے لئے ایک فرشتہ بھیج دیا ہے۔ منیبہ کی

جسمانی حالت، اُس کے منہ پھٹ، بد تمیز و بداخلاق رویے اور مجھ سے کوئی پانچ سال عمر میں بڑے ہونے سے واقف ہوتے ہوئے بھی اپنی زندگی کے اُن مسائل جن کے حل کی امید میری تمام عمر کی محنتِ شاقہ کے بعد بھی نہ تھی۔ یوں بیٹھے بٹھائے حل ہوتے دیکھ فوری طور پر ہاں کردی۔ میری منیبہ سے شادی ہوجانے کے فوراً بعد ہی گردیزی صاحب نے اپنے وعدے کے عین مطابق میری تینوں بہنوں کی شادی دھوم دھام کے ساتھ کروائی کہ بس دنیا دیکھتی رہ گئی۔ یوں گردیزی صاحب نے اپنی اور اپنی بیٹی کی ذات کا خلا میری ضرورتوں کو خرید کرپُر کرلیا۔۔۔۔۔۔۔۔!!!"۔

اتنا کہہ کر شوکت زمان نے اپنا ایک ہاتھ اسٹیرنگ ویل سے اٹھا کر انگلیوں کے مدد سے پیشانی کو یوں رگڑنے لگا جیسے سر درد رفع کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

۔"اور آپ لوگوں کے بچے۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟"۔

۔"بچے۔۔۔۔۔۔!، ہاں اگر ہمارے بچے ہوتے تو شاید کسی حد تک مداوا ہی ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔!!!"۔ وہ قدرے دھیمے بڑبڑاتے ہوئے لہجے میں کچھ یوں بولا جیسے اکرام کے سوال کا جواب نہ دے رہا ہوں خود سے ہی ہم کلام ہو۔

۔"اوہ۔۔۔۔۔۔۔ تو آپ دونوں بے اولاد ہیں"۔ اکرام کے لہجے میں تاسف تھا۔

۔"دنیا بھر کے ڈاکٹروں کو دکھایا۔ ہر کسی نے یہی کہا ہے کہ جب تک اُس کا وزن اِس قدر غیر معمولی طور پر بھاری رہے گا وہ ماں نہ بن سکے گی۔ میری ہزار کوششوں اور منتوں کے باوجود اُس نے اپنا وزن کم کرنے کی خود سے کوئی معمولی سی کوشش تک نہ کی۔ ہاں البتہ بڑے بڑے ڈاکٹروں سے بھاری فیسوں کے عوض مشورے کرکے وزن گھٹانے کی ادویات اور دیگر دستیاب طریقوں کا اندھا دھند و بے تحاشہ استعمال ضرور کیا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد وہ سارا وزن بمعہ سود کے چربی کے لوتھڑوں کی صورت میں واپس اُس کے جسم پر آن وارد ہوتا"۔

۔"شوکت صاحب اگر آپ میری بات کا بُرا نا مانیں تو۔۔۔۔۔ مجھے تو اِس بات پر حیرت ہو رہی ہے کہ جب آپ دونوں کے درمیان کچھ بھی نہیں پھر آپ اب تک منیبہ بیگم کے ساتھ کیوں ہیں۔ آپ تو مرد ہیں طلاق بھی دے سکتے ہیں؟"۔

۔"نہیں۔۔۔۔۔۔ ! ، میں اُسے طلاق بھی تو نہیں دے سکتا تھا۔۔۔۔۔ !!!"۔

۔"وہ کیوں۔۔۔۔۔۔۔؟"۔

۔"گردیزی صاحب نے یوں تو خود ہی اپنے لاڈ پیار سے اُسے بگاڑا تھا لیکن ایک جہاندیدہ انسان ہونے کے ناطے وہ یہ بھی جانتے تھے کوئی بھی انسان اُن کی سدا کی بگڑی ہوئی اولاد کے ساتھ زیادہ وقت گزار نہ سکے گا۔اِسی بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وہ میرے پیروں میں بہت بھاری بیڑیاں پہنا گئے"۔

۔"بیڑیاں۔۔۔۔۔۔۔۔!، کیسی بیڑیاں۔۔۔۔۔۔۔؟"۔

گردیزی صاحب نے حق مہر تین کروڑ روپے لکھوایا۔ صرف اتنا ہی نہیں انہوں نے میرے اور میری تینوں بہنوں کے دستخط شدہ اسٹمپ پیپرز پر میری تینوں بہنوں کی شادی پر اُٹھنے والے اخراجات کی پائی پائی کا حساب جوڑ کر وہ رقم قرض کے طور پر ظاہر کرکے یہ شرط بھی عائد کردی کہ طلاق کی صورت میں، میری بہنیں اور میں اُس رقم کی ادائیگی کے زمہ دار قرار پائیں گے۔ وہ جانتے تھے کہ نا اِس کے پاس اتنی رقم ہوگی اور نہ ہی یہ میری بیٹی کو کبھی طلاق دینے کا سوچ بھی سکے گا"۔

شوکت زمان کے بھینچے ہوئے ہونٹوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ نظر آئی۔ "آج سے

بیس سال پہلے میں نے اپنی ذات کا خلا گردیزی صاحب کی پیشکش سے پُر کرنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے لگا کہ اِس ایک قربانی سے میری اور میری بہنوں کی ذات کے سارے خلا پُر ہو جائیں گے۔ کاش کہ اُس وقت میں گردیزی صاحب کی بجائے اُوپر والے کی رحمت پر توکل رکھ کر اپنے زورِ بازو پر انحصار کرتے ہوئے اپنی خودی کا سودا نا کرتا تو شاید آج صورتحال قطعاً مختلف ہوتی"۔

اچانک ایک ہلکے سے جھٹکے سے گاڑی رُک گئی۔ اکرام نے چونک کر دیکھا تو اُس کا گھر آ چکا تھا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ شوکت صاحب"۔ اکرام گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلنے لگا۔

۔"شکریہ تو مجھے تمھارا ادا کرنا چاہیے کہ آج نہ جانے کتنے برسوں بعد کسی کو اپنے دکھ میں شریک کرکے دل پر پڑے منوں بوجھ کو ہلکا محسوس کر رہا ہوں"۔ اُس نے ایک اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ الوداعی انداز میں ہاتھ لہرایا۔ اکرام نے گاڑی کا دروازہ دھیرے سے بند کر دیا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔

..*.*.*.*.*.

جملہ حقوق بحق منصنف محفوظ ہیں - 2014

وہ اُس وقت تک کھڑا گاڑی کو دیکھتا رہا جب تک وہ سڑک پر پھیلی دھند کے غبار

میں غائب نہ ہو گئی۔ اکرام کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ گاڑی شوکت زمان کو لئے کسی
گہری و سیاہ خلا میں گم ہو گئی ہو۔